

لکھتے رہے جنوں کی حکایت!

حکایت
ماہنامہ

جولائی 2020ء



Pakistanipoint
Learning Point

حکایت کے سالانہ خریدار میں

گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے پرچہ حاصل کریں اور
860 روپے کی سالانہ بچت پائیں۔

کل رقم سالانہ
1860 روپے

سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ
480 روپے

12 شماروں کی قیمت
1380 روپے

بچت سالانہ
860 روپے

سالانہ چندہ
1000 روپے

”حکایت“ چار دیواری کی دنیا کی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں، ناقابل فراموش واقعات، دین و دنیا، طنز و مزاح کی بدولت شائستہ جملوں کا فیملی میگزین ہے جسے گھر کا ہر فرد پڑھ سکتا ہے۔ تحریک پاکستان، 1947ء کی ہجرت، کشمیر اور جہاد آزادی کی کہانیاں، معوامی سائنسی، طب و صحت اور تحقیقی مضامین کے علاوہ غیر جانبدارانہ سیاسی تجزیے، خصوصی فچر پیش کئے جاتے ہیں۔

سالانہ خریدار میں

پرچہ بذریعہ وی پی منگوائیں۔ 1000 روپے کا منی آرڈر کریں۔

1000 روپے حکایت پبلشرز کے اکاؤنٹ نمبر 3-873-BOP میں جمع کرائیں۔

سالانہ چندہ ایزی پیسہ، مولی کیش وغیرہ سے بھی بھجوا سکتے ہیں۔

اپنا ایڈریس اور فون نمبر واضح الفاظ میں لکھیں۔

حکایت 26- پیالہ کراؤن لاهور 0323-4329344

عداوت
600/- روپے

وفا ہے ذات عورت کی
300/- روپے

جنون عشق
600/- روپے

کے بعد
ریاض عاتق کوئلہ
کا عظیم الشان ناول

بھگور
700/- روپے

دل دل
700/- روپے

منظر عام پر

سفرِ حیات

1300/- روپے

816 صفحات
(2 جلدیں)

وطن دشمنوں سے نبرد آزما **راجہ ایشان حیدر** کی سچی کہانی

اس کا نشانہ بے خطا ہے۔ اس نے امریکہ میں اپنی مہارت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ افغانستان کی برف پوش وادیوں، کارگل کے بلند و بالا پہاڑوں سے کشمیر کے سرسبز جنگلات تک، انڈیا کے پُر خطر ریگزاروں سے وزیرستان کے دہشت ناک علاقے تک بھیلی ہوئی کہانی۔ رگوں میں خون جما دینے والا ایکشن ایڈوچر اور بارود کی برسات میں پھوٹی محبت کی کوئیل۔

ایسے ناول ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہیں لکھے جاتے۔
جان بھیلی پر رکھ کر موت کی آنکھوں میں ڈالنی پڑتی ہیں۔

حکایت پبلشرز

0323-4329344

مکتبہ
داستان

نورِ مصیبت

دلائلِ اللہ علیہ السلام

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (195) اور اللہ (کی خوشنودی) کیلئے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اُس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو (اگر وہ سر منڈالے تو) اُس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے پھر جب (تکلیف دور ہو کر) تم مطمئن ہو جاؤ تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے اور جس کو (قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایامِ حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو۔ یہ پورے دس ہوئے۔ اور یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جس کے اہل و عیال مکہ میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے (196)

بانی
عنایت اللہ
شاہد بن عنایت اللہ

لاہور
حکایت
ماہنامہ

شمارہ: 11

جولائی 2020ء

جلد: 50

سرکولیشن مینیجر

فضل رزاق

محمد ثار رانا نچھا

شعبہ اشتہارات

خرم اقبال

محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ

مصباح

تبیسر

پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر اعلیٰ

صاحب شاہد

مدیر

عارف محمود

مدیر

میاں محمد ابراہیم طاہر

مدیر

امرازی مدینہ کے ایچ مجاہد

مدیر

امرازی مدینہ و نگینہ شہزاد

مدیر

سعد شاہد

قانونی مشیر

وقاص شاہد ایڈووکیٹ

مجلس مشاورت

ابدال بیٹا

عظمت فروق

مینہ الف

ڈاکٹر شبیر حسین

ڈاکٹر نعیمی

مظہر بیدری

ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر

عارف محمود 0323-4329344

وقاص شاہد 0321-4616461

120

ہیڈ آفس 26- نیٹال لارڈز روڈ، لاہور 042-37356544

monthlyhikayat44@gmail.com

primecomputer.biz@gmail.com

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے

لٹن شسارے میں

11	کھنے کی بات دنگیر شہزاد	حصولِ اقتدار
15	مجاہدین کے ایچ میاں	دنیا کیا کہے گی؟
17	سر ورق کی کھانسی حامد مشہود	تھکتے رہے جنوں کی حکایت!
23	خطوط قارئین	اظہار خیال
29	دین و دنیا استاد رازی	صحابہ کا ایمان
33	ناریخی ناول ریاض عاقب کوہلر	برہہ 16
71	ناٹاہل ہوا موش رہنہ منور علی	بابا کے جنات
79	ایک حقیقت ایک افسانہ محمد صدیق شاہ بخاری	خاص عرق کلاب
81	جرم و سزا سارہ حسین رانچہت	بکائن، غیرت اور سزائے موت
92	نقطہ نظر ڈاکٹر رانا محمد اقبال	کورونا - حقیقت یا سازش؟
97	کچھ یادیں کچھ باتیں محمد نذیر ملک	عمر رفتہ کو آواز دینا
103	ضرب سکندری سمندر خان بلوچ	سائنس مشرقی پاکستان
113	مسئلہ کشمیر گلزار اختر کاشمیری	چین کی لداخ میں پیش قدمی
119	ایک نادر ایک کہانی کبیر بقر احمد ناز	منظورِ نظر

اس شمارے میں

149

رضوان قیوم

نیلی برباد.....

طنز و مزاح

123

ادریس انور کھوٹ

میں اڈی اڈی جاواں

جنگ بیٹی

129

سیدہ شاہدہ شاہ

نہائیاں

151

مرزا شیر بیک ساجد

قلمی دوستی

سلسلہ وار خاوں

161

ریاض عتب کوئٹہ

لاڈورانی قسط 2

شکاریات

185

شیخ الطاف حسین

نیلی بھیت کا آدم خور جوڑا

خاکہ

193

شراتی کے قلم سے

میرا کلاس فیلو

ایک حقیقت ایک افسانہ

197

ڈاکٹر مہر حسن ملک

کورونہ کی آگ

آپ بیٹی

201

ارم ناز

اشکوں کا خراج

معاشرت

206

حبیب اشرف صوبی

بھیک یا بدکاری؟

پراسرار کہانی

209

رضوان قیوم

ادھوری محبت آخری قسط

معاشرت اور قانون

231

منتز احمد

گھر کا چراغ

238

چوہدری نذیر احمد

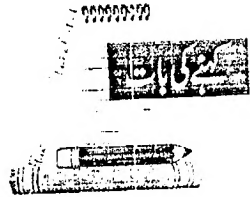
گہری چال

نظم

128

شرافت ضیاء

انیمہ



حصولِ اقتدار اور اصولِ اقتدار میں فرق!

ابھی چند دن پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی 181 ویں برسی منائی گئی۔ دانا دور اندیش اور دلیر رنجیت سنگھ پنجاب کی تاریخ کا اک ایسا باب ہے۔ جسے بائی پاس کر کے پنجاب کی تاریخ لکھنا ممکن ہی نہیں۔ رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780ء کو گوجرانوالہ میں سردار مہان سنگھ کے گھر پیدا ہوا اور سرکریچکے مشل کا سربراہ تھا جو ستھلوں کی مشہور بارہ مشلوں میں ایک جانی پہچانی مشل تھی۔ جس کی بنیاد رنجیت سنگھ کے دادا چرٹ سنگھ نے رکھی تھی اور یہ وہ دور تھا جب پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے حملے جاری تھے ایک صوفی شاعر نے لکھا۔

”کھادا پیتا لاپے دا“

تے باقی احمد شاہے دا“

یہ کاشنکاروں کا گھرانہ تھا جو مدتوں سے گوجرانوالہ کے قریب موضع سکر چک میں آباد تھا اور اس خاندان کا پہلا فرد جس نے ہندومت ترک کر کے سکھ مت کو گلے لگایا، اس کا نام بدھول تھا۔ دھرم کی تنہدیلی کے بعد بدھو سنگھ کہلانے لگا۔ وہ انتہائی مضبوط کاٹھی اور مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ سو اس نے ایک گروہ منظم کر کے ڈاکہ زنی شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں آس پاس کے علاقوں پر اس کی دہشت طاری ہو گئی۔ بدھو سنگھ کے بعد اس کے دونوں بیٹوں نے بھی باپ کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا بڑا بیٹا نودھ سنگھ انتہائی تندخو اور جنگجو تھا۔ جس نے اپنے گروہ میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہوئے است مزید طاقتور بنا دیا۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ نادر شاہ جب لوٹ مار کے بعد واپس جا رہا تھا تو نودھ سنگھ نے اک اور مشل کے سردار کپور سنگھ کی معاونت سے نادر شاہ کے عقب پر چھاپہ مارا اور یہ دونوں بہت سامان لوٹ کر فرار ہو گئے۔ جس سے اس کی شہرت اور دہشت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور پنجاب کے نامی گرامی سنگھ سردار بھی اس کا احترام کرنے لگے۔

نودھ سنگھ 1756ء طبعی موت مرا اور پیچھے چار بیٹے چھوڑ گیا۔ سب سے چھوٹے بیٹے چرٹ سنگھ کی عمر اس وقت تقریباً بیس برس تھی۔ جب گروہ کی قیادت اس کے ہاتھ آئی تو اس وقت بہت سی مثلیں قائم ہو چکی تھیں۔ جن میں بھنگلی مثل اور آملو والیہ مثل کا بڑا نام تھا۔ یہاں یہ بھی کہنا چلوں کہ صرف ڈاکوؤں کے گروہوں کی قیادتیں ہی اولادوں کو منتقل ہوتی ہیں۔ جبکہ جینیوٹن اور جدید جمہوریوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سیاسی جماعت نہیں۔ بلکہ اس کے پردے میں چھپا ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور گروہ بھی ایسا جو مقامی دولت پر ڈاکے ڈالنے کے بعد بیشتر دولت بیرون ملک منتقل کر دیتا ہے۔ یعنی یہ جدید ڈاکو قدیم ڈاکوؤں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

اب واپس چلتے ہیں چرٹ سنگھ کی طرف، جس نے سکھوں میں بہت نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ سو اب اس نے ملک گیری کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا اور پہلے مرحلہ میں امین آباد پر حملہ کر کے اسلحہ سمیت بہت سنا مل بھی لوٹ لیا۔ اسی مہم کی کامیابی کے بعد ”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“ والی بات تو فطری سی ہے۔ سو چرٹ سنگھ نے گوجرانوالہ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا تاکہ توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں آسانی پیدا ہو۔

چرٹ سنگھ کی مسلسل کامیابیوں سے حسد میں مبتلا بھنگلی مثل نے چرٹ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ آخر کار 1771ء میں اک جھڑپ کے دوران جب چرٹ سنگھ اپنی نئی بندوق کی ثرائی لے رہا تھا کہ اچانک بندوق اس کے ہاتھ سے چھٹ گئی اور یہ مہم جو اپنی ہی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ سردار چرٹ سنگھ نے دو بیٹے اپنی نشانی چھوڑے، بڑا بیٹا مہان سنگھ صرف دس سال کا تھا۔ بچوں کی ماں دیساں انتہائی زیرک عورت تھی جس نے کم سن بیٹے مہان سنگھ کے نام پر مثل کے تمام تر معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ مائی دیساں نے اپنی بیٹی کی شادی بھنگلی مثل کے نامور سردار بے سنگھ کے لڑکے صاحب سنگھ سے کر دی اور اپنے بیٹے مہان سنگھ کی شادی اک اور بڑے سردار کی بیٹی سے کر کے خود کو مزید مستحکم کر دیا۔ جب مہان سنگھ سن شعور کو پہنچا تو اس نے مثل کے تمام اختیارات خود سنبھال لئے اور باپ کے نقش قدم پر فتوحات کا نیا سلسلہ شروع کر دیا اور سیالکوٹ کے قریب کوٹلی لوہاراں تک جا پہنچا۔ پٹھانوں کی اک اور ہستی علی پور پر قبضہ کر کے اس کا نام اکال گڑھ رکھ دیا۔ یہی مہان سنگھ ایک اور کامیاب معرکہ کے بعد جب گوجرانوالہ پہنچا تو اُسے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی گئی۔ اپنی تازہ ترین فتح اور جنگ جیتنے کو یادگار بناتے ہوئے اُس نے بیٹے کا نام رکھا ”رنجیت سنگھ“۔ رنجیت سنگھ نے اپنے نام کی لاج رکھی۔ باپ کو مایوس

نہیں کیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کہلایا جس کے ذکر بنا پنجاب کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔

اسلام آباد میں مندر کی تعمیر کے معاملہ پر جہاں ایک طرف سیاست ہو رہی ہے، وہیں جھوٹا پروپیگنڈہ بھی خوب کیا جا رہا ہے جس کا مقصد پاکستان کو بدنام کرنا ہے۔ این جی اوز میدان میں نکل آئیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی بیان جاری کر دیا۔ پاکستان کے مذہبی طبقہ کا بھی رد عمل سامنے آ رہا ہے۔ یہ معاملہ ایک تنازع کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ آیا مندر اسلام آباد میں بننا چاہئے یا نہیں۔ اب ذرا حقائق سن لیں۔

اسلام آباد میں مندر کی تعمیر کے لئے نواز شریف دور حکومت (2016ء) میں چار کنال زمین کی جے سی ڈی اے کی طرف سے متعین کی گئی۔ تحریک انصاف کی حکومت کے آنے بعد حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ قومی خزانہ سے پچاس کروڑ روپیہ مندر کی تعمیر کے لئے مختصر کیا جائے۔ جس پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ حالیہ میں جے سی ڈی اے سے بغیر منظوری کے مندر کے لئے مختص پلاٹ پر دیواریں بنانا شروع کر دی گئیں۔ جس پر قانونی طور پر سی ڈی اے نے نوٹس جاری کر دیا۔ قانون کے مطابق کسی قسم کی تعمیر کے لئے سی ڈی اے سے منظوری لینا لازم ہے۔ نوٹس لینے پر یہ ایٹو بنا دیا گیا کہ سی ڈی اے نے مندر کی تعمیر روک دی جس کی وجہ قانونی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔ جو سراسر جھوٹ ہے لیکن اس جھوٹ کو خوب پھیلایا جا رہا ہے اور اسی جھوٹ کی بنیاد پر ایمنسٹی انٹرنیشنل، این جی اوز اور ایک مخصوص طبقہ اپنی اپنی دکانیں چکا رہے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے۔ کیا امریکہ، برطانیہ، یورپ میں بغیر اجازت کے کوئی مسجد، کوئی مندر ختمی کہ کوئی گرجا گھر بنانے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگر نہیں تو سی ڈی اے اگر قانون کی عملداری کے لئے مندر کی غیر قانونی تعمیر کو روکنے کے لئے نوٹس جاری کر رہا ہے تو اس پر اتنا شور کیوں؟

جس دن مندر کی تعمیر کے غیر قانونی کام کو روکنے کے لئے سی ڈی اے نے نوٹس جاری کیا اور اسے اذیتوں کے حقوق کے خلاف اقدام گردانا گیا۔ اسی روز اسلام آباد کے ہی علاقہ سہالہ میں ایک ایسی مسجد کو شبید کیا گیا جو ایک غیر قانونی تعمیر تھی۔ کیا اس مسجد کے شبید کئے جانے پر ایمنسٹی انٹرنیشنل، این جی اوز، میڈیا اور ہماری پارلیمنٹ میں کوئی بات ہوئی؟ بالکل نہیں۔ گویا مندر کی تعمیر کے قانونی معاملہ کو مذہبی رنگ دینا دراصل ایک غیر قانونی عمل کی حمایت کرنا ہے جس پر کوئی بات نہیں کر رہا۔ جہاں تک مندر کی تعمیر کے مذہبی معاملہ کی بات ہے تو اس پر مفتی تقی عثمانی صاحب نے کہا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو حق ہے کہ جہاں اُن کی آبادی کے لئے ضروری ہو، وہ اپنی عبادت گاہ برقرار رکھیں اور وہ ضرورت کے مطابق نئی

عبدت گاہ بھی بنا سکتے ہیں لیکن حکومت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے خرچ پر مندر تعمیر کرائے۔ نہ جانے ایت تازک وقت میں کیوں ایسے شاخصانے کھڑے کئے جاتے ہیں جس سے انتشار پیدا ہونے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مجھے غلطی سیاست سے نفرت ہے، کھن آتی ہے لیکن عمران خان کو یاد رکھنا، ہوگا کہ وہ اکیلا سٹیک ہولڈر ہے۔ انجام ٹھیک نہ ہوا تو باقی بغل بچے اپنے اپنے بستے اٹھا کر یوں چلتے بنیں گے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔

میرا دکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

بہادر کون؟ عمران خان!
بارا ہوا لشکر کون؟ پی ٹی آئی۔ میری فحشگی اس باپ جیسی ہے جو قابل بچے کے گریڈز گرنے پر دکھی ہو جاتا ہے۔ آج کے اخبار میرے سامنے ہیں۔ بچپن میں ایک فیورٹ شغل تھا کہ نکتے ملا کر تصویریں بنایا کرتے تھے۔ آج وہی ایکس سائز کر رہا ہوں۔ اخباری خبروں کے نکتے مانئیں اور دیکھیں کہ مستقبل کی کیسی امانت تصویر ابھرتی ہے۔ صرف سرخیوں پر توجہ فرمائیں۔

”کابینہ میں فواد چوہدری کے بیان پر گرما گرمی، سینئر قیادت پر وزیراعظم بننے کے لئے سازشوں کا الزام۔“

”وزرا چھ ماہ میں کارکردگی بہتر بنائیں ورنہ معاملات دوسری طرف چلے جائیں گے۔“ وزیراعظم سارشیس ہو رہی ہیں۔ فیصل واڈا کی اسد عمر، رزاق داؤد، ندیم باہر پر کھل کر تنقید۔
”کارکردگی نہ دکھانا ہماری کوتاہی ہے۔ پی ٹی آئی حکومت کے پاس چھ ماہ ہیں۔“ فواد چوہدری وزیراعظم کا کابینہ میں بڑے پیمانے پر اکھاڑ پچھاڑ، چند کوسبکدوش کرنے کا فیصلہ۔

بند مٹھی میں ریت سرکنے کا اور کون سا ثبوت درکار ہے؟

اندر کی رسہ نشی خود کشی ہوتی ہے۔ حصول اقتدار اور اصول اقتدار میں فرق ہوتا ہے۔ ہوم ورک کنٹینرز پر نہیں ہوتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مردم شناسی اُن پڑھ جلال الدین اکبر کو بھی مغلی اعظم بنا دیتی ہے۔



دنیا کیا کہے گی؟

ہم اپنی آدھی سے زائد خوشیوں کے دروازے دنیا کے ڈر سے خود پر بند کر لیتے ہیں اور ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل کی وجہ بھی دنیا کا بے جا خوف ہے۔ مثلاً اگر شادی سادگی سے کی تو دنیا کیا کہے گی۔ کرپکی کو بھاری جہیز نہ دیا تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر مہمان کو کوک یا پیپسی کے بجائے شربت یا چائے پلائی تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے فیشن کے مطابق کپڑے نہ پہنے تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے فنکشن پر کھسرے یا کنجریاں نہ چٹائیں تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے بچوں کی شادیاں ان سے پوچھ کر کیں تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر ہم نے بچوں کی شادیاں برادری سے باہر کیں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اگر ہم نے دھوم دھام سے مرنے کا تیجا (قل)، دسواں، بیسواں، تیسواں، چہلم یا برسی نہ کی تو لوگ کیا کہیں گے۔ نوجوان پڑھ لکھ کر جب جاب حاصل نہیں کر پاتے تو چھوٹا موٹا کاروبار یا آبائی کام نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بالغ ہوتے ہی بچوں کی شادیاں نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم پردہ نہیں کرتے یا داڑھی نہیں رکھتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بچوں کو سرکاری سکول یا دینی مدرسے میں داخل نہیں کراتے کہ لوگ کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ.....

یوں ہم لوگوں یا دنیا کے خوف سے بہت سے ایسے کام نہیں کر پاتے جو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے خوف یا لوگوں کے ڈر کے کچھ فوائد بھی ہیں کہ انسان غلط کام اور جرم سے بہت حد تک باز رہتا ہے لیکن ہم اس خوف کی وجہ سے بہت سے اچھے کام بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عام لوگوں کی نظر میں اچھے نہیں ہوتے یا دنیا کے عمومی معیارات کے مطابق نہیں ہوتے لیکن دیکھنا چاہئے کہ جس دنیا کی ہم اتنی پروا کرتے ہیں وہ ہماری کتنی پروا کرتی ہے۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہی ہوگا۔ کیونکہ دنیا کسی کی پروا نہیں کرتی اور دنیا سے خوف کے باعث کچھ کام کرنے کے بعد آپ قرض یا مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو دنیا کوئی مدد نہیں کرتی بلکہ زخموں پہ مزید نمک پاشی کرتی ہے تو پھر درست کاموں میں اس کی پروا کرنے کی کیا ضرورت

ہے؟ دنیا کا تو کام ہے باتیں کرنا، اسے باتیں کرنے دیں، آخر کب تک باتیں کرے گی بالآخر چپ ہی ہو جائے گی۔

اگر آپ کا عمل اخلاق، قانون یا شریعت سے متصادم نہیں تو بے شک رواج کے خلاف ہو، ضرور کر گزریں کیونکہ غلط رواج کو ختم کرنا بھی ایک جہاد اور ثواب کا کام ہے جس کے نئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے لیکن اگر کام اخلاق، قانون یا شریعت کے خلاف ہے تو بظاہر کتنا ہی اچھا ہو اسے کبھی نہ کریں۔ اس سلسلے میں دنیا کی ہی نہیں دین کی پروا کرنی بھی ضروری ہے ورنہ کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً اسلام میں عدل کی شرط پر ضرورت اور استنفاحت کے مطابق ایک سے زائد چار تک شادیوں کی مرد کو اجازت ہے مگر معاشرہ ہندو اثرات کے تحت اسے پسند نہیں کرتا خصوصاً پہلی بیوی کی موجودگی میں کوئی اپنی کنواری مطلقہ یا بیوہ لڑکی بھی دینے کو تیار نہیں۔ رہ گئیں بیویاں تو ان کا دل تو عموماً بڑا ہوتا ہی نہیں کہ اس سلسلے میں مرد کے ساتھ تعاون کریں نتیجتاً ناجائز تعلقات استوار ہوتے ہیں اور زیادہ بُرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

کے ایچ مجاہد

لکھتے رہے جنوں کی حکایت!

تجارتی صحافت و معاملات میں تو کلمہ حق کا تصور ہی کھوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک آندھی ہے، جس میں کرنسی نوٹ آزد بازو اڑتے پھرتے ہیں اور لوگ پاگلوں کی طرح ان پر لپک رہے ہیں۔ تاہم آندھی زیادہ سے زیادہ ایک پہر کی ہوتی ہے مگر ہوا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انسانیت کو آندھی نہیں، ہوا کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔

☆ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔

○ عنایت صاحب سابق فوجی تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے دُست کو دُست اور غلط کو غلط کہا، حق بات میں فوجی یا جمہوری سرکار کے لیے ”لا تخسر و فی المیزان“ کی قرآنی نص سامنے رکھی۔

☆ اب تو قوتِ اظہار نے صرف کمائی کی صورت اختیار کر لی ہے اور کمائی کے راستے ہی برقی ہو گئے ہیں۔

○ اگر تم حق کے لئے لڑتے ہو تو ابھی بھی لڑو، اگر دُنیا طبعی کے لیے لڑتے ہو تو شتم سے زیادہ بُرا کون خُدا کا بندہ ہوگا۔

☆ ہر ظالم شخص مُلک یا گروہ کو فطرت ایک مقام پر خود ہی ہانکا کر کے شکاری کی طرف لے آتی ہے۔

○ اشاعتِ حق روزِ اوّل سے ہی بہت مشکل کام رہا ہے۔ اس میں سرِ قلم ہوتے ہیں، ہاتھ قلم ہوتے ہیں۔

اب بھی بڑی چاہت سے لیا جاتا ہے کہ ہمارا فوجی بہت بڑا لکھاڑی تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے دُرسٹ کو دُرسٹ اور غلط کو غلط کہا، حق بات میں فوجی یا جمہوری سرکار کے لیے ”لا تخسرو فی المیزان“ کی قرآنی نص سامنے رکھی۔ اسی لیے ایک تحریک کی حمایت پر، حکومت نے انہیں دو سال جیل میں بھی بند رکھا۔ انہوں نے وہاں مجرموں کی عمیق نفسیات کا مطالعہ کیا۔

یہ بہت جرأت رندانہ کی باتیں ہے جو عنایت صاحب نے کہیں اور کہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ماہ نامہ حکایت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرکاری سرپرستی سے محروم ہو گیا ہے۔ مسلسل سرکاری اشتہارات اور کاغذ وغیرہ اُن جرائد کو ملتا ہے جو ناز برداری کرتے ہیں۔

قرآن امر حیات کے لیے حق بات کی توثیق کرتا ہے۔ ظاہر ہے، جنت کوئی عوامی سیرگاہ تو نہیں کہ سب اس میں بے تکان گھس جائیں۔ جنت کے امر سکون کی باقاعدہ قیمت ہے۔ سورۃ العصر میں ارشاد ہے ”قسم ہے زمانے کی انہم ہے نماز عصر کی۔۔۔ بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں، جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق بات پر قنم رہنے اور صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔“

اسی طرح حدیث نبوی ہے: جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔

مگر حق بات کا پرچار کبھی بھی کسی بھی دور میں سہل نہیں رہا۔ لاریب اہلیا بھی حق گوئی پر معتب و مصلوب ہوئے۔ حق دشمنی میں بیٹے کنعان نے بھی حضرت نوحؑ کا ساتھ چھوڑا اور مارا گیا جب کہ اُن کا ساتھ دینے والے بیٹے سیلابِ بلا سے مامون رہے۔ حضرت زکریاؑ کو آرزو سے دوخت کر دیا گیا تھا۔ حضرت صالحؑ کے ساتھ قومِ ثمود نے کیا سلوک کیا

لکھتے رہے جنوں کی حکایت خوں چکال
ہ چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
حق لکھنا اور کہنا یعنی اشاعت حق روزِ اَوَّل
ست ہی بہت مشکل کام رہا ہے۔

یہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کی بات ہے، ملک میں ہم دھماکا ہوا اور متعدد بے گنہ افراد اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ صدر جرنیل ضیاء الحق نے کہا، ہم اس طرح کے اور بھی بم دھماکے برداشت کر سکتے ہیں۔ عنایت صاحب نے حکایت میں لکھا کہ صدر صاحب اس طرح کے دو تین دھماکے آپ کے گھر کے سامنے ہوں تو پتا چے کہ آپ کتنے دھماکے برداشت کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک بار جب ہر شعبہ ہائے حیات میں فوج عبث حُصں رہی تھی تو انہوں نے عسکری قیادت کو مخاطب کرتے ہوئے ادا ر یہ لکھا کہ ٹھیک ہے آپ ملک کے دیگر اندرونی معاملات دیکھیں، رات کو ملک کی بیرونی حفاظت کے لیے، سرحدی دیہات کے عوام خود ہی جھلکری پہرے کا انتظام کر لیں گے۔

جب ہماری فوج نے ۱۹۶۵ء میں بہادری کی داستانیں رقم کیں تو عنایت صاحب نے بھی ان پر متعدد کتب تحریر کیں اور خاص نمبر بھی شائع کیے۔ ۱۹۸۱ء کے بعد عنایت صاحب بہت دل گرفتہ ہوئے۔ اس سلسلے میں مجھے ان کی ایک کہانی ”قسم اس ایوان“ یاد آ رہی ہے۔ اس سانحے کے بعد جب فوج ویشی پڑ گئی تو عنایت صاحب نے معصومیت ماہ نامہ حکایت کا ایک سہ ورق تیار کر لیا۔ فوجی بھائی سڑک کنارے اپنا جوتا ڈھیل کر کے بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنی ہندوق، گھڑی، ٹوپی اور پٹی اتار کے، ٹٹ پاتھ پر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ وہ آرام سے تمباکو پی رہا تھا۔

عنایت صاحب کی فوج سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ تو وہ سابق فوجی تھے۔ عسکری حلقوں میں اُن کا نام

ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ کا مشورہ درکار ہے کہ کیا کروں؟

وہ جناب صدیق کی بیٹی تھیں، بولیں، بیٹا! اگر تم حق کے لئے لڑتے ہو تو ابھی بھی لڑو، اگر دنیا طلبی کے لیے لڑتے ہو تو تم سے زیادہ بڑا کون اللہ کا بندہ ہوگا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے دلوں سے شہادت پائی اور حجاج نے اُن کا جسدِ خاکی سرِ راہِ باندی پر لٹکا دیا۔ حضرت اسماءؓ تین دن بعد وہاں سے گزریں تو کہا، یہ سوار ابھی اپنی سواری سے نہیں اُترا۔

امام ابو حنیفہؒ کی فقہی دانست سے کون واقف نہیں۔ سنی ہی نہیں، شیعوں کا بھی ایک وسیع حلقہ اُن کا معترف ہے۔ بادشاہِ امام ابو حنیفہؒ کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کر کے اُن سے اپنی حمایت کے فتویٰ نکھوانا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ عہدہ لینے سے معذوری ظاہر کی کہ میں اس کے قبل کہاں۔ بادشاہ نے کہا، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ امام صاحب نے کہا، آپ نے مجھے جھوٹا قرار دیا تو کسی جھوٹے کو اس عہدے پر ہرگز فائز نہ کریں۔ ایک روایت کے مطابق، بادشاہ نے اُن پر جلاد مقرر کر دیا جو روزانہ اُنہیں دس کوڑے مارتا تھا۔ دوسری اور معروف روایت کے مطابق، بادشاہ نے امام صاحب کو زندان میں ڈال دیا۔ وہ وہاں بھی تدریس میں مصروف رہے تو انہیں زہر دے دیا گیا۔ اُن کی حالت خراب ہوئی تو وہ زہر خورانی کا راز پا گئے۔ انہوں نے سجدہ ریز ہو کر جان دے دی۔

شیخ احمد سرہندیؒ المعروف حضرت مجددِ انفِ ثانیؒ نے ہمیشہ جلال الدین اکبر کے آزاد خیال مذہب ”دینِ الٰہی“ کی مخالفت کی اور انہیں جہاں گیر کو سجدہ نہ کرنے پر، قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا مگر انہوں نے وہاں بھی کئی غیر مسلمین کو مشرف بہ اسلام کیا۔

ع اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روہا ہی

تھا! اوپر کی ایک فحشہ نے اپنے آشنا سے کہا کہ اُن کی اونٹنی کو کھائے کر دے اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ شام۔ شہرِ سدوم میں حضرت لوطؑ نے حق کا علم باندھ کیا مگر اُن کی بیوی نے اپنی بدرکردار قوم کے لیے درد کھایا اور ماری گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کو کلمہ حق کے سبب، آگ کے پندار میں ڈال دیا گیا تھا۔

اس سے اگلے دور میں خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ نے حق گوئی کے لیے بی برس با اذیتیں برداشت کیں اور شعب ابی طالب میں اپنے ساتھیوں سمیت بھوک پیاس اور حدِ بندی جھیلی۔ نبی پاکؐ کو کئی بار غزوات میں سے گزرتا پڑا۔ اہالیانِ خائف نے بھی ان پر حملہ کیا۔ حضرت بلالؓ اگر اللہ کے ایک ہونے سے مخرف ہو جاتے تو گفار نہیں امن بخشے مگر انہیں ہر طرح کی سخت تکلیف دی گئی۔ وہ گرم ریت میں جھلسنے رہے، غار کے ٹونڈ لپاڑے انہیں گلے میں رسی باندھ کر کلیوں میں کھینچتے رہے۔ وہ دُڑے کھاتے رہے مگر احد، احد کہتے رہے۔ حضرت ابو جندلؓ نے اسلام قبول کیا تو ان کا رئیس باپ سہیل بن عمرو بھی ان کا سب سے بڑا دشمن بنا۔ اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر کئی سال قید کیا گیا۔

تواریخ کی زیادہ بڑی نہیں، محض مولانا مودودیؒ کی ”خلافت و موعیت“ ہی پڑھ لیں تو پتہ چلے گا کہ زمین ٹھل جاتی ہے۔ کیا اموی خاندان اور کیا عباسی خاندان تاریخ کے ہر پتے پر حق پرور کا ابو جی بہتا نظر آتا ہے۔ حجاج بن یوسف جیسا درندہ عم سے خون سے تر کرتا جا رہا تھا۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے خارجیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ کے سامنے حجاج آیا تو اُن کا محاصرہ بہت طویل کر دیا گیا۔ وہ کم زور تھے، عاجز آ گئے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ حضرت اسماءؓ کے تھپیڑے حاضر ہونے اور کہا، اب تو میرے بیٹے بھی میرا

جیل کے اہل کار چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو سب اچھا کا روایتی کا شن دیتے۔ تب میرا دل چاہتا کہ انہیں کہوں، سب اچھا بالکل بھی نہیں۔

اسی طرح حسرت موہانی کئی بار اپنے قلم کی بدولت جیل گئے، مگر یز سرکار اُن کا نظریہ آزادی بند پسند نہ کرتی۔

بے مشق کُن جاری چکی کی مشقت بھی ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

بے شک اشاعتِ حق روزاؤل سے ہی بہت مشکل کام رہا ہے۔ اس میں سر قلم ہوتے ہیں، ہاتھ قلم ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے کل کا دیدہ زیب نقشہ بنوایا اور ماہر تعمیرات کو ہیرے گینے عنایت کرنے کے بعد اُس بے چارے کے ہاتھ بھی قلم کرا دیے کہ یہ دُنیا میں میرے مقابل کسی اور محل کا نقشہ اس سے بڑھ کر، وضع نہ کر دے۔

پتھر تراش کر نہ بنا تاج ایک نیا فن کار کی زمانے میں کتنی ہیں انگلیاں اب تو قوتِ اظہار نے صرف کمائی کی صورت اختیار کر لی ہے اور کمائی کے راستے ہی برقی ہو گئے ہیں۔ خواتین کے مسالے دار رومانوی ناولوں نے ویب سائٹس کا رُوپ دھار لیا ہے۔ بعد ازاں یہ ناول یا ان سے مشابہ افسانے ٹی وی ڈراما بن جاتے ہیں، سراسر معاشرے اور ناجائز تعلقات ہی دکھائے جا رہے ہیں۔ بچانِ خیر مناظر اور بھڑکیلے مکالمات کا چٹخار..... پُخت اور رنگ لباس عام دکھایا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کے دو دو شوہر اور تین چار دوست ہیں..... سالی اپنے بہنوئی کو پھانس چکی ہے اور چچی نے بھتیجے پر زین گس رکھی ہے۔ کراچی کے ٹی وی سیکٹر سے کچے ذہن کی لڑکیوں کو یہ کیا اخلاق سکھایا جا رہا ہے؟

حق پروری پر دُنیا کا وسیع حلقہ آپ کے خلاف ہو رہے گا۔ یہ ہمیشہ ذہن نشین رہے۔ اسلام کے متعلق فلم بنیچ پیش کی گئی تو کئی ممالک میں تنقید غیر مسلمین کا شدید ردِ عمل ظاہر ہوا۔ فنی تقسیم کار کو دھمکیاں دی گئیں اور سینماز جلائے گئے۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء میں استنبول کے سعودی قونصل خانے میں ایک حق گو عربی سخانی مارا گیا تھا اور الزام آل سعود پر رہا تھا۔ اگر فردا فردا ایسے صحافیوں کا ذکر کیا جائے تو رسالے کے سرے نہ خاتم بھر جائیں گے۔

عظیم معلم فلسفی سقراط کو زہر کا پیالہ آخر اسی لیے پلایا گیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کی نفی کا وجدان گایا تھا اور اس کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ جب کہ یونان میں دیوتاؤں کی آڑ میں مالی، ذہنی اور جنسی بُرائیوں کا چلن تھا۔ وہ سقراط کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ عالمی مصنف آسکر وانڈرگو ایک بار جیل میں ڈال دیا گیا۔ آسکر نے لکھا، ”نہم ڈنٹاٹ پاس ان وا جیل بٹ ریولوز“ کہ جیل میں وقت گزرتا نہیں بلکہ گول گھومتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی چوں کہ مساوات کا نعرہ بلند کرتے تھے تو پاکستانی حکومت میں موجود وڈیرے اور صنعت کار انہیں اپنے لیے خطرہ خیال کرتے تھے۔ تب انہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے جیل میں قید کیا گیا۔ جب تسلی نہ ہوئی تو پھر اگلی بار دو سال کی قید دی گئی۔ مزدور افسانہ نگار قمر پورش نے اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے مجھے بتایا تھا کہ انہیں دولت کی منصفانہ تقسیم کے مطالبے پر جیل میں رکھا گیا تھا اور مار مار کے اُن کا بازو توڑ دیا جو مستقل میڑھا ہو رہا۔

خاتونِ ادا کار صبا حمید کے والد جید اختر تھے۔ انہیں پاکستان بننے ہی باغی مصنف قرار دے کر دھر لیا گیا اور قید تنہائی میں رکھا گیا۔ شاعر ریاض الرحمان سائبر بھی حق بات پر قید کیا تو وہ لکھتے ہیں کہ رات کو

خبر یا بی وی چینل چار سالہ اندھی حمایت کے لیے خرید لے۔ تجارتی صحافت و معاملات میں تو کلمہ حق کا تصور ہی کھوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک آندھی ہے جس میں کرسی نوٹ آڑو بازو اڑتے پھرتے ہیں اور لوگ پاگلوں کی طرح ان پر لپک رہے ہیں۔ تاہم آندھی زیادہ سے زیادہ ایک پہر کی ہوئی ہے مگر ہوا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انسانیت کو آندھی نہیں، ہوا کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔

یانس حسرت نے میری آئو گراف بک پر لکھا تھا، زمانے کے دھارے کے مخالف تیرنے والوں کو لوگ جنونی کہتے ہیں مگر زمانے کا دھارا بدلنے والے ایسے ہی جنونی ہوتے ہیں۔ جو بھی سچ کا دامن تھامے گا، ظاہر ہے اسے دنیاوی نقصان کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ میرزا غالب نے اسی لیے کہا ہے کہ بے خوف مردہوں کی حکایت خون چکان لکھتے رہتے ہیں۔ ہر

کیا کسی شہ مات کا انتظار ہے؟

اسی طرح تک ٹاک ڈانس سٹار ہر کلک پر پیسے کھاتی ہے۔ بھارت چلے جائیں۔ وہاں ٹی وی پر، کانے بنانے اور تاپنے کے حویل مقابلے ہوتے ہیں، ان سے بھی ڈالر ملتے ہیں۔ پاکستان کد ایک قانون اداکارہ نے ٹی وی شو بگ باس کے سیزن سے نہ جانے کتنا مال کمایا ہوگا۔ غیر ملکی معتبر اخبارات کے مطابق طویل ویب سیریز میں عربی اور جرمانہ کی انتہا ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں تیز رفتار افراد کلر فک ٹیک ٹائی نکا کر ہوئے جاتے ہیں اور حضرت لقمانؑ یونانی و یورپی فلاسفہ، ذیل کاریں نیز واصف علی واصف کے اقوال زیریں من کر کا م پائی، روزگار، تعلقات عامہ اور مسرت کے موٹی ویشل کیچر سے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ ٹی وی بھی جماعت یا فرو دو ارب روپے دے اور ایک

بحرین



RV-370796
RV-370797

واٹر پمپ، الیکٹرک موٹر، برقی مدافنی، واشنگ مشین، گیس ایمپلائس، روم کولر

Ph: 055-3843695 کلائمیکس آباد۔ جی۔ ٹی روڈ گوجرانوالہ

Email: master_0613@yahoo.com/ hotmail.com

چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔

ایک مرد حق کو جب سستی والوں نے آگ میں ڈالا تو ایک پرندہ چونچ بھر بھر کے آگ پر پانی ڈالنے لگا۔ کسی نے کہا کہ تیرے ان چند قطروں سے ایسی آگ نہ بجھے گی۔ پرندہ بولا، میں جانتا ہوں مگر میں مرد حق کا ساتھ دے رہا ہوں۔ اسی طرح ایک نابینا بوڑھے نے رات کو راستے میں لائین تھام رکھی تھی۔ کسی نے کہا، آپ تو روشنی سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ جواب ملا، بے شک میری آنکھیں بے نور ہیں مگر میں دوسروں کو راستہ دکھاتا جا رہا ہوں۔

تاریخ گواہ ہے۔ ہر ظالم شخص ملکہ یا گروہ کو فطرت ایک مقام پر خود ہی باز کا کر کے شکاری کی طرف لے آتی ہے۔ پس ہمارا فرض ہے، حق بات پر پہرا دینا اور اپنے جیسے کا چراغ جلا نا۔ رات کی ظلمت اپنی جگہ اور ہماری کاوش اپنی جگہ۔ اپنے جیسے کا پانی آگ پر پھینکا ہے اور دوسروں کے لیے لائین بھی تھمتی ہے۔

امام عالی مقام حضرت حسینؑ یہ جانتے تھے کہ وہ چند لحاظ کی بیعت سے دنیاوی سکون پا سکتے ہیں مگر انہوں نے کلمہ حق کی خاطر ایسا نہ کیا اور خانوادہ رسولؐ کی شہادت کے بعد، عین جنگ میں بھی نماز عصر کے لیے سر جھکا دیا اور چند روزہ دنیاوی حشمت کے لیے اُن کا سرتن سے جدا کر دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق، بعد از واقعہ کربلا، نوے سال تک اس موضوع پر تاریخ لکھنے سے سرکاری طور پر روک دیا گیا تھا کہ حق بات سمجھنے نہ آئے۔ لاریب تاریخ میں اس حق پروری کی مثال نہیں ملتی۔

ح نکل کر خافتہ ہوں سے ادا کر رسم شبیری



پچم اختار

پاک فضا سیکی
ماستان شجاعت

دوڑوں کی کہانی

مسکری روایت کسی بھی زندہ قوم سے ملتی ہیں۔ نہیں سے آئے، اس زندہ رہنا سستی ہے۔ جذبہ حریت ان کی کہانیوں میں آپ و خون کی روشنی ملتی ہے اور انسانی فطرت کے افول کے راز بھی نہیں کے۔ یہ افسانے نہیں، تاریخی سچائیاں ہیں۔

بکثرت و قدر میں اپنے راز سے حق فرمیں۔

مکتبہ داستان

26- پلاٹ نمبر 1 اور 2، فون: 37356541

خطوط و خیال

یہ کالم قارئین کے خطوط اور آراء سے ترتیب دیا جاتا ہے اور ایڈیٹر کا ان سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ اب قارئین اپنی آراء بذریعہ SMS بھیجوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)



لا زوال کہانی

خوبی ہے۔ ہا مقصد اور سبق آموز تحریریں دے رہے ہیں۔ جذبات میں ہلچل مچانے پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرے نیک جذبات قبول کریں۔

”شریف پورے کا پوگی“ ایسا بھی ہوتا ہے، مقدر کا شکاری، خواب، جب ماں بچہ ہوئی، موت کا بوسہ عمدہ ہی نہیں بہت عمدہ تحریریں ہیں۔

محترم ریاض عاقب کو بڑا صاحب کے نئے سلسلہ وار ناول ”لاڈورانی“ کی پہلی قسط کی اشاعت، بنیاد اور تانا بانا انتہائی مضبوط ہے جبکہ ناول ”بردہ“ کی پندرہویں قسط بھی تہہ بند کیے ہوئے ہے۔ ششپنس، تجسّس میں مزید اضافہ ہوا۔ مکہ قلیلہ اپنے عاشقوں اور دشمنوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ رہی ہے۔ بڑا زبردست کردار ہے۔ محمد رضوان قیوم صاحب کی پراسرار کہانی، ”ادھوری محبت“ کے واقعات اور سلسلے عروج پر ہے۔ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے کہانی کون سا موڑ مڑے گی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ خاصی دلچسپ تحریر ہے۔

برادر عارف محمود صاحب، السلام علیکم! جون کا شمارہ جولائی کے پہلے ہفتے موصول ہوا۔ کوئی بات نہیں حالات ہی ایسے ہیں لیکن دوسرے ڈائجسٹ پرچوں کی طرح آپ نے ہر مسئلہ پر مٹی جون جولائی یا جون جولائی اٹھا تو نہیں لکھا۔ ہاتھل کے چٹاؤنے بے حد متاثر کیا۔ اب جہاں حد مشہود صاحب ہر مسئلہ مضمون کی کمی کو خوب پر سر رہے ہیں۔ ان کا ”بے یقینی کی بھول بھلیاں اور عوام“ پر تجرّ، یہ بھی شاندار ہے۔ ادارے دونوں کاٹ دار ور حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ ڈیجیٹر شہ اد صاحب اور کے ایچ مجاہد صاحب نے زبردست شہزادی کی ہے۔ اللہ سے زور قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر مبشر حسین ملک صاحب کی ”جسوسوں پر چائیں“ دردناک اور شرمناک حقائق پر مبنی ایک لازوال تحریر ہے۔ ان کی تحریر میں افسانے سے زیادہ حقیقت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ منظر نگاری ان کی تحریر کی اضافی

ہیں اور ان کو سمجھ نہیں آ رہی کہ جانا کدھر ہے؟ کرنا کیا ہے؟ ہمارے گا کیا؟

”حکایت“ کا مکمل نہایت با مقصد اور منفرد ہوتا ہے۔ اس کے لئے آپ اور معظم جادید بخاری صاحب داد کے مستحق ہیں۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

✽-----انوار اللہ علوی۔ فیصل آباد

پُر تکلف تحریر

پیارے عارف بھائی، السلام علیکم! ”حکایت“ مل گیا اگرچہ خاصا لیٹ ملا لیکن اس کی کوئی پروا نہیں، ملتا رہنا چاہئے بے شک لیٹ سہی۔ ان حالات میں جب ہر طرف بے یقینی کے سائے منڈلا رہے ہیں ”حکایت“ کا تسلسل سے ملنا بھی نعمت ہے جبکہ کئی ڈائجسٹ پرچے ٹائٹل پر مٹی/جون/جولائی لکھ کر ایک پرچے سے تین ماہ بگھلتا رہے ہیں۔

”لاڈو رانی“ آئی اور چھا گئی۔ لگتا ہے ریاض عاقب صاحب ایک بار پھر ہمارے اعصاب کی مضبوطی کا امتحان لیں گے۔ ڈاکٹر مشر حسن ملک صاحب کہانی اچھی لکھتے ہیں لیکن ان سے گزارش ہے کہ سادہ اور آسان الفاظ استعمال کیا کریں۔ پُر تکلف تحریر پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہے اور ہم لوگوں کو حالات نے پہلے تھکا رکھا ہے۔ مکمل موجودہ حالات کے حسب حال ہے۔ ٹائٹل پرچے کی جان ہوتا ہے۔

✽-----محمد طفیل قیصر۔ بحریہ ناؤن، راولپنڈی

شمارہ جون۔ تفصیلی نظر

محترم بھائی عارف محمود صاحب، السلام علیکم! اگر مقامی ڈاک خانہ کی سستی، لاپردائی اور دھاندلی کو درمیان سے نکال دیا جائے تو حالات کے تناظر میں پرچہ جلد مل

سکتا ہے۔ مزاج کے موضوع پر لاہور سے ”جاتے جاتے“ اور ”مغرور باتونی“ ایسی تحریریں پریشانی اور ٹینشن کے ماحول میں ہونٹوں پر مسکراہٹ سمجھ دیتی ہیں۔ حکیم مختار احمد ناز صاحب کا تجزیہ ”منگائی، کل اور آج“ میں پنجابی کے ایک شاعر نے گزشتہ دور کا نقشہ کھینچا ”منگائی لاہور سی“ نے تو بے حد محفوظ کیا ہے۔ واہ بھئی واہ!

”پتنے اور سراب“ لمحہ فکر ہے۔ جبکہ ”کالی زبان“ مہمان نوازی کا معیار، جوگی سانپ اور منتر، صحرائی سانپ راہ گم گشتہ مسافر (نظم) بے حد پسند آئیں اور کالی محفوظ ہوئے۔ ”سانچہ مشرقی پاکستان“ ایک اچھی کاوش ہے۔ مپوزنگ کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں سوائے فہرست مضامین میں ادھوری محبت کی بجائے دشواری کہانی لکھا گیا ہے۔ قاری جی (محمد افضل رحمانی) تھے جے؟ ہوں! پیرازادہ، مکمل کر دیو۔

آخر میں ”اظہار خیال“ میں بھائی اعجاز حسین شہار صاحب نے چوہدری اصغر علی جیدی (مرحوم) کے بارے ایک لفظ تک لکھنا گوارہ نہ کیا۔ افسوس ہے! حالانکہ اسی کالم میں دونوں کی ادبی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ گل جھوں باہر اے!

”حکایت“ کی محفل کے تمام دوستوں کو سلام!

✽-----محمد صدیق۔ جنڈوالا، چوئیاں

ٹائٹل پر میری تصویر

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! شمارہ جون ماہ میں آپ سے ناراض ہوں۔ یہ آپ نے ٹائٹل پر میری تصویر لگا دی ہے۔ یقین کریں آج کل جو ذہنی حالت ہماری ہو چکی ہے یہ ٹائٹل اس کے حسب حال ہے۔ 85 فیصد لوگوں کی ذہنی حالت یہی ہے کہ وہ موجودہ غیر یقینی حالات کی بھول بھلیوں میں جھپک رہے

اور دیکھنے والوں کے لئے کھلا سبق ہے لیکن ہم تما شے دیکھنے کے عادی ہیں۔ واقعہ کی صحت کے مطابق لطف لیتے، افسوس کرتے اور توبہ بھی کرتے ہیں پھر زندگی کے معمولات میں پڑ کر بھول جاتے ہیں۔ ہر صبح کی ابتدا نئے جوش، جذبے، خواہشوں اور منصوبہ بندی سے کرتے ہیں اور دولت کمانے کا ہر گر آزما تے ہیں لیکن یہاں نعیم اور خاص طور پر بلقیس کے کردار، رویے اور دنیا سے نفرت نے حیرت سے آنکھیں کھول دی ہیں۔ سکون سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے، اپنی مرضی سونے، جاگنے میں کتنی لذت ہے جب دولت کی فراوانی ہو تو سوطرح کے بکھیرے ذات سے چٹ جاتے ہیں۔ اگر بوقت ضرورت نعمتوں کے حصول کو مطمع نظر بنایا جائے تو حقیقی خوشیاں دامن میں بھری رہتی ہیں اور موج ہی موج ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کیا آئینہ لائے ہیں، ظاہری خدو خال کے ساتھ عاقبت بھی سنواری جاسکتی ہے۔

”سپنے اور سراب“ میں سارا الزام حلیف پر دیا جائے گا، خوب لعن طعن ہوگی اور ظالم، ہوس پرست کا خطاب ملے گا لیکن دوسرا پہلو بھی دیکھئے کہ بانو نے کوچیوں میں برتن مانجھتی، مینے غلیظ کپڑے دھوتی اور واش روم کے فرش چمکاتی ماں کی مشقت کو دیکھا نہ بوڑھے باپ کے دفتر کی میزوں کو جھاڑتے پوچھتے، پسینہ بہاتے اور ہڈیوں کی خوشامد کرتے تھریوں زدہ چہرے کی لاج آئی اور حیدر آباد سے آن دیکھے خیالی محبوب کی خاطر کراچی جا پہنچی، آخر حیا، عزت، غیرت، انا اور نسوانیت بھی کسی چیز کا نام ہے۔ خود کو اتنا سستا کر لیا جائے کہ تو وجود کو جسموں کی جانچ پرکھ رکھنے والے جھوٹے گدھ نوح کر بدیا ہی چھوڑیں گے۔ بھلا کون تھا جو پردیس میں اس کے دکھ درد بٹاتا، حوصلہ دیتا، آنسو پونچھ کر سیدھی راہ دکھاتا، جوانی، دیوانی نے جس راہ پر ڈال دیا تھا وہ خمار اترتا تو ارد گرد کی خبر ملتی۔ آنکھوں پر

بھی تھک لوگوں کی پریشیاں، مشکلات اور خوف دور نہیں ہوا لیکن شاید اب حالات کے ساتھ جینا سیکھ رہے ہیں۔ اسی لئے حافقی احکامات کو نظر انداز کر کے چہل پہل میں اضافہ ہوا ہے لیکن حالات میں بے یقینی تو ہے جس میں عوام پھنسے ہوئے ہیں۔ اس لمحہ کی بھول بھلیاں دنوں میں کھٹنے سے رہیں اس لئے ہم اپنے معمولات کی طرف آتے ہیں۔

محفل میں ساتھی خوب حصہ لے رہے ہیں، خوش اخلاقی سے اپنا نقطہ نظر بیان کر رہے ہیں، کئی نئی معلومات سامنے آ رہی ہیں۔ ایسا سلسلہ گوارا ہے تاکہ آپس میں ربط رہے اور خصوص و محبت کے رشتے قائم اور بڑھتے رہیں۔ پروفیسر فلک شیریل، محمد ادریس انور کہوت اور محمد صدیق جنڈوالہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں جنہیں احتیاط سے برتنا اور سنبھال کر رکھنا ہوگا۔

”شریف پورے کا پوگی“ آوارہ، ہڈ حرام اور پرلے درجے کا غیر ذمہ دار جوان تھا لیکن رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا تھا یہی وجہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کی عزت خطرے میں دیکھی تو جان کی پروا نہ کرتے ہوئے دل کی ماں کو خطرے میں کود پڑا، حالات بالکل اس کے حق میں نہ تھے، موت صاف نظر آ رہی تھی لیکن اس نے بیس سال آوارگی کا بدلہ لٹھوں میں چکا کر جنت میں گھر بنالیا اور شہید بھلایا۔ اس کی کوئی نیکی اللہ کو ایسی پسند آئی کہ زہر سے ہیرو بن گیا۔ کسی کے ظاہری حال پر نہ جائیے، بد حال، مست اور جھپٹڑے لٹکائے گلی گلی پھرتے مہم نقیہ دل میں اللہ کے برگزیدہ بندے بھی چھپے ہوتے ہیں جو تماشہ اہل کرم چمچ رہتے ہوتے ہیں۔

”مہنگائی، کل اور آج“ میں پرانی روایات اور بھائی چارے نے مزہ دیا ہے لیکن آخر میں پنجابی نظم ”نکا جیلا ہو سی“ مینہ لوٹ لے گئی ہے۔ ”ایسا بھی ہوتا ہے“ میں جیسے چودری عبرت کا نشان بنا ہے۔ پڑھنے، سننے

عیاشیاں چین سے بیٹھے نہیں دیتیں۔ یوں ہم ادھر تو کامیاب ٹھہرتے ہیں لیکن آخرت کا عذاب گلے میں من پسند، خوبصورت اور قیمتی باری طرح ڈال لیتے ہیں۔ ہمیں خود کو سمجھنا، سنوارنا ہوگا۔ کب تک فیصلہ نہیہ جیسے سپوت ہمیں نجات دلاتے رہیں گے۔ دوسروں کی قربانیوں سے پہلے اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کی ضرورت ہے یوں دوسروں کے ساتھ اپنا بھلا بھی یقینی ہے۔

سیدہ شاہدہ شاہ نے کمال ہنرمندی سے طویل بکھرے واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر پوری انسانیت کو بھلائی کی ترغیب دی ہے۔ اللہ آپ کو اس نیک عمل کا اجر دے گا، بس دامن پھیلائے رکھئے۔

”لاڈلورانی“ میں محمود برے چھنے ہیں، دعا کا جیسا مزاج بن گیا ہے یہ انا، خود سری اور ہٹ دھرمی ایک نہیں کئی سانحات کو جنم دے سکتی ہے جس میں گھراڑ سکتے ہیں، دل ٹوٹنے کا حادثہ ہو سکتا ہے، خوابوں کی تعبیریں انٹ ہو کر پانی میں آگ لگا سکتی ہیں اور بڑی منتوں، مردوں سے جڑے بھندھن کا کچ کی چوڑی کی طرح ٹوٹ کر جسم زخمی کر سکتے ہیں۔ عمارہ، بریرہ شاید ہی شہر سدھار سکیں۔ دعا اب آکاس ہیل کی صورت اختیار کر چکی ہے جو پھول، پھل اور سبز پنوں کو ایسے بڑپ کرے گی کہ کسی دوسرے ڈی ففس کے امیرا کرنے کی گنجائش نہ ملے گی۔ مجھے ابھی سے خطرے کی بو آ رہی ہے اور یہ بھی درد کی بات نہیں کہ کسی جذباتی حرکت کے نتیجہ میں آگے چل کر نمود اپنا مقام، مرتبہ، عزت اور وقار کھو بیٹھے اور نمک حرام کھلانے کے ساتھ بچھتاؤں میں جانا پڑے، جب کہانی کا سارا بوجھ دعا پر ڈال دیا گیا ہے تو لاڈلورانی پڑا نہ کی صورت ضرور چونکا دے گی۔ ریاض عاقب کو ہر صاحب ماحول، کرداروں، رویے، ترجیحات، مزاج اور عادات کے علاوہ پورے وسیع و وساتھ لے کر چلے ہیں۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں دھماکہ خیز نتائج کے حامل واقعات

خوابوں کی پٹی بندھی تھی، دنیا کی حقیقتیں دیکھنے سے کھٹی ہیں وہ حنیف کے امیرانہ ٹھٹ باٹ، محل نما کونھی، کاروبار اور ٹھنڈے دفتر کے خوابناک ماحول کے نشہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ تک نہ سوچا جو جوان ہر آسائش رکھتا ہے اسے کراچی میں ٹریکوں کی کیا کمی ہے۔ بس اسے اپنے بے وقت کے خود ساختہ خواب لے ڈوبے اور حنیف کے گناہوں کی فصل بھی پک کر تیار تھی، اسے گرفت میں آنا تھا یوں دونوں انجام کو پہنچ کر نمونہ عبرت بن گئے۔ بھائی ممتاز احمد تسلسل سے حاضری اور ہماری دل بستگی کا سامان کرنے پر شکر یہ قبول کریں۔

”خواب“ میں انسان کی جن فطری کمزوریوں کو اجاگر کیا گیا ہے، پڑھ، سن کر سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ ہر کیسے جہلی خواہشات میں جانوروں کو مات دینے پر تے ہوئے ہیں۔ دولت کب تک کام آئے گی؟ قانون کی گرفت میں نہ بھی آئیں تو سوطرچ کی بیماریاں ہیں، حادثات کا شکار ہو سکتے ہیں پھر یہ ٹھٹ کس کے کام آئے گا۔ ان لعنتیں بھیجنے والے زیادہ ہوں گے۔ ویران قبر پر کسی نے فتح پڑھتے نہیں آنا ہنگامہ چند دنوں بعد لوگ بھول جائیں گے اور سرے سے ساری کہانی ختم ہو جائے گی لیکن یہ مناظر دنیا اور زمین سے اوپر کے ہیں۔ قبر میں یہاں امتحان، حساب اور اخلاقیات شروع ہوگا کہ دیکھنے والی آنکھ ہوتی تو جیتے جاگتے وجود ہوش کھو بیٹھتے۔ اب قبر کے مبین کی حالت کا اندازہ کر لیجئے کہ بھڑکتی آگ میں سر، نفیس اور شوق سے پالے گوشت کے جتنے، گھسنے اور کوند بننے کا کیس بولنا کہ منظر ہوگا۔ جب ہمیں احادیث، علمی فقہیہ، تقدیر اور قرآنی آیات میں تنبیہ کر دی گئی ہے، ہر بات انہی پکڑ سے سمجھانی گئی ہے، ڈرایا، دھمکایا گیا ہے اور انسانیت کے تقاضے کھول کر بتائے گئے ہیں تو اسے سمجھنے میں ہماری عقل یا سمجھ کیوں ہو جاتی ہے۔ شاید ہمیں دیکھی، سنی جانے والی لذتیں، سہولیات اور

چھ روشتاں کراتے ہیں۔ ابھی طویل سفر ہے، دیکھنا ہے کتنی مشکلات رکاوٹ ہوں لیکن یہ بات طے ہے کہ خوب ٹھہرے گی۔

”جوگی، سانپ اور منتر“ میں جوگیوں کے روایتی قصے، کہانیاں اور مہربان ہونے کے بدلے سوغات دینے کی پرانی باتیں ہیں ان میں کتنا بچ اور سانپ داستان کے لئے کیا کچھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ سب سننے کے لئے پرانے لوگ نہیں رہے لیکن خوف و دہشت کی علامت سانپ موجود ہیں۔ ہمارا علاقہ صحرائی ہے یہاں کھیتوں میں سانپ عام ہیں البتہ زہریلی نسل کم ہے۔ سال میں ایک آدھ بار جوگیوں کا پھیرا بھی ہو جاتا ہے لیکن لوگ ان کی کسی بات پر اعتبار کرتے ہیں نہ دوائی خریدتے ہیں۔ البتہ مہمان کی طرح چائے، پانی اور روٹی ضرور پیش کرتے اور پرانا وقت یاد کرتے ہیں لیکن وہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا بس آجیں بھری جاسکتی ہیں۔

”جسوس پر جانیں“ کاشی کی لازوال، طویل اور جتنی ردینے والی روئیداد ہے۔ وہ کتنی سادہ، معصوم اور اپنے مسائل میں مطمئن رہنے والی لڑکی تھی۔ سوچیں محدود تھیں لیکن حسن پرست لگا ہوں نے اڑان بھرنے پر اسے پاتا تو نادانی میں وہ اُن دیکھ دیں کی سیر کو نکل کھڑی ہوئی لیکن یہاں سراپے، دادوینے اور نظارے فید کرنے والوں کی بجائے پر نوپنے اور ہال کھینچنے والوں سے سامنا ہوا جو ہر روز اندسے کا انتظار کرنے کی زحمت نہ اٹھانا چاہتے تھے بلکہ مرغی ذبح کرنے کے درپے تھے یوں اس کا تڑپنا، سسٹنا اور پروں سے ماتم کرنا کسی کو دکھائی نہ دیا اور وجود ہو ہی نہ کیا۔ اُس راستے پر خلوص لوگ ملے تو پہچان کتنی نہ قدر کر سکی۔ اُس آنے والے دنوں کا لائحہ عمل ترتیب دیتی تو ڈھنگ سے نیا گھر بنا لیتی شاید مختص ساتھیوں کی رہی اور کئی پینگ کی طرح مختلف فضاؤں میں ڈل جتی، ہنسی کرتی رہی۔ جس کی دسترس میں آئی محض لوٹ کے مال کا

حشر ہوا۔ ہر موقع محل پر مقدر نے شکست فاش دی ہر ایک غلط قدم کیا اٹھا کہ منزل ہی کھوئی ہوگی۔ اب اس کے لوٹ آنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، یہ دہلی بلکہ ابھی چنگاریوں کو ہوا دینے والی بات ہے۔ کتنی باتیں، کہانیاں اور انکشافات نے ماحول کو گرما بیا اور لواحقین کا سر جھکا دیا ہوگا۔ البتہ اس کی کہانی سے علاقہ کی لڑکی باغیانہ سوچیں ذہن سے نکال چھینکے تو جائے نقصان کا احساس کم ہو جائے گا اور ڈاکٹر بشر حسن ملک نے راتیں جاگ کر آنکھیں جلائی ہیں اس پر پیچھے مڑتے قدموں اور پچھتاوے میں بیٹے اُسوؤں سے ٹھنڈی پھوار پڑا کر دل و ذہن میں طمانیت بھر دے گی۔

”جب ماں بیوہ ہوئی“ میں جو پڑوسی مروٹے سب فرشتہ صفت تھے وگرنہ بیوہ عورت اور جوان بیٹیوں کو زندہ نگلنے کے لئے سب درندے کی شکل بدل لیتے ہیں پھر جب شباب کے ساتھ ویاہی اسباب و مال بھی ہو تو درندگی اور نا انصافی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ شاید یہاں کوئی نیکی کام آگئی کہ قدرت نے ہر موقع پر عزت بخشی اور رسوا نہ ہونے دیا وگرنہ کئی شکاری مورچہ سنبھال کر کمزوری کی تلاش میں رہتے اور سالم نگلنے کی کوشش کرتے۔ جو معاون و مددگار رہے انہیں اللہ کی ذات صلہ دے گی۔ یہ خود بھی جب وقت ساتھ دے تو فرصت میں شکر کا سجدہ کرتی رہیں۔ محترم محمد اور بیس انور کبوت ایک راستے پر چل نکلے ہیں۔ جذبات اور خیالات کا غڈ پر بھیر کر قرق رہیں کی عدالت میں آ کر داد و تحسین سمیٹیں گے تو انہیں اطمینان ہوگا۔

”موت کا بوسہ“ انسانی عقل سے ماوراء واقعات ہیں اسے مجرہ کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ جیسے ٹرائی کو نین وقت پر افراتفری میں پٹری سے ہٹانے کی کوشش کی گئی اس کی دماغ میں کوئی وضاحت سے نہ تو جبہ پیش کی جاسکتی ہے۔ بس کوئی ایسا ہاتھ اور طاقت تھی جس نے سارا کام

نیام چڑھ دوڑا۔ اپنے حق کی خاطر جہاد فرض ہے۔ میں یہ فرض پورا کرنے بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کے فارمولے کے تحت جی بی او پر حملہ آور ہو گیا۔ بیرونی گیٹ پر متعلقہ پوسٹ میں منسکراتا ہوا مل گیا اور اپنے بنڈل سے ”حکایت“ نکال کر مجھے تنہا دیا۔ سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

عارف بھائی! اگر بُرا نہ مانیں تو عرض کروں (مجھے پتہ ہے آپ بے حد کول ماسٹڈ ہیں) اس مرتبہ سرورق بالکل پسند نہیں آیا۔

(حالانکہ اس ماہ سرورق بہت پسند کیا گیا۔ مدیر) میری تحریر ”داستان مرزا صاحبان“ پر اعجاز بھائی کی خاموشی حیران کن ہے۔

محترم بھائی! آپ کو میں نے آف دی ریکارڈ ایک پیشکش کی تھی مگر آپ نے نہ تو آف دی ریکارڈ اور نہ ہی آن دی ریکارڈ اس پیشکش کا جواب دیا۔ دلہن کی خاموشی رضامندی جبکہ مرد کی خاموشی انکار کے زمرے میں آتی ہے۔ ٹھیک ہے اگر آپ کو نہیں منظور تو آپ کی مرضی۔ جواب دینا تو اخلاقی فرض بنتا ہے۔ آئندہ سال کے لئے ”حکایت“ کا چندہ/بدیہ ارسال خدمت ہے، ملنے پر مطلع کیجئے گا۔

محمد ادریس انور کہوٹ۔ چکوال

ہم... ادریس بھائی! نام کا دھڑن تختہ کرنے پر کمپوزر صاحب کو اثر کر دیا گیا ہے کہ وہ کمپوزنگ کرتے وقت آگے گھٹا چھوڑ دیں ورنہ کوئی برا فساد بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ جہاں تک آپ کی پیشکش کا سوال ہے تو اس کے ایک ایک لفظ سے خلوص غپ رہا ہے۔ دراصل میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ بہر حال ”قبول ہے“ قبول ہے۔ قبول ہے۔ (مدیر)



انجام دلا دیا اور پانچ انسانی جانیں بے گناہ لقمہ اجل بننے سے بچ گئیں۔ اس کھوج کو بے نتیجہ چھوڑ دینے میں ہی منافیت ہے لیکن یہاں نسیم سیکینہ صدف کی کوشش اور انتخاب کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

”صحرائی سانپ“ خط ناک پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ میرا آئی بار آبادی سے باہر سانپ سے سامنا ہوا ہے، چچی بات ہے وہ چھوٹا ہوا یا کم زہریلا، محض چوہے نکلنے والا کسان دوست ہو لیکن قدموں میں جان رہتی ہے نہ دماغ کوئی فیصلہ کرنے یا رہنمائی کے قابل رہتا ہے۔ واقعات میں تسلسل اور دلچسپی کا وافر مواد موجود ہے۔ محمد نذیر ملک مختصر آئے لیکن خوب آئے اور ایک تاثر چھوڑ گئے ہیں۔

اعجاز حسین۔ ٹھار۔ نور پور تھل

سرورق پسند نہیں آیا

السلام علیکم! امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ 2 جولائی کو جب آپ کا بیج موصول ہوا کہ پرچہ 30 کو پوسٹ ہو چکا ہے، تو اسی وقت شدید گرمی میں ہک سٹال کی طرف بھاگا۔ یہ خدرشہ لاحق ہوا کہ لاہور سے روانہ شدہ رجسٹری بھی نہ ملے اور نوکل مارکیٹ سے ”حکایت“ ختم ہو جائے۔ وہی بات نہ ہو جائے

نہ خدا مل نہ وصالی صم
نہ ادھر سے رہے نہ ادھر کے رہے
گھر آ کر جو پرچہ کھول کر دیکھا تو صفحہ 197 پر اپنے نام کا پوسٹ مارک دیکھ کر تھلا اٹھا۔ جی چاہا کچھ کردوں مگر پھر میں خیال سے صبر کے پانچ سات گھونٹ پی کر شانت ہو گیا کہ بھائی اعجاز۔ ٹھار اور صدیق بھائی تو شمشیر بے نیام لے کر مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔ کچھ نہ کر سکا۔ ”اور ہم چپ بی رہے۔“

3 جولائی کو جی بی او والوں پر غصہ نکالنے کو بے

صحابہ کا ایمان

اگر تم نے ان صحابہ ابو بکر، عمر، عثمان، علی و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، کا
سا ایمان و طریقہ دین نہ اپنایا تو پھر تم اہل فساد ہو۔ تمہارا دعویٰ کہ ہم
اصلاح پسند ہیں، سب بے بنیاد، زبانی جمع خراج و دھوکا ہی دھوکا ہے۔

☆ اسلام رازی

خیر پور سادات

رسولؐ سے بھرتا ہے، قسم کے لوگوں کو ظاہر کرنا مقصد تھا
لہٰذا عَنِ النَّبِيِّ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَنْقَلِبُ عَلِيٌّ عَقْبِيه
کہ ہم رسولؐ کے تابعدار و رسولؐ سے قرار والے ظاہر
کریں، کہ آیا وہ اسے جاہدایت قرار دیتے ہیں یا نہیں؟

جب نبیؐ نے کعبہ مکرمہ کو قبلہ و مرکز دین بنایا، تو بہت
سے لوگ معترض ہوئے اور کعبہ کے مرکز دین ہونے، جا
ہدایت ہونے کے انکاری ہو گئے۔ اعتراضات کا طوفان
اٹھایا نبیؐ و اصحاب نبیؐ یہ زبان طعن و راز کی، انہیں بے راہ
آبا کا موہن کہا۔ جس گلی محلہ و چوک میں بیٹھتے انہیں بے
اعتدال غلط مال کہنے پہ مجلس گرم ہو جاتی کہ یہ پہلے قبلہ
سے کیوں پھر گئے؟ شروع پارہ دو تا آیت 177 میں
معترضین کے مختلف اعتراضات کا جواب درج ہے۔

محض مشرق یا مغرب مقصود نہیں، بلکہ اللہ کی مانند
اصل مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کعبہ جاہدایت ہے۔
تو اللہ کی یہ بات ماننی ہے اور اصول دینی یہاں والے

”مشرق“ کی طرف منہ کر لیتا یا مغرب کی طرف،
یہ کوئی نیکی نہیں نہ اصل مقصد ہے۔
اصل مقصد، اللہ کی بات ماننا۔ یوم آخریہ یقین۔ ملائکہ اور
کتاب پہ عقیدہ کی اٹھان۔ نبیوں پہ ایمان اور اللہ کی محبت
پس قرابت داروں، یتیمی، مسکین، مسافروں، سائلین
اور سردمیں چھڑانے میں مال خرچ کرنا۔“ (پارہ 2 آیت
177)

یہ بت ترجمہ اور اللہ تعالیٰ کی رائے۔
بیت المقدس مسجد اقصیٰ کی نسبت، کعبہ مکرمہ مشرق
کی طرف ہے، کعبہ مکرمہ کی نسبت، بیت المقدس مسجد
اقصیٰ مغرب کی طرف ہے۔ پہلے نبیؐ مع اپنے صحابہ، بیت
مقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ
بعد بحکم اللہ، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔
کعبہ کی طرف منہ کر کے واسے جاہدایت قرار دینے سے
دشمن، منافق اور کون رسولؐ کی تابعداری کرتا ہے، کون

فرمان جن کو ماننا ہے کہ کعبہ مکرمہ مرکز دین و ایمان ہے۔ تب یہاں مشرک امام نہیں بن سکتا۔ مرکز دین و ایمان سے متفاوت اصول دین و ایمان، محض منہ مشرق یا طرف مغرب ہوگا اور محض منہ نہ نیکی ہے نہ اصل مقصد۔ اسے اصحاب بصیرت سبق پکڑیں۔

اگر صحابہؓ نبیؐ کا سا طریقہ دین و ایمان اختیار نہیں کرتے تو پھر تم فساد کی ہو۔

و اذا قيل لهم آمنوا كما امن الناس، قالوا انؤمن كما امن السفهائى الا انهم السفهاء و لكن لا يعلمون (سورة البقرة: 13)

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ لوگو صحابہ (جب آیت اتری تو ناس لوگ صحابہ ہی تھے) کی طرح ایمان لاؤ طریقہ اپناؤ، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم ایسا ایمان و طریقہ اختیار کریں جیسا بے دقوں کا ہے۔

اس آیت پاک کے سبق میں ذکر منافقوں اور مشرکوں کا ہے جو اپنے تیار طریقہ کو مصلحانہ بھارتے تھے۔ اللہ نے فرمایا۔ تم فساد کی ہو لیکن تم کو شعور نہیں کہ فساد کیا ہے۔ اصلاح کیا ہے؟ فرمایا۔ ”چنانچہ یہ ہے کہ اس طرح ایمان و طریقہ دین کر دو جیسا صحابہ کا ہے“ اگر تم نے ان صحابہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، کا سا ایمان و طریقہ دین نہ اپنایا تو پھر تم اہل فساد ہو۔ تمہارا دعویٰ کہ ہم اصلاح پسند ہیں، سب بے بنیاد، زبانی جمع خرچ و دھوکا ہی دھوکا ہے۔

مگر وہ منافقین صحابہ کا دین و طریقہ اختیار کرنے کے بجائے کٹ چھین کر کے لگے، انہیں کم عقل، بے وقوف اور غلط کردار کہا۔ ان منافقین مشرکین کو جہاں نبیؐ کے پیغام توحید کہ اللہ کے سوا کسی کو پکارو، سے چڑھی دہاں صحابہؓ سے تو سخت نفرت تھی اور کہتے تھے کہ یہ صحابہ اگر تعاون نہ کرتے تو ہم آکیلہ کیا کر لیتے؟

یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کعبہ جابرکت ہے۔ تو اللہ کی یہ بات ماننی ہے، تب بابرکت مقام کے عقیدہ کے رسول بابرکت ہیں قیامت تک۔ فرمایا ہدیٰ للعالمین مالمین، زمانے اور لوگ جب تک رہیں گے، یہاں برکات و ہدایت والے صحیح عقائد اصول مروج رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ اور رائے بھی ذہن میں رکھ لیں، جب یوم فتح مدنیؐ نے ابراہیمؑ نبی، اسماعیلؑ نبی، عیسیٰؑ نبی ان کی والدہ گرامی پاک بی بی مریمؑ اور لات منات بزرگان کی شبہیں تڑا کر کعبہ سے نکال باہر کرائیں۔ اُن کلموں کا آج تک پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔

اگر معلوم ہو جائے تو آج کے لوگ اُن کلموں کو تبرک کے طور گھر لے آئیں گے۔

تب اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کی گارنٹی دے دی انما المشركون نجس فلا بقره المسجد الحرام بعد عامهم هذا بے شک مشرک پلید ہیں، آج کے سال کے بعد (بعد فتح مکہ) مسجد الحرام کعبہ مکرمہ کے قریب نہ آئیں گے۔ یعنی اب یہاں پر کوئی بھی اپنی مشرکانہ رسم پر پانہ نہ کر پائے گا۔

تب سے اب تک داب سے قیامت تک اللہ کا مرئی و غیر مرئی نظام حفاظت یہاں پہ جاری و ساری ہے اور غیر مشرکانہ رسوم قائم ہیں۔ اس بابت مزید دو حدیثیں سن لیں۔ فرمایا: ساری دنیا میں دین بدل جائے گا مگر درد جگہوں مکہ، حدیث میں وہی دین رہے گا جو چھوڑے جاتا ہو، او کما قال فرمایا: اب چاہی بردار کعبہ، تجھے یاد ہے میں نے تجھ سے کعبہ کی چابی مانگی تھی کہ اندر عبادت کروں، اور تُو نے انکار کر دیا تھا۔ وہ بولا یا رسول اللہؐ تب کی بات اور تھی۔ اب یہ لیں چابی۔ آپؐ نے اُس سے چابی لے لی اور پھر داہن کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ لو چابی، اب قیامت تک یہ تیرے خاندان میں رہے گی۔“ او کما قال یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے بیان اور نبی اکرمؐ کے

ابھی وہ اس آگ میں جل رہے تھے کہ نبیؐ نے مدینہ میں اذان شروع کرائی، جو قیامت تک رہے گی۔ مشرک تملکے کہ یوں نہ ہو یوں نہ ہوا۔ یہ مشرکین مکہ و مدینہ اپنی اولادوں، رشتہ داروں، دوستوں و عقیدین کرتے کہ جس قدر ہو سکے اصحابِ محمدؐ کی کردار شی کروان کے کم عقل اور غلط کار ہونے کی ہر رنگ کی کہانیاں گھڑتے رہے۔ منافقین مشرکین کا سہی ہو گئے وقوف و غلط کار کہنا اللہ کو برداشت نہ ہوا، ان کے الفاظ ان پہ الٹ دیئے۔ فرمایا۔ الا انهم هم السفهاء و لكن لا يعلمون خبردارا یہ یقیناً بے شک خود بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔



نبیؐ نے جب چوٹی فاران پہاڑ پر اعلان لا الہ الا اللہ کا کیا، تو مشرکین سارے تملکے اٹھے کہ صرف اللہ کو پکاریں، عیسیٰ نبیؑ وان کی ماں بی بی مریم اللہ کی وہ کونہ پکاریں؟ ابولہب اصلی نامہ عبدالعزیٰ، نبیؐ پاک کا سگا چچا، نے تو پتھر اٹھائے اور کہا 'تبا لک یا محمد' اسے محمد آپ کو خرابی و تباہی ہو۔ ابولہب کا پاک نبیؐ کو تباہ کے الفاظ کہنا اللہ کو برداشت نہ ہوا، اس کے الفاظ اس پر الٹ دیئے۔ فرمایا: قبت یدا ابی لہب و تب اے ابولہب تجھے خرابی و تباہی ہو۔ نبیؐ و صحابہؓ بارے مشرکین منافقین کے بغض نہ مغرے شانہ بنائی کہانیوں کے الفاظ اور اللہ کا ان کے کبے الفاظ ان پہ اللہ، غصہ زور عمل سبق ہے کہ یہ تو اللہ کے پیارے لوگ ہیں، ان کو جس نے جیسا کہا اللہ نے اس کو دیا۔ اچھا کہا تو اس کے لئے اچھے الفاظ، اچھا انجام۔ خراب کہا تو خراب الفاظ اور خراب انجام۔

کوئی دعوے سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اس کی اولاد میں ذہنی یا جسمانی طور پر جنسی خرابی ہے ہم نو جوانوں کی نفسیاتی اور جسمانی الجھنیں اور ان کا سہل علاج پیش کر رہے ہیں۔ والدین سے استدعا ہے کہ اب یہ بھیڈ بے نقاب ہونے دیں جو ان کی اولاد کو دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔ موضوع نازک ہے لیکن تحریر پاکیزہ۔ باپ یہ کتاب اپنی بیٹی، بیٹے و دے سکتا ہے۔

سب سے سچے راوی اللہ نے اپنی کتاب روایت آیت قرآن میں توصیہ نبیؐ کو سچا نقاش نبیؐ باور کرایا۔ تبھی تو اوروں کو بھی ان کا طریقہ دین و ایمان اختیار کرو، کہا۔ مگر مشرکین ان کو غلط کار کہتے تھے۔

26- پیالہ گراؤٹلاہور
37356541 فون: مکینہ داستان





ستمبر 2020ء کا شمارہ

سنگریں

ہوگا۔

قیمت: 150 روپے

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں!

ماہنامہ حکایت 26- پیالہ گراؤنڈ لاہور

تاریخ کے گم گشتہ اوراق سے کشید کی ہوئی سحر انگیز داستان

قسط: 16

بیرکھ

یشدر نے تلوار کی نوک حیران کھڑی قبیلہ کی جانب تائی..... ”سردارزادی قہینہ بنت جبہ، میں صبح چلا جاؤں گا، اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو تم پوری کر سکتی ہو۔“

(aqibkohlar@gmail.com)

ریاض جانب کوثر



حنی غیر انداز میں مسکرائی۔ ”دھیان سے رہنا محترمہ بہت خطرناک ہے۔ اس کا غلام امریل بن خوشحال بن رہا تھا کہ اس نے آج تک اپنی مائٹن جیسا ماہر لڑاکا نہیں دیکھا۔“

شعر کے پیرے پر مٹی ہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”غلام اپنی مائٹن کی تعریف نہیں کرے گا تو کون

سے کیا۔“

”حنی غیر لہجے میں ہوئی۔ ”تمہیں اگلی بن ملیٹ بننے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“ اس کا زخم کو

سزا دیتا ہوا ہاتھ غیر محسوس انداز میں ہتھکڑ کی چھاتی پر رینگنے لگا۔

”مذہب سے سے بڑا نام کی حد تک اعتراض نہیں ہے۔“

”مجھ میں کوئی کمی ہے۔“ حنیہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

”مجھے ہوا نہیں ہے۔“ ہتھکڑ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

”تیرا سانس بیٹے ہوئے حنیہ پیچھے تھی۔“ میں دودھ اور تھر (خشک گھجور) لاتی ہوں۔“

صحیح صادق کے ساتھ انھوں نے مقرر شروع کیا۔ صنوع آفتاب کے وقت وہ بنو طرید میں داخل

ہو رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی کی مشق کو دیکھ کر امریل گھوڑا دوڑاتے

ہوئے اس طرف بڑھ گیا۔

مکان بن لوں، رستاقہ بن زیا اور قریب بن قبیح تینوں میں کرٹیلہ نوذیر کرنے کی کوشش کر رہے

تھے۔ چاروں نے ہاتھوں میں دھات کی کند تلواریں تھیں جو شمشیر زنی کی مشق کے لیے استعمال ہوتی

تھیں۔ قبیحہ چھڑا دینی ان کی مرہمت کر رہی تھی۔ قریب پیچھے ہی امریل چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور

پہلے پڑوسی ہوئی ایک کند تلواریں اٹھا کر سرعت سے قبیحہ کی طرف بڑھا۔ قبیحہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی

تھی۔ مکان کی چھاتی میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس نے چڑھے کی ڈھال قریب بن قبیحہ کے سر

پر پھینکی۔ وہ پھر ایک دم وہی ڈھال امریل کی تلوار کے سامنے پکڑ لی۔ وار رک جانے کے بعد امریل رکا

نہیں تھا۔ بعد ازاں اسے حملے مسلسل جاری رہے اور قبیحہ اچھل اچھل کر اس کے وار خطا کرنے لگی۔ مکان بن

قریب اور رستاقہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ تینوں کے چڑھے ہوئے سانس ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کافی دیر سے

مشتاقی کر رہے تھے۔ قبیحہ کا سانس اب بھی ہموار تھا۔ البتہ پسینہ موتیوں کے قطرؤں کی طرح اس کے بلج

پیرے پر بہہ رہا تھا۔

دونوں کی تلواریں مسلسل ٹکرانے لگیں۔ امریل تازہ دم تھا لیکن سامنے قبیحہ تھی۔ لڑائی طول کھینچنے

میں۔ اب تک کوئی بھی ایسا وار مقابل کے جسم پر نہیں کر سکا تھا کہ مخالف ہارا ہوا تصور کیا جاتا۔

چھانک امریل کی زوردار لات قبیحہ کے پیٹ کی طرف بڑھی۔ پہلو پچاتے ہوئے قبیحہ نے اس کا

دار خطبہ اور اس کی جوابی ٹھونکر امریل کی دوسری ٹانگ پر لگی وہ گولہوں کے ہل چپے گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فٹیلہ کی تلوار اس کی گردن سے لگ گئی تھی۔

الہ کی مڑتی آنکھوں کے دوران تمام افراد مشتق چھوڑ کر دائرہ بنا کر کھڑے ہوئے تھے۔ امریل کے ہارتے میں زور و زلف پلندہ ہوا تھا۔ ”ملکہ فٹیلہ زندہ باد۔۔۔۔۔“

”مقرر بن آج کے ساتھ کھڑے خفاک بھی عینک نے کہا۔ ”کاش یہ اتنی اونچی لڑاکا نہ ہوتی۔“

”مقرر نے اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا: ”خفاک احتیاط سے وہ ہماری سردار ہے۔“

خفاک جلدی سے بولا۔ ”ہاں میں بھی اسے ملکہ ہی سمجھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں بولا۔ ”میں اس سے شکست کھانے کا غم بھلا نا ذرا مشغل رک رہا ہے۔“

اسی وقت امریل نے فٹیلہ کی تلوار کو ہاتھ سے ایک طرف دھکیلا اور اپیل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”دو بار رہے۔“

ایک بار پھر کھمسان کا دن پڑا۔ دونوں کا پسینہ دھاروں کی صورت میں پورے جسم کو بھٹور رہا تھا۔ اور پھر امریل کی تلوار کی نوک فٹیلہ کے سینے کی طرف اتنی سرعت سے بڑھی تھی کہ دیکھنے والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ امریل نے مقابلہ برابر کر دیا ہے لیکن بالکل آخری لمحے فٹیلہ چکدار شاخ کی طرح پیچھے کو جھک گئی۔ فٹیلہ فٹیلہ کا کھنوں سے بالائی جسم زمین کے متوازی ہوا، امریل اپنی جھونک میں آگے کی طرف بڑھا تھا۔ فٹیلہ نے اپنی تلوار کا پھلانگ نیچے ٹیک کر جسم کو وہیں روکا، ساتھ ہی اس کے پاؤں کی زوردار ٹھونکر امریل کے تلوار والے ہاتھ پر پڑی۔ اس کی تلوار اڑتی ہوئی دور جا گری تھی۔ اپنی تلوار کے دستے پر زور دیتے ہوئے وہ نشان کی نانت کے طرح سیدھی ہوئی اور اس کے سر کی بھرپور ٹھونکر امریل کی چھاتی میں لگی تھی۔ گولہوں کے ہل چپے گرتے ہوئے وہ چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ فٹیلہ نے تلوار کی نوک اس کی چھاتی پر لگا کر واپس کھینچی اور ڈھال کندھے سے لٹکا کر اس نے اپنا ہاتھ سہارے کے لیے امریل کی طرف بڑھا دیا۔

فٹیلہ نام لے نعروں سے فضا گونج اٹھی تھی۔

اس کا ہاتھ تھم کر امریل اٹھا اور پھر وہی ہاتھ دونوں آنکھوں سے لگا کر چومتے ہوئے بولا۔

”مجھے ملکہ فٹیلہ کا خصوصی غلام ہونے پر فخر ہے۔“

وہ متحسم ہوئی۔ ”ملکہ فٹیلہ تیسری بار مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔“

وہ نقیبت سے بولا۔ ”اگر جیتنے کی امید ہوتی تو کوشش کر لیتا۔“

”تو پہلے جیتنے کی امید پر لڑے تھے۔“

”نہیں۔“ امریل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یکھنے کے لیے، اگر جیتنے کی خواہش ہوتی تو اس سے

لڑتا۔“ اس نے سرخ رُوشاقہ کی جانب اشارہ کیا۔

”میں تو جیسے موسم کی گڑیا ہوں نا؟“ رُشاہ نے دانت پیستے ہوئے تلوار سونپی۔

”نہیں رُشاہ۔“ قُتیلہ نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔“

”آپ دیکھیں تو سہی۔“ رُشاہ نے اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے بجلی کی سی سرعت سے

امریل پر حملہ کر دیا تھا۔

امریل نے اس کے دو تین وار روک کر چڑھائی شروع کر دی۔ وہ مقابلہ جلد ہی ختم ہو گیا

تھا۔ امریل کی زوردار لات پیٹ میں کھا کر رُشاہ دور جا پڑی تھی۔ امریل نے اس کی گردن پر تلوار کی

نوک چھوئی۔

”اب بتاؤ سفید نومزئی۔“

رُشاہ نے تلوار کو ہاتھ مار کر گردن سے دور کیا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ”کالے رہنچھ، میں جلد ہی

اصل تلوار سے تمہارا سر اتاروں گی۔“

تما مکھل کھلا کر بس پڑے تھے۔ وہ بے پروائی سے چلتے ہوئے قُتیلہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

یشکر نے وہ مقابلے اونٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھے تھے۔ قُتیلہ کی شمشیر زنی سے زیادہ وہ اس کے

چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ بادیہ جیسی تھی لیکن بادیہ نہیں تھی۔ کڑی مشقت سے اس کا چہرہ سنولایا ہوا لگ رہا

تھا۔ رُشاہ کے شکست کھانے کے بعد خلیہ نے کھنکارتے ہوئے یشکر کو مخاطب کیا تھا۔

”کیسی گلی؟“

وہ مسکرایا۔ ”کون؟“

”دونوں۔“ خلیہ بھی کھل کھلا دی تھی۔

اس نے دوبارہ قُتیلہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کیں۔ ”بادیہ سامنے ہوتی ہے تو میں کسی اور پر توجہ

مرکوز نہیں کر سکتا اور یہ بادیہ جیسی ہی ہے۔“

اس وقت امریل قُتیلہ کو راستے میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔ اس سے باتیں

کرتے ہوئے وہ انھی کی طرف بڑھنے لگی۔ خلیہ نے اونٹنی کی مہار کو مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر نیچے

بٹھایا اور زمین پر اتر گئی۔ یشکر کجاوے میں رضائی سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔

مربوب سے کھڑے سائب بن شراحیل اور بجرہ بن وددہ پر گہری نظر ڈال کر اس نے یشکر اور

خلیبہ کو دیکھا۔

”ملکہ ثقیلہ انھیں بنو طریہ میں خوش آمدید کہتی ہے۔ آج سے تم ہمارا حصہ ہو۔ تمہارا اور بنو طریہ کا فائدہ اور نقصان ساٹھا ہے۔“

سائب بن شراحیل اور جرہ بن وددہ نے عقیدت بھرے انداز میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”ہم ملکہ ثقیلہ کے شکر گزار ہیں۔“

وہ بنو یمانہ کے آدمیوں کے گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”ان میں سے اپنے لیے گھوڑے پسند کر لو۔“ اور پھر مکان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”انھیں ایک ایک خیمہ اور تلوار دے دو۔ اور کئی سے دونوں کی تربیت شروع کرادو۔“

”جی ملکہ۔“ مکان نے مؤدبانہ انداز میں سر جھکا دیا تھا۔
 وہ خلیبہ کو مخاطب ہوئی۔ ”تمہارے پاس تو کافی سامان موجود ہے، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔“

”ضرورت کی ہر چیز موجود ہے ملکہ ثقیلہ۔“
 ”اگر سواری کے لیے گھوڑا پسند ہو تو یہ اونٹ واپس کرنے پڑیں گے۔“ ثقیلہ نے جانب اور غیث کے اونٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

خلیبہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے اونٹ پسند ہیں ملکہ۔“
 ”ٹھیک ہے کسی مناسب جگہ پر خیمہ لگا لو، امریل تمہاری مدد کرے گا۔“
 امریل خوش دلی سے سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔ اس دوران یشکر بے پردائی سے بیٹھا رہا نہ تو ثقیلہ نے اسے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ اس نے ہی یہ زحمت کی تھی۔

☆☆☆

رات کو منقر بن اسحاق اجازت مانگ کر ثقیلہ کے خیمے میں داخل ہوا۔
 ”بیٹھو منقر۔“ ثقیلہ نے نیچے پچھی چٹائی کی جانب اشارہ کیا۔
 ”میں کچھ کہنے کو حاضر ہوا تھا۔“ وہ مضطرب سا نیچے بیٹھ گیا تھا۔
 ثقیلہ نے صراحتی سے شراب کا پیالہ بھر کے اس کی جانب بڑھایا۔
 ”شکر یہ ملکہ۔“ دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھاہم کر اس نے ایک گھونٹ لیا۔
 ”کہو۔“ ثقیلہ نے اپنے لیے بھی اک پیالہ بھرا اور اس کی جانب متوجہ ہوئی۔
 منقر نے جھپٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کچھ لوگوں کے دل میں کینہ ہے۔“

وہ ہنس۔ ”سچھ لوگوں سے مراد اگر ضحاک بن قتیق ہے تو ملکہ قتیلہ جانتی ہے۔“

”اس کے بارے ملکہ لومن سب قدم اٹھانا ہوگا۔“ مقرر قتیلہ کی فراست کا پہلے سے معترف تھا۔ اس لیے اظہارِ حیرانی کے بجائے مشورہ دینے لگا۔

”اس کی کسی غلط حرکت سے پہلے اگر ملکہ قتیلہ نے انتہائی قدم اٹھایا تو بنو طرید کے ہاسیوں کے دل میں ملکہ قتیلہ کے لیے بدگمانی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے انتظار بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے سدھر جائے، نہیں تو اس جیسے دس بھی ملکہ قتیلہ کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔“

مقرر نے خانی پیالہ نیچے رکھا۔ ”ایک اور عرض بھی کرنا چھٹی۔“

”بولو۔“ قتیلہ نے دوبارہ پیالہ بھرنے کے لیے صراحتی اس کی جانب بڑھائی۔

موذّب انداز میں صراحتی تھام کر اس نے اپنا پیالہ بھرا اور پھر اٹھ کر قتیلہ کے ہاتھ میں تھامے ہوئے ادھ بھرے پیالے میں مزید شراب انڈیلنے لگا۔

صراحتی کو قتیلہ کے قریب رکھ کر وہ بیٹھا اور جھجکتے ہوئے بولا۔ ”اگر میری بات ملکہ کو بری لگے تو معافی کی گنجائش موجود ہونا چاہیے۔“

قتیلہ کے ہونٹوں پر غیر محسوس تبسم رینگا۔ ”قیردان بن اغلد اچھا جوان تھا۔ بس محبوبہ کے انتخاب میں غلطی کر بیٹھا۔“

مقرر محبوب سا ہوتا ہوا بولا۔ ”ملکہ قتیلہ میرے لیے میری بیٹی کی پشت کی طرح ہے۔“

”بولو مقرر چچا! اس مرتبہ قتیلہ کے نیچے میں نرمی تھی۔“

”میں جانتا ہوں کہ بنو طرید میں شامل ہونے والے تمام لوگوں کو ملکہ قتیلہ نے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ کوئی سابقہ قبیلے کی روایات، رسوم اور فخر و مباہات کا اظہار نہیں کرے گا۔“

”تو۔“

”بنو عقرب کے لوگ چاند کی حانت بدرسل میں جشن منانے کے عادی تھے۔ اگر ملکہ کی اجازت ہو تو ہم اس رسم کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔“

قتیلہ نے چند لمبے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد کہا۔ ”ملکہ قتیلہ کو بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی۔ البتہ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ جشن اہل بنو عقرب کی منشا پر منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس رسم

1. گویا اس نے ڈھکے چھپے غفلتوں میں قتیلہ سے اظہارِ محبت کرنے والوں کے انجام سے آگاہ کیا تھا۔

2. مصدب، تنھیں بیٹی کی طرح خود پر حرام سمجھتا ہوں۔

3. چودھویں کا چاند۔

کا اعلان ملکہ فقیلہ خود کروے گی۔ آج کے بعد بدر کی رات بنو نضیر والے جشن منایا کریں گے۔“
 ”ملکہ فقیلہ کا اقبال بلند ہو۔“ منقر اختتامی کلمات کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔ اس نے جبرے پر حاضر ہونے والی خوشی بتا رہی تھی کہ وہ مطمئن ہو کر جا رہا ہے۔
 فقیلہ نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

• ہلا ہوا •

بنو نضیر نے سواروں کی آمد کی خبر شریم پر بجلی بن کر گری تھی۔ تین دن پہلے ہی اس کی بیٹیاں، بیوی اور اس کا ہونے والا داماد مکان بن عسکر بنو اسد سے واپس لوٹے تھے۔ اور آج دوپہر ڈھلے پہ صیدت نازل ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دھڑکتے دل سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”سرداری مبارک ہو شریم بن ثمامہ۔“ چھوٹے قد اور مضبوط جسم کے مالک قرظم بن جہن نے اپنے پہلے دانتوں کی نمائش کی۔

”میرا خیال سے بنو جساسہ بہت بڑا بھگتن برداشت کر چکا ہے۔“ شریم نے ان کی آمد کا مقصد جاننا چاہا۔

قرظم بن جہن نکت سے بولا۔ ”بنو نضیر سے ٹکرانے والوں کی سلیبیں مت جایا کرتی ہیں۔“
 شریم خاموش کھڑا رہا۔ بات بڑھا کر وہ بنو جساسہ کے رہے سبے افراد کو لقمہ اجل نہیں بنا سکتا تھا۔ باویہ کی وہاں موجودی کو بھی انھوں نے بہت زیادہ خفیہ رکھا ہوا تھا اور اس کی سوچوں کو یہی اندیشہ جکڑے ہوئے تھے۔

شریم کو خاموش پا کر قرظم نے بات بڑھائی۔ ”اب ہر حال، ہم نے سنا ہے اس دفعہ تمھارے حجازی قافلے کو کافی منفع ہوا ہے، بنو نضیر کا سردار حلیف اور دوست قبائل کی دعوت کر رہا ہے۔ اس کے لیے چند مہینے جبرہ و عمدہ شراب نے درکار تھے۔ یقیناً بنو جساسہ تعاون کریں گے۔“

گھبراہٹ سے لیتے ہوئے شریم نے اپنے نڈیثوں کو غلط ثابت ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں شکر کیا تھا۔ ”ہمارا قافلہ اتنی زیادہ شراب تو نہیں لاسکا تھا، پھر بھی تمھیں دس مٹھے مل جائیں گے۔“
 ”کم از کم بیس مٹھے ورنہ ہمیں جائزہ لینے کے لیے خود تمھارے ٹوٹے پھوٹے گھروں کو کھنگالنے پڑے گا۔“ قرظم کے لہجے میں شام، غروبے شریم کو سرتاپا سلا دیا تھا۔

شریم نے بس سا اپنے کتے کے مالک کی جانب متوجہ ہوا جو غصے سے پتھر و تاب کھا رہا تھا۔ ”منسوبہ مقدار میں شراب کے مٹھے ان کے خواب پرورے۔“

قرضہ دھنڈائی سے بولا۔ ”اور ہاں شراب لے جانے کے لیے اونٹوں کی ضرورت بھی پڑے گی، بے شراب کے مکے ہم گھوڑوں کی پیٹھ پر تو نہیں لاد سکتے۔ یوں بھی بنو حسامہ نے سردار زادے، ہزیریل کا خون بہا ادا نہیں کیا تھا۔“

”آپ ہمارے بنو عربوں مویشی ہانک کرنے آئے تھے۔“ شریم نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔

قرضہ بے پروائی سے بولا۔ ”وہ مویشی قیمت کے طور پر ہمارے ہاتھ آئے تھے۔“

غصے کے اظہار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شریم نے سر جھٹک کر دس اونٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد بنو نوفل کے چند سوار دس اونٹوں پر عمدہ شراب کے بیس مکے لادے واپس روانہ ہو گئے تھے۔ بنو حسامہ والے سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بہارِ بہار

چاند نے سر شام مشرق سے سر اُبھارا۔ بنو طرید کے باسی جشن کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ خوب آفتاب کے ساتھ ہی آگ پر سالم بھنے ہوئے اونٹ، دنبے اور بکروں کے گوشت کے ساتھ انصاف کیا جانے لگا۔ خلیفہ یشکر کو سہارا دے کر باہر لے آئی تھی۔ خلیفہ کی بہترین دیکھ بھال سے اس کے زخموں میں روز بروز بہتری آ رہی تھی۔

قلیلہ کے خیمے کے سامنے ایک اونچا چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ جس پر لمبوی کا تخت رکھا تھا۔ قلیلہ اسی پر بیٹھی تھی۔ رشاقہ ایک بڑی رکابی میں اس کے لیے بھنا ہوا گوشت لے گئی تھی۔ قلیلہ نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رشاقہ مودب انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ پچھلے جشن کی طرح اس بار بھی رشاقہ نے اسے تیار کیا تھا۔ سرخ رنگ کی فُر جلی جس پر خوب صورت نیل بولے مڑھے تھے۔ قلیلہ نے ٹخنوں تک آئی فُر جلی اپنے پاس کے اوپر ہی پہن لی تھی۔ اس کے سر پر ہندسی قنادا کھول کر رشاقہ نے خوبصورت موتیوں کا ہار اس کے کھلے بانوں پر لٹکا دیا تھا۔ سرخ و سفید موتیوں کا ہار تاج کی طرح اس کے سر پر خوب سج رہا تھا۔ جشن کی شب کے لیے تمام کے لیے شراب اور کھانے کا انتظام قلیلہ کی سردار یعنی قلیلہ کی جانب سے تھا۔

چودھویں کے چاند کی رومان پرور روشنی اور پھر چار کونوں میں بھڑکتے آلاؤ کی سحر انگیز روشنی نے دونوں میں عجیب قسم کی تڑنگ اور وولد پیدا کر دیا تھا۔ لبوں سے خود بہ خود قہقہے برآمد ہو رہے تھے۔ غلوں و اکٹوں کے لیے عارضی طور پر بنو طرید کی حدود میں آنے پر پابندی لگ چکی تھی لیکن ایک ایسا شخص وہاں آیا جہہ حسامہ سے کھا ہو۔

موجود تھا جو اس ماحول میں بھی غمگین تھا۔ اپنی سردار زادی کو یاد کرتے ہوئے۔ یشر کی نگاہیں بار بار تخت پر بیٹھی ٹیلیہ کی جانب اٹھ جاتیں جو رشاقہ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ مگر اس کی ہنسی بادیہ سے مختلف تھی۔ بادیہ شرمیلی تھی اور یہ بے باک، وہ ہنستے ہوئے سر جھکا لیتی تھی اور ٹیلیہ کا چہرہ ہنستے ہوئے اوپر کو اٹھ جاتا تھا۔ بادیہ اس کی بیوی ہونے کے باوجود عموماً اسے کن اکھیوں سے دیکھا کرتی، جبکہ ٹیلیہ مزاؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھی۔ بلاشبہ بادیہ ہراساں اور معصوم ہر نی جیسی تھی اور ٹیلیہ زخمی شیرنی کی طرح خوں خوار اور بھڑکیلی تھی۔

کھانے پینے کے بعد محفل موسیقی اور رقص کی شروعات ہو گئی۔ طبقہ اور مکان کی آوازیں جادو دکھانے لگیں۔ اس وقت ٹیلیہ کا چہرہ خصوصی طور پر وہ افراد کے لیے مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک کی نگاہوں میں خوشنوار دیجی جبکہ دوسرے کی نگاہوں میں ہوس اہل رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے تمام پردے ہٹے ہوئے ہیں۔

محفل عروج پر پہنچی، رشاقہ نے مستی سے جھومتے ہوئے ٹیلیہ کو کھینچا، شراب کے نشے میں مخمور ٹیلیہ ہانپتے ہوئے کھڑکی ہوئی اور خوب صورت سازوں پر تھرکنے لگی۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ وہ میدان جنگ میں جس خوب صورتی اور مہارت سے ہراتی بل کھاتی تھی اس انداز میں وہ رقص کرنے سے عاجز تھی۔ وہ بس پیٹنے، بدلنے کے انداز میں اچھل کود کر رہی تھی۔ تماشاخیوں نے اس کے نام کے نعرے لگاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ اس سے متاثر تھے، ڈرت تھے، عقیدت رکھتے تھے اور اسے انوکھا خیال کرتے تھے۔ اس کا یوں بے تکلفی سے رقص کرنا انھیں از حد محفوظ کر رہا تھا۔

ہوس جرنی آنکھوں کی حسرت کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے یوں کاٹ رہا تھا جیسے اس کے اپنے ہونٹوں کے بجائے ٹیلیہ کے شہابی لب ہوں اور وہ ضحاک بن چکی تھی۔

بادیہ ہریسہ کی گود میں سر چھپائے لیٹی تھی۔ وتینہ، سلمیٰ اور ان کی ماں نانکھ بھی وہیں موجود تھیں۔ یشر کے بعد وہ برائے خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی۔ جبکہ اس کی موجودگی میں وہ خود کو نڈر و بے خوف محسوس کیا کرتی تھی۔ ابتداء میں وہ یشر کو اپنے بھائیوں کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ اور اس وقت تینوں بھائی بنو ہما سہ میں موجود تھے لیکن ان کی موجودگی سے اسے تحفظ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

یشر کی موت کا سن کر وتینہ بہت روتی تھی۔ سہمی سے لپٹ کر اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔ ”بھائی جرنی قسمت ہی میں نہیں ہے۔“

شریم جگرے میں داخل ہواں ”دفع ہو گئے ہیں۔“ ہونٹوں کے سواروں کی واپسی کا بتاتے ہوئے اس

سے لڑی دن۔

تمام نے اسمینان بھراساس لیا تھا۔ تینہ پوچھنے لگی۔ ”ابو جان، ان کی آمد کا مقصد کیا تھا۔“
 ”اپنی طاقت کا اظہار کرنے آئے تھے۔ یہ باور کرانے آئے تھے کہ انھیں بنو جساسہ کے خلاف ہر قسم کی من مانی کی کھلی چھوٹ ہے۔“ شریہ دلو کے اظہار سے خود کو نہیں روک سکا تھا۔
 ”مسی دوتینہ کی ماں نانکہ بولی۔“ ہمیں یہاں سے کوچ کر کے کسی اور قبیلے میں ضم ہونا پڑے گا۔ بنو دیل، بنو جمل یا بنو تخم اس کے لیے بہترین چناؤ ثابت ہو سکتے۔“
 شریہ مخی سے بولا۔ ”تم چاہتی ہو بنو جساسہ کا نام و نشان بھی مٹ جائے۔“
 ”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ نانکہ گھبرائی تھی۔

شریہ طنز پر انداز میں بولا۔ ”بنو جساسہ کی زمین زرخیز ہے، یہاں نہ خشک ہونے والے پانی کے نوس موجود ہیں، ربائش کے لیے منبوط حویلیاں بنی ہیں اور یہ سب چھوڑ کر ہم کسی اور قبیلے میں دخیل بن کر جا بیٹھیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ بنو نولس والے ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔“
 نانکہ نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

”ہم حلیف قبائیل میں اپنے مردوں کی ستادیاں کریں گے، بنو جساسہ کے ان مردوزن کو تلاش کر کے آزاد کرانے کی کوشش کریں گے جنھیں غلام بنا کر بیچا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے ہماری اگلی نسل بنو نولس سے ان تمام زیادتیوں کا بدنہ لے گی۔“

”معافی چاہتی ہوں سردار، آپ کو میری گفتگو سے تکلیف پہنچی۔“ نانکہ نے معذرت کرتے ہوئے عافیت جانی تھی۔

اسی شام شریہ اپنے بیٹے کو کہہ رہا تھا۔ ”دوتینہ جوان ہو گئی ہے مالک! اور میں چاہتا ہوں مسی اور اس کو ایک ساتھ رخصت کیا جائے۔“

مالک بن شیبہ پُرست لہجے میں بولا۔ ”بچا جان! یہ رشتا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں ہے۔“

شریہ اصیدنان بھرے ہجے میں بولا۔ ”پرسوں تمھارا نکاح ہوگا۔ تیاری کے لیے دو دن یقیناً کافی ہوں گے۔“

”جی بچا جان۔“ مالک نے سعادت مندی سے سر ہلادیا تھا۔



یظہر شیخ سے کم ہی ملتا تھا۔ کیوں کہ وہ قلیلہ کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے بادیہ کی یاد

بڑی شدت سے حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کے زخم اب بتدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ خلیہ نے ایک اونٹ دے کر بدلے میں دس بکھرے حاصل کیے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز وہ ایک بکرا ذبح کرتی اور اس کا گوشت اکٹھا بھون کر رکھ لیتی۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو ایک اور بکرا ذبح کر لیتی۔ بکھر کی تواضع میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

اب وہ اپنی پسند کا بھی کھل کر اظہار کرنے لگی تھی۔ مگر بکھر کے لیے اس کی خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ بادیہ کے بدلے اسے قلیلہ بھی قبول نہیں تھی اس کی کیا دال تھتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی نظر میں بادیہ مرچکی تھی اور مرے ہوئے آدمی کی جگہ زیادہ عرصہ تک خالی نہیں رہتی جلد ہی پُر ہو جاتی ہے۔ اور وہ جس معاشرے میں سانس لے رہا تھا وہاں یوں بھی ایک مرد کوئی کئی عورتوں کو اپنے نکاح لے میں رکھ سکتا تھا۔

اسے بنو طرید میں آئے دو ماہ ہونے کو تھے۔ اور اب اس کے زخم کا کھر نڈ بھی اتر چکا تھا۔ وہ ذہنی طور وہاں سے جانے کے بارے سوچنے لگ گیا۔ بادیہ رہی نہیں تھی، بنو جسامہ تباہ ہو چکا تھا اور اب اسے فارس کے علاوہ کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس دن وہ صبح سویرے خیمے سے باہر نکلا۔ ٹیلوں کے درمیان تمام جوان مشق کر رہے تھے۔ وہ ٹھٹھنے سے انداز میں ان کے قریب پہنچا۔ پاگل دل قلیلہ کو دیکھنے کے لیے چل اٹھا تھا۔

قلیلہ، رشاقہ کی تربیت میں مصروف تھی۔ لڑکیاں لکڑی کے ستونوں پر لگے قشاق پر جمنا سہ کی بارش کیے ہوئے تھیں۔ امریل اور مکاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں تھے۔ تین بار ہارنے کے بعد چوتھی دفعہ جیت مکان کے حصے میں آئی تھی۔

بکھر ایک جانب کھڑا ہو کر انھیں اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ مگر وہ زیادہ دیر قلیلہ کی دید سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا کیوں اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی وارنٹی دیکھ کو وہ الٹی کھوپڑی کی لڑکی کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ اس سے رخ موڑ کر شمشیر زنی کرنے والے دو اناڑیوں کو دیکھنے لگا۔ اور پھر اسے معلوم ہی نہ ہوا

۱۔ اسلام سے پہلے عربوں میں رواج تھا کہ ایک مرد جتنی چاہتا عورتوں کو بیاہ کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ اسلام کی آمد کے بعد صرف چار عورتیں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ جب یہ حکم نازل ہوا اس وقت کافی صحابہ کرام ایسے تھے جن کے نکاح میں پورے زیادہ بیویاں تھیں۔ یہاں تک کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے نکاح میں بھی اس وقت چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ ایسے تمام صحابہ کرامؓ نے فوراً ہی چار سے زائد بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔

۲۔ یہ اندازوں کا ہدف۔

۳۔ بقیہ نکتے کے تھے۔

”اس وقت وہ قریب آئی تھی۔

”جوان، تمہیں سب بستر چھوڑ دینا چاہیے۔“

یشمر چونکتے ہوئے متوجہ ہوا۔ دہانہ آنکھیں اس کے چہرے پر ٹڑی تھیں۔ یشمر کی سوپوں میں بادبید کی آنکھیں درانی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر اس نے رشاقہ کی طرف دیکھا جس کے رخ و سفید چہرے پر سینے کے قطرے آگینوں کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ اشتیاق آمیز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اسے خاموش پا کر وہ بولی۔

”مکہ فقیہہ تم سے مخاطب ہے اعلیٰ بن مکیث۔“

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”بستر چھوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“

فقیہہ دوبارہ بولی۔ ”اتنے جیسم جوان کو مرد میدان ہونا چاہیے۔“

”مونہہ۔“ اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ”اگر جنگ جسامت سے نری جاتی تو ابوالخارث کو اونٹ کا

لقمہ بننا پڑتا۔“

فقیہہ کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ”کبھی تلوار بھی پکڑی ہے یا فقط باتیں کرنا سیکھی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی تلوار یشمر کے سامنے بھینکی۔ امریل اور مکان بھی ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

یشمر نے ایک نظر پاؤں میں پڑی تلوار کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہستگی سے جھکتے ہوئے اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا۔ اسی وقت دماغ میں سکندر کی آواز ابھری۔

”یاد رکھنا، ایک اچھا شمشیر زن ہمیشہ تلوار کو دستے سے پکڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تلوار کو کسی بھی جگہ سے نہیں تھما جاتا۔ اور دستے کو پکڑتے وقت ہاتھ کی گرفت مضبوط تو ہونی چاہیے، سخت نہ ہو۔ چاروں انگلیاں یوں لپٹی ہوں۔“ سکندر نے اپنا ہاتھ دستے پر جما کر دکھایا۔ ”اور اگلو اس جگہ پر رکھا ہو۔“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری، ہونٹ بھیچتے ہوئے اس نے مسکراہٹ کو دور کیا اور تلوار کو درمیان سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔

مکان، رشاقہ اور امریل قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔ فقیہہ بھی متبسم ہوئی۔

یشمر نے تلوار امریل کی جانب بڑھا دی۔ کیوں کہ وہ ان چاروں میں سب سے زیادہ امریل سے مانوس تھا۔ امریل روزانہ ایک مرتبہ ان کے خیمے میں ضرور آتا تھا۔ اور اس کی آمد کی غرض و غایت یشمر کو اچھی طرح معلوم تھی۔ گو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن یشمر اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خلیہ سے محبت کرتا تھا۔ یہ بات خلیہ کو بھی معلوم تھی، مگر جان بوجھ کر نظر انداز کیے رکھتی کہ وہ خود یشمر کے پیچھے

پڑی تھی۔

”ملکہ ثقیلہ کا خیال ہے اس ناکارہ لاش کے بجائے غلیبہ پر محنت کی جائے تو کم از کم وہ تلوار بولا۔
پکڑنا تو سیکھ جائے گی۔“

رشتہ اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر ملکہ کی اجازت ہو تو میں اسے تربیت دینا
پسند کروں گی۔“

ثقیلہ طنز یہ لہجے میں بولی۔ ”تم شاید وقت ضائع کرنے کی زیادہ شوقین ہو۔“
رشتہ مصر ہوئی۔ ”مجھے لگتا ہے یہ سیکھ جائے گا۔“ اس کی نظریں مسلسل یشکر پر غڑی تھیں۔
ثقیلہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کیا خیال ہے جوان، تلوار پکڑنا سیکھنا چاہو گے۔“
”خود سیکھنے والی مجھے نیا سکھائے گی۔ میرا مطلب یہ خود اب تک آپ سے تربیت لے رہی ہے۔“
ثقیلہ استہزائی انداز میں ہنسی۔ ”تو کیا ملکہ ثقیلہ کا شاگرد بننا ہے۔“
یشکر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ سحر بھری ذہالہ آنکھوں نے اس کے دل کی دھڑکن
بڑھا دی تھی۔ اپنی غیر ہوتی حامت پر قابو پاتے ہوئے وہ بے پروائی سے بولا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ آپ کے
پاس کوئی ایسا پیٹنرہ ہے جسے سیکھنے کی مجھے ضرورت ہو۔“

ملکان، امریل اور رشتہ نے ایک ساتھ تہقیر لگایا۔ ثقیلہ کے لمبے چہرے پر ہلکی سی سرخی بھٹکی، ذہالہ
آنکھوں میں غصے کی جھلک ابھری، لیکن جب بولی تو لہجے میں تنہی نہیں تھی۔
”جسے تلوار تھامنے کا پتا نہ ہو اس کے ہونٹوں پر ایسی برہکس نہیں سمجھتیں۔“
یشکر اس کی بات کا جواب دیے بغیر بولا۔ ”اگر سردارن کی اجازت ہو تو میں اپنے خیمے میں واپس
جانا چاہوں گا۔“

”ملکہ ثقیلہ کو لوگ ملکہ ثقیلہ کہتے ہیں۔“
”کہتے ہیں یا کہواتی ہو۔“ یشکر کا لہجہ تو نہیں البتہ الفاظ استہزائی تھے۔
ثقیلہ کے لہجے میں غصہ شامل ہونے لگا تھا۔ ”اس سے فرق نہیں پڑتا۔“
یشکر نے کندھے اچکائے۔ ”حالانکہ شیر کی پہچان نام سے نہیں کام سے ہوتی ہے۔“
”ملکہ ثقیلہ فلسفے سننے کی عادی نہیں ہے۔“ ثقیلہ کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔
”اگر ملکہ کی اجازت ہو تو میں واپس خیمے میں جانا چاہوں گا۔“ یشکر نے مزید اصرار مناسب نہیں
سمجھا تھا۔ نہ وہ لڑنا چاہتا تھا اور نہ لڑنے کی حالت میں تھا۔

وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”کوشش کرنا کہ ملکہ ثقیلہ ایک بزدل، کاہل اور ناپسندیدہ شخص کی دیکھ

سے محروم رہے۔ اور یہ درخواست نہیں ہے۔“

بشنہر کے ہونٹ کچھ کہنے کو لرزے مگر پھر وہ خاموشی سے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

”ملکہ قتیلہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک گھنٹیا شخص کو بنو طرید میں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔“ اس کے

جانے کے بعد بھی قتیلہ کا غصہ نہیں اترتا تھا۔

”دفع کریں! ملکہ ہم اپنی مشق کرتے ہیں۔“ رشاقہ نے ہاتھ تھام کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش

کی۔

وہ ”تم لوگ کر رہی“ قتیلہ کی برہمی تم میں ہوئی تھی۔ سردار بننے کے بعد وہ بتدریج اپنے غصے کو قابو

کرنے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ پہلے کسی نے اس انداز میں بات کی ہوئی تو وہ اپنی تلوار کو نہ روک

تیرا۔ مگر اب وہ بنو طرید کی تعداد میں اضافہ چاہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہو کر اُردہ لوگوں کے سر

تارنا شروع کر دیتی تو لوگ وہاں سے غائب ہوتے شردن ہو جاتے۔ اس کا باپ کہا کرتا تھا۔ ”جو اپنے غصے

کو قابو نہیں رکھ سکتا وہ سرداری کا اہل نہیں ہے۔“ اور وہ نااہل سردار بن نہیں پہنچتا چاہتی تھی۔

رشاقہ کے قہقہے پر بیٹھ کر وہ اپنے آدمیوں کو تربیت کرتا دیکھنے لگی۔ رشاقہ نے اس کے عقب میں

بیٹھ کر قبیلہ (وہ غصے پر باندھی پٹی) کھول کر اس کے سبے بننے والوں کو آزاد کر دیا تھا۔

ملکہ قتیلہ کی برہمی میں کبھی بھڑکتا ہوا ہے۔ وہ اس لمحے ہاتھوں کی قبیلہ خیاں بنانے لگی۔

”خونٹ پھاتے ہوئے رہی۔“ ملکہ قتیلہ کو بزدلوں سے نفرت ہے۔“

”اس کی تہ کو لینے کب جاتا ہے؟“ رشاقہ نے اس کی وہ فی رومیرہ کی جانب سوڑی۔

بیٹا اچھی قتیلہ کی کا کواری ایک دم کافور ہو گئی تھی۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ”ملکہ قتیلہ کا خیال

سبے جلد وہاں کرنا منہ سب نہ ہوگا۔“

”پھر؟“ رشاقہ نے دو غفلتوں میں پورا سوال دہرایا تھا۔

”نہر۔“ بابا تو ملکہ قتیلہ کل کا سورج رستے میں طلوع ہوتا دیکھے گی۔“

رات کو کھانے کے بعد اس نے منقر بن اسحاق، اصم بن خسار اور قریب بن فہج کو بلا کر قبیلہ کا

وہاں رہنے کی ہدایات دیں اور امریل اور مکال کو صبح صادق کے وقت تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆☆

”آپ غصے میں لگ رہے ہیں۔“ خلیفہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ برہم ہے۔

وہ بے پرواہی سے بولا۔ ”غصے کی وجہ کم از کم آپ نہیں ہیں۔“

1. چاپ محمدی۔

”میرے لیے خوشی کی بات ہے۔“ گود میں اٹھائے بچے کو بستر پر لٹاتے ہوئے وہ اس کے قریب بولی۔ ”مگر پھر بھی آپ کو براہم نہیں دیکھ سکتی۔“

”یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے خلیہ کو دور جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سناٹا بولی۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دو گے۔“

”خلیہ، مجھے فارس جانا ہے۔ اب یہاں میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔“ وہ جتنی بولی۔ ”مجھے بھی ساتھ سے جاؤ۔“

وہ صاف کوئی سے بولی۔ ”بہت طویل سفر ہے۔ اور میرے دشمنوں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ میں اپنی عزیز ترین سستی کی حفاظت نہ کر سکا تمہیں کیا تحفظ دوں گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ کسی ایسے کا پلو تھا، جو تمہاری قدر کرنا جانتا ہو۔“

وہ یہ بات سے بولی۔ ”مگر مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔“

”جانتا ہوں، مگر تمہارے لیے وہ بہتر رہے گا جسے تم اچھی لگتی ہو۔“

خلیہ نے جھنجھکتے ہوئے پوچھا۔ ”امریل نے آپ سے کچھ کہا ہے۔“

”نہیں، مگر میں جانتا ہوں وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے ہوں نہیں، محبت ہے۔“

وہ مجھے دل سے بولی۔ ”سب جاؤ گے؟“

”بندہ ہنسنا۔“ دو تین دن تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے خلیہ لجاجت سے بولی۔ ”کم از کم پندرہ دن۔“

یختر نے اس کی تھوڑی کونکلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”وعدہ کرو، اس نے بعد نہیں روکو گی۔“

”وعدہ خلافی کرانا چاہتے ہو۔“ خلیہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی ابھری تھی۔

”اُمّی والی تلوار مجھے پکڑاؤ تھوڑی مشق کروں، مسلسل آرام سے جسم خراب ہونے لگا ہے۔“ اسے ہندباتی ہوتا دیکھ کر یختر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اتنی گرمی میں۔“ خلیہ نے حیرانی ظاہر کی۔ ”سورج کافی اوپر آ گیا ہے۔“

”ابو جان فرمایا کرتے تھے موسم کے اثرات کو نہ جھیل سکنے والے جنگجو کی جیت میں سب سے

”ی رکاوت موسم ہی والا ہے۔“

خلیہ نے خیمے کے کونے میں رکھے نڈری کے صندوق سے میان میں ہندباتی والی تلوار نکالی اور

اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ ”ملکہ فقیہہ سے مقابلہ کر لو گے؟“

”جلد ہی یہ محات آنے والے ہیں خود دیکھ لینا۔“ معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے اس نے تنوار پٹری اور خیمے سے باہر آگیا۔ سورج کافی اوپر آگیا تھا۔ مشق کرنے والے آرام کی نیت سے خیموں اور درختوں کی چھاؤں کے نیچے سمٹ گئے تھے۔ وہ اطمینان بھرے انداز میں چلتا ہوا تربیتی میدان سے گزر کر ٹیلوں کے عقب میں پہنچا۔ وہاں وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل تھا۔

دھوپ نے اس کے جسم کے سارے مسام کھول دیے تھے پسینہ دھاروں کی صورت میں اس کے جسم پر بہنے لگا تھا۔ مگر وہ بتقی ریت اور آگ برساتا سورج اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ سکندر نے دوران تربیت اسے موسم کی ٹھنڈوں کا عادی بنانے کا خوب اہتمام کیا تھا۔ اب موسم کی ٹھنڈک و تمازت اس کے لیے ناؤی حیثیت رکھتی تھیں۔

دوران نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ کو نگاہ میں رکھ کر وہ درمیانی رفتار سے دوڑنے لگا۔ کوس بھر کا فاصلہ طے کرنے وہ وہاں پہنچا۔ کافی دنوں سے مشق نہ کرنے کی وجہ سے اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں جا کر وہ خیالی دشمن کے خلاف تنوار کھیلنے لگا۔ ہتھیاروں میں سب سے پسند اسے تنوار تھی۔ اور اس نے ہمیشہ ہر ہتھیار پر تنوار کو ترجیح دی تھی۔ تربیت کے آخری دنوں میں بھی سکندر دوسرے ہتھیاروں کے استعمال میں تو اس کی کوئی نہ کوئی خامی ڈھونڈ لیتا تھا مگر تنوار بازی میں برملا کہتا تھا کہ اس میدان میں بیشتر اس سے بھی بہتر ہے۔

سورج کا جھکاؤ مغرب کی جانب واضح ہو گیا تھا جب تنوار میدان میں ڈال کر اس نے مشق ختم کی۔ اسے شدت کی پیاس لگی تھی، مگر بقول سکندر پیاس برداشت کرنا بھی تربیت کا حصہ تھا۔

وہ درمیانی رفتار سے دوڑتے ہوئے بنو طرید کی طرف بڑھنے لگا۔ قبیلے کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس نے دوڑنا بند کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ اب تک خیموں اور درختوں کی چھاؤں میں آرام کر رہے تھے۔

”وتیہ اور سلمیٰ کے ساتھ میں تمھاری ذمہ داری سے بھی سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد شہیم نے بادیہ کو حجرے میں طلب کر کے بغیر کسی تمہید کے اپنا لفظ واضح کیا۔

وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ ”میں تیار نہیں ہوں چچا جان۔“

شہیم مضر ہوا۔ ”بہتر یہی ہو گا کہ قبیلے کے کسی جوان کا بیوہ تم لو کسی دوسرے قبیلے کے سردار زادے کی تلاش میں اندیشہ ہے کہ بنو فہل والے تمھاری موجودگی سے باخبر ہو جائیں گے۔“

وہ صاف گویا سے بولی۔ ”مجھے نہ کسی اعلا نسب شخص کی تمنا ہے اور نہ ادنیٰ سے رشتا جوڑ کر حالات سے فرار کی خواہش ہے۔ یشکر کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتی۔“

”یشکر کی جگہ تمہارے دل میں ہے۔ ضروری نہیں کہ اپنے شوہر کو تم دل میں بھی جگہ دو، لیکن زندگی گزارنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تو پڑے گی نا؟“

بادیہ نے دلیل دی۔ ”عریہ چچی نے بھی تو ساری زندگی شوہر کے بغیر بتائی ہے۔“

شریم ترکی بہ ترکی بولا۔ ”مگر اب شادی کر لی ہے نا۔“

”مجھے بھی جب ضروری لگے گا آپ کو بتا دوں گی، مگر فی الحال نہیں۔ یشکر نے کہا تھا جو میاں

بیوی، ابور مردا کو مانتے ہیں وہ مرنے کے بعد بہشت میں اکٹھے ہوں گے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے سے تعلق رکھنے کے بعد یشکر مجھے بہشت میں بھی نہ ملے۔“

اسی وقت عریہ ہجرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”سردار اسے تھوڑی مہلت دو، میری بیٹی اتنی

جلدی شادی کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔“ شاید اس نے باہر کھڑے ہو کر ان کی گفتگو سنی تھی۔

بادیہ فوراً ہی اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

”ٹھیک ہے، جو مرضی آئے کرو مگر دنا باند کرو۔“ شریم نے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر

ہاتھ رکھ کر حجرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دھوپ کے تیز ہوتے ہی انھوں نے مناسب جگہ پر گھوڑے روک دیے تھے۔ گھوڑوں سے زمینیں

اتار کر امریل نے ایک درخت کے نیچے باندھے اور تو بڑوں میں جو گیلے کر کے تو بڑے گھوڑوں کے منہ پر

چڑھا دیے۔ مکان نے قٹیہ کے لینے کی جگہ پر چادر بچھائی، زین سر کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گئی تھی۔

گھوڑوں کو سنبھال کے امریل واپس آیا اور درخت کی شاخوں سے کپڑا باندھ کر قٹیہ کے لیے ہوا

کا بندوبست کرنے لگا۔

”امریل میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ قٹیہ نے اسے روکنے کی داجبی سی کوشش کی لیکن اتنا تو اسے

بھی معلوم تھا کہ امریل اس کی یہ بات نہیں سنے گا۔

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”آپ آرام کریں مالکن، مجھے نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔“

مکان معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”اب اس بے چارے کو نیند کہاں آئے گی ملکہ۔“

”کیوں؟“ قٹیہ حیران ہو کر مکان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مکان، بکو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ امریل نے جھپٹتے ہوئے اسے منع کرنا چاہا۔

مکان اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے محبت ہوگئی ہے ملکہ۔“

”کیا۔۔۔“ ثقیلہ حیرانی سے اٹھ بیٹھی۔ ”کون ہے وہ؟“

مکان نے قبضہ لگایا۔ ”ہے ایک سنہرا نہ۔“

ثقیلہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”خلیلہ.....؟“ مکان کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بولی۔ ”مگر وہ تو شادی شدہ ہے۔“

”ہاں ناں۔“ مکان نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”اور اس کا شوہر ملکہ ثقیلہ کو خاطر میں نہیں لاتا امریل کو خاک گھاس ڈالے گا۔“

ثقیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”امریل، یہ سچ کہہ رہا ہے؟“

امریل نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ”آسان ساحل ہے، اعلیٰ بن مکینٹ کی گردن اتار دو، ملکہ ثقیلہ سنہرا نہ کو تمھاری زوجیت میں دے دے گی۔“

”اعلیٰ کی گردن اتارنا مشکل نہیں ہے، مگر اس طرح وہ خفا ہو جائے گی اور میں اس کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا۔“ امریل سنجیدہ تھا۔

”پھر اسے اعلیٰ سے طلاق لینے پر راضی کرو باقی ملکہ ثقیلہ سنبھال لے گی۔“

امریل دھکی ہوتا ہوا بولا۔ ”مجھے نہیں لگتا وہ ایک حبشی غلام کے لیے اعلیٰ جیسے خوب صورت جوان سے طلاق لینے پر راضی ہوگی۔“

ثقیلہ نفرت سے بولی۔ ”ملکہ ثقیلہ ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے کہتی ہے کہ ایک خوب صورت بزدل سے بہادر حبشی ہزار گنا بہتر ہے۔ باقی تم حکماً غلام نہیں آزاد ہو۔“

مکان نے شرارتی انداز میں کہا۔ ”اگر امریل، رشاقہ کی منت کرے تو وہ اعلیٰ کو اپنا اسیر بنا کر اسے سنہرا نہ کو طلاق دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ اعلیٰ کی ذات میں دلچسپی رکھتی ہے۔“

امریل سرعت سے بولا۔ ”اس سفید لومڑی کی منت کرنے سے بہتر ہے میں خودکشی کر لوں۔“

ثقیلہ کی نفرتی ہنسی بلند ہوئی۔ وہ امریل کی حانت سے محفوظ ہو رہی تھی۔ ”ویسے مکان کا مشورہ ملکہ ثقیلہ کے بھی دل کو نگ رہا ہے۔“

مکان، امریل کو چھیڑتا ہوا بولا۔ ”اصل میں اس کا عشق ناقص ہے ملکہ، ورنہ مکان نے طبقہ کو پانے کے لیے اس کے تین شوہروں کی گردنیں کاٹی ہیں۔“

قُتیلہ نے مزاحیہ انداز میں تسبیح کی۔ ”دو کی، تیسرے کا خانمہ ملکہ قُتیلہ کے ہاتھوں ہوا تھا۔“
 مکان جلدی سے بولا۔ ”ایک ہی بات ہے اگر ملکہ قُتیلہ پہل نہ کرتی تو میں اسے مار دیتا۔“
 وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”لگتا ہے اب بھی ملکہ قُتیلہ ہی کو پہل کرنا پڑے گی۔“
 مکان نے نغمہ دیا۔ ”ہاں اس طرح امریل کی سنہرا نہ بھی اس سے خفا نہیں ہوگی۔“
 ”کیا خیال ہے امریل؟“ قُتیلہ نے اس کی رائے جاننا چاہی۔
 امریل دھیرے سے بولا۔ ”ملکہ قُتیلہ بہت اچھی ہے۔“
 قُتیلہ ہنسی۔ ”سنہرا نہ سے بھی۔“

امریل بولا۔ ”وہ محبت ہے، آپ عقیدت ہیں۔“
 وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”یہ نہ ہوکل ملکہ قُتیلہ محبت بن جائے۔“
 امریل معصومانہ لہجے میں بولا۔ ”امریل کی گردن کے لیے بہترین جگہ اس کے شانے ہیں، اور اگر ایک دفعہ یہ یہاں سے ہٹا دی گئی تو دوبارہ جوڑی نہیں جاسکے گی۔“
 مکان اور قُتیلہ نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ قُتیلہ سخاوت سے بولی۔ ”تم ملکہ قُتیلہ کے خصوصی غلام ہو امریل، اور ملکہ قُتیلہ تمہیں سوچنے کا ایک موقع ضرور دے گی۔“
 امریل مزاحیہ انداز میں بولا۔ ”غصے کے وقت عموماً وعدے بھول جایا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ جب گردن دھڑ سے علاحدہ ہو جائے تو انسان بات چیت کے قابل نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں ملکہ قُتیلہ کو پیسے اس کے وعدے یاد دلاؤں گا۔ ناں جی ناں امریل کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔“
 قُتیلہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔ ”یاد کرو امریل، ملکہ قُتیلہ نے تمہاری جسارت کے باوجود تمہیں معاف کر دیا تھا۔“

امریل عقیدت سے بولا۔ ”کیوں کہ ملکہ قُتیلہ بہت اچھی ہے۔“
 ”ملکہ قُتیلہ کو نیند آرہی ہے۔“ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے بحث ختم کرنے کا اعلان کیا۔
 امریل خاموشی سے کپڑا جھٹکنے لگا۔



قُتیلہ، مکان اور امریل کے قبیلے سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ایک اور گھڑ سوار بنو طرید سے باہر نکلا۔ وہ ضحاک بن عتیک تھا۔ قُتیلہ کی ٹوٹی کا رخ شمال مشرق کی جانب تھا جبکہ اس نے شمال کا رخ کیا تھا۔ بنو طرید کی حدود تک وہ گھوڑے کی لگام تھام کر گیا تھا۔ ذرا سا دور آتے ہی وہ سوار ہوا اور گھوڑے کو سرپیٹ دوڑا دیا۔ دھوپ تیز ہونے کے بعد بھی اس کا سفر جاری رہا تھا۔ نصف النہار کے وقت اس نے

ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر دو تین گھنٹیاں آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ رات کو بھی اس نے بہت کم آرام کیا تھا۔ یقیناً وہ جلد از جلد بنو طرید سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

بھاگنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر ایسے وقت کا چناؤ کیا تھا جب قلیلہ قبیلے میں حاضر نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ قلیلہ کی پیشکش نہ ماننے والے بنو عقرب کے دونوں آدمیوں، حامس اور غیاث کے انجام کے بارے اسے منقر بن اسخ اور رشا قہ سے سن گن مل چکی تھی۔

اگلے دو دن بھی سفر میں گزار کر، تیسرے دن کے آغاز کے ساتھ وہ بنو احمر کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بنو احمر کے سردار نجار بن ثابت کے سامنے بیٹھا اپنی آمد کی غرض و غایت پر روشنی ڈال رہا تھا۔ قلیلہ کے چند معززین کے علاوہ سردار کا دست راست قدامہ بن شیبان بھی وہاں موجود تھا۔ قدامہ اس کا پیچھا بھانکتا تھا۔

ضحاک کی بات ختم ہوتے ہی نجار بن ثابت نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”قلیلہ کو تمہارے حوالے کرنے کی شرط پر اس کا پتا معلوم کرنے میں میرا کیا فائدہ ہے جو ان۔ میں بس اسے اپنی لونڈی دیکھنا چاہتا ہوں اور بنو احمر کے سردار کی لونڈی میں کوئی غیر کیسے شریک ہو سکتا ہے۔“

ضحاک امید بھرے لہجے میں بولا۔ ”سردار اپنا بدلہ لینے کے بعد اسے میرے حوالے کر سکتا ہے، تاکہ میں اس کے غرور کو پاؤں تلے روند سکوں۔“

”ناممکن۔“ نجار بن ثابت نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ایسی دوشیزہ نہیں ہے جس سے جلد سیر ہوا جائے۔“

ضحاک نے قلیلہ کے حصول سے مایوس ہو کر اگلا مطالبہ پیش کیا۔ ”پھر بنو احمر کی کسی خوب صورت دوشیزہ سے میری شادی کی جائے۔ اس کے علاوہ دس آدمیوں کے خون بہا کے بہ قدر اونٹ اور بنو احمر کی شہریت عنایت کی جائے۔“

بنو احمر کا ایک معمر معزز بولا۔ ”ایک دوشیزہ اتنی مہنگی نہیں ہو سکتی۔“

ضحاک مکاری سے بولا۔ ”محترم، وہ صرف دوشیزہ نہیں ایک اعلیٰ نسب سردار زادی ہے۔ صورت کے لحاظ سے صحرائے اعظم کی دوشیزاؤں میں سرفہرست ہے بنو طرید کی سردارن ہے اور بنو احمر کے دوسرے داروں کی قاتل ہے۔ اس کا آزاد گھومتے رہنا قبائل عرب میں بنو احمر کی عزت کو ضحاک میں ملا دے گا۔“ عامر بن اسود سے گپ شپ کرتے ہوئے اسے قلیلہ کی ساری کہانی معلوم ہوئی تھی اور اب اسی کو بنیاد بنا کر وہ بنو احمر کے معززین پر دھونس جمارہا تھا۔

سردار کا دست راست قدامہ بن شیمان بولا۔ ”اونٹ نو یا موٹر الذکر دو شرائط پوری کراؤ۔“
 ضحاک حتمی لہجے میں بولا۔ ”اچھا اونٹوں کی تعداد نصف کر دو اور یہ آخری پیشکش ہے۔ اگر منظور نہیں ہے تو سردار زادی ثقیلہ کے طلب گار کافی ہیں میں کسی اور سے رابطہ کر لوں گا۔“
 نجار بن ثابت بے صبری سے بولا۔ ”منظور ہے۔ اب تم جلدی سے اس کے چھپنے کی جگہ کے بارے بتاؤ میں کل تک اسے اپنے بستر پر دبوکھنا چاہتا ہوں۔“
 ضحاک معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”کتنے جنگجو قتل کرانا برداشت کر لو گے؟“
 نجار نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”میں پانچ سو جنگجو میدان میں لاسکتا ہوں۔“
 ضحاک نے کہا۔ ”سردار، میرا سوال کچھ اور تھا۔ میں نے پوچھا ہے ثقیلہ کے حصول کے لیے کتنے جنگجو قتل کر سکتے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ قدامہ بن شیمان نے حیرانی ظاہر کی۔
 ”سردار زادی آج کل ملکہ ثقیلہ کہلاتی ہے، اس کے لشکر میں کم از کم پچاس، ساٹھ سے زیادہ جنگجو ہیں۔ ان کے علاوہ دو تین درجن مراہقی لڑکوں و لڑکیوں کو اس نے تیر اندازی کی تربیت دے رکھی ہے۔ وہ تمام اپنی سردارن کو بچانے کے لیے بے جگری سے مقابلہ کریں گے۔ دو درجن بندوں کو تو سردار زادی اور اس کا ہنسی غلام امریل ہی ذبح کر دیں گے۔ اور یہ بھی دھیان میں رہے اپنے قبیلے میں اس نے پہرے واری کا سمہ انتظام کر رکھا ہے۔ صبح سے شام اور پھر صبح تک دیدہ بان کسی بھی لمحے اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتے۔ میرے اندازے میں آپ ایک تہائی لشکر کو تباہ کر دیا کریں اس پر قہر پائیں گے، بلکہ ایسی حالت وہ زندہ گرفتار ہونے کے بجائے موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔“

”امریل بن خرشہ اس کا غلام ہے۔“ نجار نے ساری تفصیلات سن کر صرف ایک بات پر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔

”وفا دار ترین غلام ہے۔ یوں کہ وہ لیٹی ہوتی ہے اور امریل اس پر کپڑا جھل رہا ہوتا ہے۔“

”امریل جیسے جنگجو سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔“ نجار کے لہجے میں افسوس بھرا تھا۔

ضحاک ثقیلہ کی تعریف میں رطب السمان ہوا اور بولتا چلا گیا۔ ”امریل جیسا جنگجو اس کی شمشیر زنی سے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا۔ یہ نہیں وہ چھلاوہ ہے، چڑیل ہے یا بھتنی ہے۔ تلوار اس کے ہاتھوں میں بن کی طرح بہا رہی ہوتی ہے۔ اس کا جسم بگونے کی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔ اس کا وار بجلی کے

کوندے کی طرح مخالف کی طرف لپکتا ہے۔ جھارے کی طرح ٹھکنے میں نہیں آتی۔ مقابل کا ہر وار وہ اس خوب صورتی سے خطا کرتی ہے کہ ماہر شمشیر زن بھی اناڑی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کا جسم دیکھنے میں روئی کے گولے، مکھن کے پیڑے اور بالائی جیسا ملائم لگتا ہے، مگر حقیقت میں اس کے اعضاء غصاء کی نکڑی کی طرح سخت اور مضبوط ہیں۔ اس کے پُرکشش جسم میں اتنی طاقت چھپی ہے کہ لات مار کر امریل جیسے شہ زور کو یوں زمین بوس کرتی ہے جیسے اناڑی سوار کو اڑیل گھوڑا نیچے گراتا ہے۔ اس کی ڈھال صرف وار روکنے کے کام نہیں آتی وہ اس کو مقابل کے خلاف بہ طور ہتھیار بھی استعمال کرتی ہے۔ وہ سچ میں ملکہ فتنیہ ہے۔“

بنو احمر کے ایک معزز نے منہ بنایا۔ ”تم ہمیں مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو جوان۔“
 ”نہیں۔“ ضحاک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری نظر میں صحرائے اعظم کا بہترین جنگجو میرا استاد زیاد بن تابوت تھا۔ لیکن سردار زادی کی شمشیر زنی دیکھ کر میں اپنے رائے پر قائم نہ رہ سکا۔ یقین کرو اگر آج زیاد بن تابوت زندہ ہوتا تو اس چھوکری کی شاگردی کرنے میں دلچسپی ظاہر کرتا۔“

قدامہ پُر خیال لہجے میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے غراب بن ارسا ڈھیک کہہ رہا تھا کہ فتنیہ نے کئے مار مار کر امریل کو بے ہوش کر دیا تھا۔“

”میرے پاس ایک اور پیشکش ہے۔“ فتنیہ کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان کرنے کے بعد ضحاک نے پہلے سے سوچے منصوبے کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔

”بتاؤ۔“ گہری سوچ میں ڈوبے نجار نے بد دلی سے کہا۔

”ایک ایسی تجویز ہے جس پر عمل کر کے ہم بغیر کوئی نقصان اٹھائے نہ صرف سردار زادی کو قابو میں کر سکتے ہیں بلکہ پورے بنو طرید پر قابض ہو سکتے ہیں۔“

”ہم سننا چاہیں گے۔“ سردار نجار بن ثابت نے دلچسپی ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ چالاکی سے بولا۔ ”میرا ایک مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔“

قدامہ نفی سے بولا۔ ”تم پہلے ہی تین مطالبے پیش کر چکے ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں بنو احمر کے اونٹوں کے مطالبے سے دست بردار ہونے پر تیار ہوں۔ اب میرا مطالبہ یہ ہے کہ بنو طرید پر قبضے کے بعد جتنے اونٹ ہاتھ آئیں گے وہ تمام میرے ہوں گے۔ اس کے علاوہ فتنیہ کی خاص ہم جولی رشاقہ بنت زیاد بن تابوت بھی میری ہوگی۔ اور میں ایک ایسی تجویز بتاؤں گا جس سے آپ بغیر خون خرابہ کیے بنو طرید پر آسانی سے قبضہ کر لیں گے۔“

اسرغ یا سفید رنگ کے اونٹوں کے آسنے سے جو سفری صعوبتیں برداشت کرنے میں بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

نجمار نے حجت پیش کی۔ ”ایک قبیلے کے تمام اونٹوں کا ایک ہی شخص کے قبضے میں جانا اسے سردار قبیلہ سے بھی امیر کر دے گا۔“

ضحاک مکاری سے بولا۔ ”سو سے زیادہ لونڈیاں و غلام، سو کے قریب عمدہ نسل کے گھوڑے، اتنے ہی خیمے، بیش بہا اسلحہ، ہزار کے قریب بھیڑ بکریاں، میسوں گدھے، درجنوں خچر اور صحرائے اعظم کی انوکھی حسینہ سردار زادی ملکہ ثقیلہ بنت جبلہ۔ یہ سب پا کر بھی اگر بنو احمر کا سردار سمجھتا ہے کہ وہ گھائے کا سودا کر رہا ہے تو یقیناً اس کی سوچ عدل کے منافی ہے۔“

”منظور ہے۔“ اس مرتبہ سردار نجمار نے سوچنے میں لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔

ضحاک کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری۔ ”ٹھیک ہے، مجھے سردار کی زبان پر مکمل بھروسہ ہے.....“ لمحہ بھر رک کر وہ کہنے لگا۔ ”ہمیں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو درجن جنگجوؤں کی ضرورت پڑے گی۔ کرنا کچھ یوں ہے کہ.....“ وہ انھیں اپنے منصوبے کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔ تمام دلچسپی سے سننے لگے۔ اس کی بات کے اختتام پر نجمار بن ثابت کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

”قدامہ!.....“ نجمار اپنے دست راست کو مخاطب ہوا۔ ”ضحاک بن عتیک کی اچھی طرح خدمت کرو۔ آج سے یہ بنو احمر کا باسی ہے۔ اور قبیلے کے بہترین شہسوار رباب بن مجمع کی بہن حسیبہ بنت مجمع کے ساتھ آج رات کو اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔“

ضحاک کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ اس نے قبیلہ سے بدلہ لینے کے منصوبے کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔ گو وہ اس کے حصول میں تو ناکام رہا تھا لیکن نجمار بن ثابت کی لونڈی کے روپ میں وہ اس کا جھکا ہوا سر ضرور دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً اس فخریہ کو اس کی حیثیت یاد دلانا ضحاک کا خواب تھا۔ اور یہ خواب جلد ہی پورا ہونے والا تھا۔



”غلام کو ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔“ وہ بنو نسر کی آبادی کے قریب ایک اونچے نیلے پر موجود تھے۔ ثقیلہ کی انھیں وہیں رکنے کی ہدایت پر امریل لجاجت سے بولا تھا۔

”امریل! فیصلوں میں ترمیم کمزور ارادوں کی مظہر ہے۔ اس لیے ملکہ ثقیلہ سوچ کر فیصلہ کرتی ہے، فیصلہ کر کے نہیں سوچتی۔ اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں ساتھ چلنے کا بتا دیا ہوتا۔“

”جی ہاں!.....“ امریل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اپنا گھوڑا وہیں چھوڑ کر وہ بنو نسر کے بے ترتیب لگے ہوئے خیموں کی طرف بڑھ گئی۔ اطمینان

بھرے انداز میں چلتے ہوئے وہ گھڑی بھر میں عریسہ کے خیمے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری اور وہ خیمے کے پردے کو بے دھڑک کھول کر اندر داخل ہوئی۔ خیمے میں چراغ جل رہا تھا لیکن اس کی لونہایت نیچی تھی۔ البتہ وہ اندھیرے میں چل کر آئی تھی وہ ملگجی روشنی بھی اس کے لیے کافی تھی۔

کدڑی کے تخت پر دو جسم دیکھتے ہی وہ چونک گئی تھی۔ یقیناً عریسہ کے ساتھ اس کا باپ جہلہ بیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمدردی پھیل گئی تھی، باپ کی موجودی میں وہ عریسہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی جہلہ کی کرخت آواز ابھری۔ ”مجھے معلوم تھا تم یہاں ضرور آؤ گی۔“ یہ کہتے ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔ درخت کے کٹے ہوئے گول تنے پر رکھے چراغ کی لو کو تیز کر کے وہ طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اسی وقت اس کے پہلو میں لیٹے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اپنی سگی ماں جہلہ کو دیکھتے ہوئے قلیلہ کا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

”ماں جی کدھر ہیں؟“ اس نے سرسراتی آواز میں دریافت کیا۔

”شاید عریسہ نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ ہونسر کا سردار تمہیں عاق کر چکا ہے۔“ جہلہ نے طنزیہ انداز میں جتایا۔

وہ تڑکی بہ تڑکی ہوئی۔ ”ہونسر کا سردار اس کے علاوہ کربھی کیا سکتا ہے۔“

جہلہ غصے سے سرخ ہوتا ہوا یولا۔ ”تم فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ تمہاری گردن اتارنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

وہ ہٹھ بکا کر رہی۔ ”شکر ہے یہ نہیں کہا، ہوا اعر کے سردار کے حوالے کر دوں گا۔“

جہلہ دھاڑا۔ ”کو اس بند مرو۔“

”ہونسر کے سردار کو معلوم ہوتا چاہیے کہ یہ حقیقت ہے اور پورے قبائل جانتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو

کبادے میں بٹھا کر صلح کی بھیج مانگنے والا کتنا کچھ بہادر ہے۔“ وہ قلیلہ تھی اور باپ پر پوری طرح تھی ہوئی تھی۔

”قلیلہ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“ جہلہ نے اسے تخت نیچے میں ڈالنا۔

”ملکہ قلیلہ کو اس کی ماں جی کے بارے حقیقت بتانی جائے۔ اگر کسی کی وجہ سے انہیں خراش بھی

آتی ہو تو ذمہ دار کی گردن ملکہ قلیلہ کی تلوار کا مزہ ضرور چکھے گی۔“

”تمہاری یہ جذبات کہ سردار کے خیمے میں کھڑے ہو کر دھمکیاں دو۔“ غصیلہ نیچے میں کہتے ہوئے

جہلہ نے کدڑی کے تخت کے ساتھ کھڑا حربہ (چھوٹا نیزہ) اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ یہ اس کا خصوصی

میں مشعل تھی ہوئی تھی۔ قُتیلہ کو دیکھتے ہی ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
جندلہ، قُتیلہ کے سر بیان کو پکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے اسے کوس رہی تھی۔ قُتیلہ نے کڑی نظروں سے
باپ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہوگا ملکہ قُتیلہ کو ماں جی کے بارے حقیقت بتا دی جائے۔“
”بھول گیا ہے تمہیں کس نے جنم دیا ہے اور کون تمہاری ماں ہے۔“ جندلہ نے ایک بار پھر اس
کے چہرے کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر تھپڑ مارنے کے بجائے مٹھی بٹھینچ کر پیلو میں گرا لیا تھا۔
وہ بے پردائی سے ٹولی۔ ”ملکہ قُتیلہ کی ماں عریسہ بنت منظر ہے۔“
”وہ یہاں سے دفع ہو گئی ہے۔ جا کر کہیں اور ڈھونڈو سمجھیں۔“ جندلہ نے اسے زور سے
دردازے کی جانب دھکا دیا۔

”کہاں گئی ہیں۔“ عریسہ کی زندگی کے بارے سن کر اس کے دل میں جلنے والا پُر پانی پڑ گیا تھا۔
”اپنی فطرت اپنی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ ہمیں کیا پتا کہاں گئی ہے۔“ جندلہ غصے سے کھول رہی تھی۔
”جس دن ملکہ قُتیلہ کو بوڑھے سردار کی موت کے بارے پتا چلا، ملکہ قُتیلہ اپنا حق لینے ضرور لوٹے
گی۔ بنو نسر کے اس وقت کے سردار کے پاس ملکہ قُتیلہ کی اطاعت یا موت کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں
ہوگا۔“ بدتمیزی سے کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی تھی۔

جبلہ کے ہونٹوں سے دکھ بھرے انداز میں عربی ادب کا ایک مشہور شعر نکلا.....

”میں ہر روز اسے تیر اندازی کا فن سکھایا کرتا تھا

جب اس کی کافی زور پکڑ گئی تو اس نے مجھی کو نشانہ بنادیا“

ایک جوان نے پوچھا۔ ”اگر سردار کا حکم ہوتا تو اسے روکا جائے۔“

جبلہ نے نفی میں سر ہلایا ”باپ پر تنوار سونپنے والی تمہیں قتل کرنے سے بھی نہیں چو کے گی۔ اور مجھے

امید نہیں ہے کہ تم اسے روکنے میں کامیاب ہو پاؤ گے۔“

☆☆☆

قُتیلہ غصے میں کھولتے ہوئے واپس پہنچی تھی۔ امریل اور مالکان سخت مضطرب دکھائی دے رہے
تھے۔ چند آدمیوں کا مشعلیں تھام کر حرکت کرنا اور زور زور سے بولنے کی آوازیں سن کر انھیں کسی گڑبڑ کا

! بدچمن ہے جیو

ع۔ مالک بن نعم اللہ جبرہ و انار کے عربوں کا پہلا بادشاہ تصور کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بیٹے سلیمہ نے رات کی
تاریکی میں فطرت سے اسے تیر کا نشانہ بنادیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا قاتل اپنا ہی بیٹا ہے تو اس نے چند اشعار کہے جن
میں سے یہ شعر بہت مشہور ہے۔ عربوں میں خون کے رشتوں کی بے وفائی پر یہ شعر ضرب الشئ کی طرح مشہور تھا۔

احساس ہو گیا تھا۔ امریل تو فوراً ادھر کا رخ کرنا چاہ رہا تھا، مکان نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر قبیلہ پکڑی جا چکی تھی تو بعد میں اسے رہا کرنا زیادہ آسان ثابت ہو سکتا تھا۔ ورنہ اسی وقت وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ خود بھی پھنس سکتے تھے۔ کیوں کہ بات چند آدمیوں کی نہیں پورے قبیلے کی تھی۔ سب سے بڑھ کر قبیلہ نے انھیں وہاں آنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ قبیلہ کو واپس آتا دیکھ کر انھیں اطمینان ہوا تھا۔

ان سے بات چیت کیے بغیر وہ گھوڑے پر سوار ہوئی، ایک نظر تاروں بھرے آسمان پر ڈال کر اس نے سمت کا تعین کیا اور گھوڑا دوڑا دیا۔

امریل اور مکان خاموشی سے اس کے پیچھے بڑھ گئے تھے۔ بنوسر سے کوس بھر کے فاصلے پر آتے ہوئے اس کی غم و غصے سے لبریز آواز ابھری۔ ”اگر جبلہ بن کنانہ، ملکہ قبیلہ کا باپ نہ ہوتا تو آج بنوسر کے پاس اپنے سردار کی موت کا سوگ منا رہے ہوتے۔“

مکان کی آواز ابھری۔ ”ملکہ قبیلہ نے باپ پر وار نہ کر کے عقل مندی اور حوصلے کا ثبوت دیا ہے۔“

امریل نے پوچھا۔ ”کیا انھوں نے مالکن کی ماں کو ساتھ آنے سے روک دیا؟“

”اگر ملکہ قبیلہ کی ماں جی موجود ہوتیں تو انھیں دنیا کی کوئی طاقت ملکہ قبیلہ کے ساتھ آنے سے نہ

روک سکتی۔“

مکان نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ”پھر وہ کیوں نہیں آئیں؟“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”جہاں تک ملکہ قبیلہ کا اندازہ ہے انھیں قبیلے سے بے دخل کیا

گیا ہے۔ اور ایسا کرنے والا ملکہ قبیلہ کا باپ ہے۔ بہ ہر حال وہ زندہ ہیں۔ اور ملکہ قبیلہ جلد ہی انھیں ڈھونڈ

لے گی۔“ اس نے غصے پر قابو پا لیا تھا۔ اور اب اس کا دماغ عربیہ کو ڈھونڈنے کے بارے کوئی منصوبہ سوچ

رہا تھا۔

چاند حالتِ ہلال میں تھا اور اول شب میں غروب ہو گیا تھا۔ وہ رات کا تیسرا پہر تھا اس لیے ہر

بانپ گھپ اندھیرا چھایا تھا۔ وہ ستاروں کی مدد سے بنو طرید کی سمت کا تعین کیے تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑا

رہی تھی۔ مکان اور امریل کے گھوڑے اس کے دائیں بائیں تھے۔



واپس پہنچتے ہی قبیلہ کو صحاک کے بھاگ جانے کی بابت معلوم ہوا تھا۔ یہ سن کر اسے تھوڑی بہت

یشانی ضرور ہوئی، کیوں کہ صحاک کے بھاگ جانے کی غرض و غایت اسے معلوم نہیں تھی۔ حفاظتی تدبیر

طور پر اس نے رات اور دن کو پہرہ دینے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ اور سونے والوں کو بھی

نشتی سے تاکید نہ تھی کہ کسی بھی وقت حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنے ہتھیار وغیرہ بستر کے قریب ہی رکھا کریں۔ ایک بار تو اس کے جی میں یہ بھی آیا تھا کہ وہ اس جگہ سے، بنو طرید کو کہیں اور منتقل کر دے، مگر پھر بنو طرید کے عمرہ محل و دتوغ کو چھوڑ کر جانا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔ ضحاک اکیلا بنو طرید کا کچھ نہیں بنا رہا تھا۔ البتہ ایک خدشہ اس کے دماغ میں بنوا حمر کے بارے ضرور چھپا تھا۔ اگر ضحاک وہاں پہنچ جاتا تو بنو طرید کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ اسے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ ضحاک کو بنوا حمر اور قلیلہ کی دشمنی کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ عامر بن اسود نے ایک شب شراب کے نشے میں دھت ہو کر ملکہ قلیلہ کی ساری کہانی ضحاک کے سامنے بیان کر دی تھی۔ گو عامر بن اسود کا مقصد ضحاک کے سامنے قلیلہ کی بہادری کا اظہار تھا لیکن ضحاک نے اس کہانی سے اپنا مطلب نکالنے کا سوچا تھا۔

چار پانچ دن وہ اسی پریشانی میں رہی۔ اور پھر ایک دن وہ منقر بن اسحاق اور رشاقہ سے ضحاک کے فرار کے بارے گفتگو کر رہی تھی مگر وہ دونوں اس کے عزائم کی وضاحت نہیں کر پائے تھے۔ رشاقہ بولی۔ ”میرا خیال ہے وہ ایک عورت کی برتری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔“ منقر نے لقمہ دیا۔ ”میرے سامنے وہ بھی ملکہ قلیلہ سے شکست کھانے کی ذلت کے متعلق کافی دفعہ کہو اس کر چکا تھا۔“

قلیلہ نے پوچھا۔ ”کچھ اندازہ ہے کہاں گیا ہوگا؟“ رشاقہ نے خیال ظاہر کیا۔ ”اس کی منزل بابل یا حیرہ ہو سکتا ہے۔“ منقر نے کہا۔ ”اسے اصفہان دیکھنے کا شوق تھا۔“ دونوں کے متضاد خیالات سن کر قلیلہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”تم دونوں، بنو عقریب کے باقی افراد، ست سن گن لو ہو سکتا ہے کسی کو اس کے ارادے کے بارے معلوم ہو۔ خاص کر اس کی بیوی کو کریدو، ملکہ قلیلہ نہیں چاہتی کہ خطرے کی تلوار بنو طرید کے سر پر ہمیشہ لٹتی رہے۔“ منقر یا رشاقہ کے کچھ کہنے سے پہلے خیمے سے باہر اجازت مانگنے کی آواز ابھری۔ ”جاؤ۔“ قلیلہ نے سائل کو اندر بلا یا۔

ایک پہرے دار اندر داخل ہوا۔ ”ملکہ قلیلہ، تین جوان لڑکیاں اور ایک مرد یہاں پہنچے ہیں۔ ان کے پاس چار اونٹنیاں اور ضرورت کا سامان موجود ہے۔ وہ حاضر موت جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور آج کی شب بنو طرید میں گزارنے کے متمنی ہیں۔“ وہ دلچسپی سے بولی۔ ”انھیں ملکہ قلیلہ کے پاس لے آؤ۔“

پہرے دار سر جھکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد ایک مضبوط جسم کا جوان تین ٹڑکیوں کے ہمراہ خیمے میں داخل ہوا۔ ان میں سے دو ٹڑکیاں قبول صورت جبکہ تیسری اچھی خاصی خوب صورت تھی۔ ”ملکہ قتیلہ کی دو پہر سلامتی والی ہو۔“ نو جوان نے موڈ بانہ لہجے میں کہا۔ یقیناً پہرے دار نے قتیلہ کے نام اور مزاج کے بارے اس کی تھوڑی بہت رہنمائی کر دی تھی۔

قتیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہو جوان؟“

”خوب صورت ملکہ، میرا نام قرص بن خطامہ ہے ہمارا تعلق بنونا جیہ سے ہے۔ دو چاند پہلے پہلے بنو عبد القیس میں اونٹوں کی دوڑ ہوئی جس میں میری عشاء نامی اونٹنی اول آئی، بنونا جیہ کے سردار نے وہ پھندہ آگئی اور اس نے عشاء کو خریدنے کی خواہش کی مگر مجھے عشاء سے بہت زیادہ محبت ہے اس لیے انکار کر دیا۔ اس کے بعد سردار خیل بہانوں سے مجھے تنگ کرنے لگا۔ چند روز پہلے اس کی ایما پر اس کے ایک مصاحب نے رات کے وقت اپنی تلوار میرے صحن میں گاڑ کر مجھ پر چوری کا الزام تھوپ دیا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ آخر شب کو میری منجھلی بیوی فطری نقضا پوری کرنے آئی اور اس نے چاند کی مدہم روشنی میں ایک سائے کو صحن کے پتوں نیچ بیٹھے دیکھ لیا۔ پہلے اسے لگا وہ میں ہوں۔ مگر جب وہ دیوار کی طرف بڑھا اور دیوار پھلانگ کے دوسری جانب کود گیا، تب اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ میرے حجرے میں پہنچی اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ پس ہم نے صحن میں مذکورہ جگہ کھود کر دیکھا تو وہاں ایک تلوار زمین میں گڑی پڑی تھی۔ میں نے تلوار وہاں سے نکال کر ایک اور جگہ چھپا دی۔ میرے اندازے کے مطابق اگلے دن ہی مجھ پر چوری کا الزام تھوپا گیا۔ لیکن دیوتاؤں کے کرم سے وہ ثابت نہ کر سکے۔ میں الزام سے تو بری ہو گیا مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ سردار، عشاء کے حصول کے لیے کسی حد تک بھی گر سکتا ہے۔ تبھی میں نے اپنی نینوں بیویوں سے مشورہ کر کے بنونا جیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے میرے چچا کو بھی حالیہ سردار کے باپ نے قبیلے سے عاق کیا تھا۔ وہ بنونا جیہ چھوڑ کر درواز کا سفر کر کے حضر موت میں جا بسا۔ اور اب میں انھی کے پاس جا رہا ہوں۔“ قرص بن خطامہ نے تفصیل سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

قتیلہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حضر موت جانا ضروری ہے، تم کسی اور قبیلے میں بھی پناہ لے سکتے ہو۔“

قرص بن خطامہ لہجے میں بولا۔ ”ایسا ممکن ہے ملکہ، مگر حضر موت میں میرے سگے چچا کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ امید ہے وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا۔ یوں بھی ایک اچھے جنگجو کے لیے قبائل اپنا

دامن وسیع رکھتے ہیں۔“

”تو تم بہترین لڑاکے ہو۔“ ذنبالہ آنکھوں میں دلچسپی کی چمک لہرائی۔

قرص انکساری سے بولا۔ ”لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔“

”ملکہ ثقیلہ سے مقابلہ کرنا پسند کرو گے۔“ اس کے ہونٹوں پر شرارتی ہنسی ابھری۔

قرص نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ملکہ کا ادب کیا جاتا ہے اس سے مقابلہ نہیں کیا

جاتا۔“

”اگر پسند کرو تو ملکہ ثقیلہ تمہیں بنو طرید میں خوش آمدید کہہ سکتی ہے۔ ہمیں اچھے جنگجوؤں کی

ضرورت ہے اور یہاں کسی کو ذخیل بھی نہیں سمجھا جاتا۔“

”کیا...؟“ قرص کے لہجے میں خوشگوار حیرانی تھی۔ ”کیا ملکہ ثقیلہ ایک اجنبی کو بغیر کسی مطلب

کے بنو طرید میں رہنے کی اجازت دے دے گی۔“

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ملکہ ثقیلہ بات دہرانا پسند نہیں کرتی۔“

”اگر کوئی مجھ سے عضباء چھیننے کی کوشش نہ کرے تو میں بنو طرید میں رہنا اعزاز سمجھوں گا۔“ قرص

نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ”ملکہ ثقیلہ کے ہوتے ہوئے بنو طرید میں نا انصافی کا گز نہیں ہو سکتا۔“

قرص نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں ملکہ ثقیلہ کا ممنون و احسان مند ہوں۔“

ثقیلہ، منقر بن اسحق کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”قرص بن خطامہ کی خیمہ لگانے میں مدد کرو، آج سے یہ

بنو طرید کا معزز باسی ہے۔“



اگلے دن قرص نے تربیت میں حصہ لیا تھا۔ وہ امریل اور مکان سے ہار تو گیا تھا لیکن اس نے

مقابلہ بھر پور انداز میں کیا تھا۔

اسی دوپہر اور پھر رات کو اس کی بیویاں بھی ثقیلہ کے خیمے میں آئی تھیں۔ تینوں نہایت ہنس کھ،

باتوئی اور خدمت گزار تھیں۔ پہلے ہی دن وہ ثقیلہ کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ رشاقت کے ساتھ

بھی انھوں نے اچھا تعلق بنا لیا تھا۔ ثقیلہ کو محسوس ہوا قرص بن خطامہ اور اس کی بیویاں بنو طرید میں اچھا

اضافہ تھا۔

دو تین دن بعد وہ عربیہ کی تلاش میں نکلنے کے بارے منقر، رشاقت اور مکان سے مشورہ کر رہی تھی۔

”دو روز بعد چاند کامل ہو جائے گا۔“ منقر نے اس کی توجہ چاند کی چودھویں کو منعقد ہونے والے

جشن کی طرف مبذول کرائی۔

وہ متبسم ہوئی۔ ”کیا جشن میں ملکہ قُتیلہ کی شمولیت لازمی ہے۔“

منقر نے کہا۔ ”قبیلہ کی سردارن کی غیر موجودگی میں جشن کی خوشیاں ادھوری رہ جاتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ملکہ قُتیلہ جشن کے بعد ماں جی تلاش میں نکلے گی، مکان اور امریل اس کے ہمراہ

جائیں گے۔“

رشاقہ لجاجت سے بولی۔ ”ملکہ قُتیلہ کی سہیلی بھی ساتھ جانے کی خواہش مند ہے۔“

”ملکہ قُتیلہ کی غیر موجودگی میں تمھارا یہاں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ منقر بن اسحق اور قریب بن فلیح

اسیلے معاملات کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ ملکہ قُتیلہ، مکان کو یہاں چھوڑ جاتی، مگر اس کی سفر میں زیادہ

ضرورت ہے۔“

”میں کانے ریچھ سے اچھی شمشیر زن ہوں۔“ رشاقہ شاکی ہوئی۔

قُتیلہ نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ تو تمھیں بھی معلوم ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ مکان اور منقر بھی ہنس

دینے لگے۔

رشاقہ کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ ابھری۔ ”ملکہ قُتیلہ، اصل تلواروں سے مقابلہ کرا کر جانچ

سکتی ہیں۔“

”امریل نے زندگی میں صرف ملکہ قُتیلہ سے شکست کھائی ہے۔ ورنہ ملکہ قُتیلہ کو یقین ہے وہ

صحرائے اعظم کا بہترین لڑاکا ہے۔“

رشاقہ نے منہ بسورا۔ ”ملکہ قُتیلہ نے میری تعریف تو کبھی نہیں کی۔“

قُتیلہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”تم خوب صورت ہو، دلیر ہو، مخلص ہو، جذباتی ہو اور ایک بزدل

شخص کو پسند کرتی ہو۔“

رشاقہ نے بھرپور انداز میں احتجاج کیا۔ ”میں بالکل بھی اعلیٰ بن مکیت کو پسند نہیں کرتی۔“

”اعلیٰ بن مکیت کا نام تو ملکہ قُتیلہ نے نہیں لیا پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا ملکہ قُتیلہ کا اشارہ اس کی

جانب ہے۔“

”وہ..... آپ..... اس کو بزدل سمجھتی ہیں ناں اس لیے کہا ہے۔“ رشاقہ گڑبڑا گئی تھی۔

”وہ روزانہ، دوپہر کو قبیلے کے مضافات میں موجود نخلہ میں جا کر شمشیر زنی کی مشق کرتا ہے اور

دوپہر ڈھلے لوٹ آتا ہے۔“ منقر نے انکشاف کیا۔

”کیا.....؟“ قُتیلہ کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ ”تلوار پکڑنا جانتا نہیں اور شمشیر زنی کی مشق

کرتا ہے۔“

”اسے باقاعدگی سے دوپہر کے وقت، اس طرف جانا دیکھ کر میں مشکوک ہوا اور ایک دو دن اس کے تعاقب میں بندے بھیجے۔ تب پتا چلا کہ وہ وہاں مشق کر رہا ہے۔“ منقر نے اپنی فرض شناسی سے پردہ اٹھایا۔

رشاقہ بولی۔ ”اسے چاہیے کہ ہمارے ساتھ مشق کیا کرے۔ میں اس کی بہترین تربیت کر سکتی ہوں۔“

مکان نے خیال غلط کر لیا۔ ”شاہید شرمسار رہا ہے۔“
 ”نہیں،“ قتیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ملکہ قتیلہ نے اسے حکم دیا تھا کہ اپنا منحوس چہرہ ملکہ قتیلہ کو نہیں دکھائے گا۔ اور اتنا تو وہ جانتا ہے کہ ملکہ قتیلہ کی حکم عدولی پر اسے کیا سزا مل سکتی ہے۔“
 رشاقہ ہاتھی، ولی۔ ”اب وہ شرمندہ ہے اور اس نے تلوار بھی تھام لی ہے تو ملکہ قتیلہ کو اسے معاف کر دینے کے بارے سوچنا چاہیے۔“

قتیلہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”جب تمہیں وہ پسند ہی نہیں تو سفارشیں کیسی۔“
 ”نہیں،“ قتیلہ نے سر ہلایا۔ ”میرا مطلب تھا آخر وہ بنو طرید کا باسی ہے۔“ رشاقہ گڑبگڑا گئی تھی۔
 ”قتیلہ بے پروائی سے بولی۔ ”جس روز وہ خود آکر اپنی بدتمیزی کی معافی مانگے گا، ملکہ قتیلہ اسے معافی دینے کا سوچے گی۔“

منقر نے رشاقہ کے سر پر شفقت بھری چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ نہ ہو تم اسے یہ بات پتہ لگانے چلی جاؤ۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے۔“ رشاقہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہوا تبسم دیکھ کر قتیلہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ضرور اعلیٰ کے پاس جائے گی۔ مگر قتیلہ نے اسے باور کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆☆☆

وہ جو بھی مشق سے واپس لوٹا، خلیہ نے نبیز سے بھرا کٹورا اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ مزے سے نبیز پینے لگا۔ اچانک کسی نسوانی آواز نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔
 خلیہ کے ”آ جاؤ۔“ کہنے پر رشاقہ اندر داخل ہوئی۔ قتیلہ کی جھپٹ کی کو دیکھ کر بیشتر حیران رہ گیا تھا۔
 ”آؤ رشاقہ، بیٹھو۔“ خلیہ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ خلیہ سے گلے مل کر رشاقہ پٹائی پر بیٹھ گئی تھی۔

یشکر نبیز کا کٹورا خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔ اسے باہر جانے پر آمادہ دیکھ کر رشاقہ جلدی سے بولی۔
 ”اُمّی! بن مکیت میں تمہیں ملنے آئی تھی۔“

یشکر کی آنکھوں میں حیرانی نمودار ہوئی۔ ایک نظر رشاقہ کے سرخ و سفید چہرے پر ڈال کر وہ بے اعتنائی سے بولا۔ ”جی۔“

رشاقہ نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بیٹھ کر بات کرنے سے کسی نے منع کیا ہوا ہے۔“
 ”اپنے خیمے میں بیٹھنے کے لیے مجھے کم از کم تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ یشکر نے لہجے میں ہلکی سی تلخی موجود تھی۔

”میں لڑائی کرنے نہیں آئی۔“ رشاقہ نے اسے نادم کرنا چاہا۔

یشکر بے زاری سے بولا۔ ”محترمہ مطلب کی بات کر دو۔“

بحث ترک کرتے ہوئے وہ مطلب کی بات پر آئی۔ ”تم روزانہ دوپہر کو شمشیر زنی کی مشق کرنے بنو طرید سے باہر نکل جاتے ہو، حالانکہ ہم صبح کے وقت باقاعدگی سے مشق کرتے ہیں تم ہمارے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے۔“

یشکر اطمینان سے بولا۔ ”کیوں کہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”اُمّی! میں جانتی ہوں تمہیں ملکہ ثقیلہ نے اپنے سامنے آنے سے منع کیا ہوا ہے، لیکن وہ حکم انھوں نے غصے کے زیر اثر دیا تھا۔ اگر تم ایک بار ان کے پاس جا کر معذرت کر لو تو وہ بہت وسیع ظرف ہیں۔ اور بنو طرید کے جوانوں سے محبت کرتی ہیں، یقیناً تمہیں معاف کرنے میں بخل نہیں کریں گی۔“

یشکر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”اور یہ غلط فہمی تمہیں کیوں کر ہوئی کہ میں شرمندگی یا ثقیلہ کے کسی حکم کی وجہ سے تم لوگوں کے ساتھ مشق نہیں کرتا؟“

”اکیلی میں نہیں، کبھی یہ بات جانتے ہیں۔ کہ اس دن ملکہ ثقیلہ سے بدتمیزی سے بات کرنے کی وجہ سے تم شرمندہ ہو۔ اس لیے آج جا کر ملکہ ثقیلہ سے معذرت کرو اور کل سے ہمارے ساتھ مشق کیا کرنا۔ میں تمہیں تربیت دلانے کی۔“

یشکر بے ساختہ اٹھ پڑنے والی ہنسی نہیں روک سکا تھا۔ ”جب خود سیکھ جانا، تب مجھے بھی سکھا دینا۔“
 ”یقین کرو میں تمہیں بہت اچھے سے سکھا سکتی ہوں۔ تمہاری جسامت ایسی موزوں ہے کہ تم ایک بہترین لڑاکے بن سکتے ہو۔“ رشاقہ نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی وقت خلیہ نے مہمان نوازی کے تھامے پورے کرتے ہوئے نبیز کا بھرا ہوا آب خورہ رشاقہ کو پکڑا دیا تھا۔ اس نے دونوں کی گفتگو میں

دھن انداز ہونے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔

”محترمہ ایک بات بہت اچھے سے جان لو کہ میں نہ تمہاری ملکہ سے ڈرتا ہوں اور نہ اپنے کسی فعل پر شرمندہ ہوں۔“

”وہ تمہاری بھی ملکہ ہے۔“ اس کے انداز پر رشاقہ کو غصہ آ گیا تھا۔

ایک لحظہ سوچ کر یشرکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جب تک میں بنو طرید میں ہوں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کر سکتا۔“

یشکر کا اعتراف سن کر رشاقہ دوبارہ نرم پڑ گئی تھی۔ ”دیکھو اُمی، وہ بہت اچھی ہیں، بہت زیادہ تھی، وسیع ظرف اور اپنے قبیلے سے محبت کرنے والی۔ ان کی عمر کو نہ دیکھو، ان پر دیوتاؤں کا خصوصی کرم ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”تو میں کیا کروں۔“

”کہا تو ہے معافی مانگ لو، تا کہ تمہیں ہمارے ساتھ مشق کرنے کی اجازت مل جائے۔ میں جلد از جلد تمہیں اچھے لڑاکے کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ رشاقہ نے ہاتھ میں تھا ما خالی آب خورہ واپس خلیہ کو پکڑا دیا تھا۔

”اگر تمہاری بات ختم ہو گئی ہو تو تم جاسکتی ہو۔“ یشرکر خود جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔

رشاقہ کے چہرے کی سرخی بڑھی۔ وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ کس کے ساتھ بات کر رہے ہو۔“

یشکر استہزائی لہجے میں بولا۔ ”تمہیں تعارف کرانے کے لیے اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیوں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کون ہو۔ البتہ تم یقیناً نہیں جانتیں کہ کس سے مخاطب ہو۔“

وہ پھر کر بولی۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں تم کون ہو۔“

یشکر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر جانتی ہو کہ کون ہوں، تو میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

خلیہ نے زور سے گلا کھنکار کر گویا یشرکر کو خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔

رشاقہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہاری بہتری کا سوچا تھا لیکن تم اس لائق نہیں ہو۔ ملکہ فہیلہ

تمہارے بارے ٹھیک کہتی ہیں، ایک بزدل شخص کی سوچ اتنی ہی محدود ہو سکتی ہے۔“

اس کی بات کا جواب دے بغیر یشرکر نے نیچے پڑ سر رکھ کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تھی۔

رشاقہ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رشاقہ کے باہر نکلتے ہی خلیہ نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”دو تین دنوں بعد میں نے یوں بھی چلے جانا ہے۔“

”اپنے فیصلے پر قائم ہو۔“ خلیہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا

تھا۔

”تم نے نئے چاند کے طلوع کے ساتھ پندرہ دن رکنے کا کہا تھا۔ اس لحاظ سے دو دن بچا یا ہیں۔“

خلیہ حسرت سے بولی۔ ”کتنے جلدی گزر گئے ہیں یہ دن۔“

یشکر نے پوچھا۔ ”ایک بات مانو گی۔“

وہ جتنا نے والے انداز میں بولی۔ ”ہمیشہ اپنی ہی سنو اتے آرہے ہو۔“

یشکر نے اس کی طعنائی قرط کو پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ ”امریل تمہارا بہت زیادہ خیال رکھے گا۔ وہ ایسا شخص ہے جو تمہاری اچھی طرح حفاظت کر سکتا ہے، قبیلے کی سردارن کا بھی منظور نظر ہے یقین کرو بہت فائدے میں رہو گی۔“

”صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد مجھے کسی سہارے کی ضرورت تو پڑے گی۔“

”تم بہت سمجھ دار ہو۔“ یشکر نے اس کے سنہرے بالوں سے بندھا مٹاف لے کھول کر اس کے گھنے بال بکھیر دیے تھے۔



”آپ ٹھیک کہتی تھیں ملکہ، وہ ایک بد تہذیب، بزدل اور احمق شخص ہے۔“ اگلے دن قبیلہ کے گھنے بالوں میں لنگھی پھیرتے ہوئے رشاقہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”کون؟“ قبیلہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی۔

رشاقہ ندامت سے بولی۔ ”اعلیٰ بن مکیث کی بات کر رہی ہوں۔“

قبیلہ نے خیال ظاہر کیا۔ ”شاید تم اس کے پاس گئی تھیں۔“

”ہاں۔“ رشاقہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

قبیلہ متبسم ہوئی۔ ”جبکہ تم نے منقر بن اسٹخ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس نہیں جاؤ گی۔“

”غلطی ہو گئی۔“ رشاقہ نے اعتراف کرنے میں سستی نہیں کی تھی۔

قبیلہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”کیا باتیں ہوئیں؟“

لے کپڑے کی دھگی جو عورت سر کے بال باندھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

”میں نے ملکہ فُتیلہ سے معذرت کرنے کا کہا تاکہ اس کے بعد میں اسے تربیت دے سکوں۔ اور وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔“

”کیا کہہ رہا تھا۔“ فُتیلہ کی دلچسپی بَشکر کے الفاظ سننے میں تھی۔

رشاقہ تفصیل سے ساری بات دہرانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی..... ”مجھے لگتا ہے جلد ہی یہ بنو طرید سے چلا جائے گا۔“

فُتیلہ خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ ”اگر ملکہ فُتیلہ اس کے سر کو جسم کا حصہ نہ رہنے دے۔ تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

رشاقہ جلدی سے بولی۔ ”وہ اس قابل نہیں ہے کہ ملکہ فُتیلہ کی تلوار اس کے خون سے گندی ہو۔“

فُتیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”بے چاری رشاقہ.....“

”آپ میری بات کو غلط رخ دے رہی ہیں۔“ رشاقہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔ ”میرے

کہنے کا مطلب تھا اس کے لیے آپ کی سہیلی یا کسی ادنا شخص کی تلوار کافی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فُتیلہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”جس دن وہ ملکہ فُتیلہ کے سامنے آیا، تمہیں

اس کا سر قلم کرنے کی اجازت ہوگی۔ ملکہ دیکھے گی کہ رشاقہ بہت زیادہ بن ثابت کی تلوار کی کاٹ کیسی ہے۔“

”شام کو کون سا لباس پہنیں گی؟“ رشاقہ نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔

فُتیلہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ملکہ فُتیلہ کو فُزحیٰ عبا، جُبے وغیرہ سے کوفت ہوتی ہے۔ بس درع ہی

قبا اور فروج پہند ہیں۔“

رشاقہ چاہت سے بولی۔ ”مگر سرخ رنگ کی عبا پہن کر ملکہ فُتیلہ کا حسن مزید نکھر آتا ہے۔“

”ملکہ فُتیلہ کو سب سے سنورنے کا شوق نہیں ہے رشاقہ۔ عورتیں مردوں کو لبھانے کے لیے سجتی سنورتی

ہیں، ملکہ فُتیلہ کس کے لیے سگھار کرے۔“

اس نے بھول پن سے پوچھا۔ ”تو کیا ملکہ فُتیلہ کبھی شادی نہیں کرے گی؟“

فُتیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”کیا تمہیں کوئی ایسا مرد نظر آتا ہے جسے ملکہ فُتیلہ اپنا آپ سوئپ سکے۔“

رشاقہ شرارت سے ہنسی۔ ”اگر اعلیٰ بن مکیت کا لے رچھ کی طرح ماہر شمشیر زن ہوتا تو میرا جواب

اثبات میں ہوتا۔“

1. ایسا چنہ جو سامنے سے کھلا ہو۔

2. فقیہ۔

3. چپکے والا لباس جو پیچھے سے چاک ہوتا تھا اور جنگ یا سفر وغیرہ میں پہنا جاتا تھا۔

قتیلہ نے پیچھے مڑ کر رشاقہ کے کان سے پکڑ کر پیار سے کھینچا۔ ”تم بکواس بند کرو اور جاؤ، ملکہ قتیلہ تھوڑی دیر سونا چاہتی ہے۔ رات کو جشن کے ہنگامے میں دیر تک جاگنا پڑے گا۔“

”آپ نے میرے جواب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔“ رشاقہ شریر انداز میں کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ اس نے منہ بناتے ہوئے تکیے پر سر ٹیکا۔ ”اگر اعلیٰ بن مکیت دنیا کا آخری مرد بھی ہوتا تو ملکہ قتیلہ کو قبول نہیں تھا۔“

رشاقہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔



بنو طرید کے باسیوں نے سرِ شام ہی آگ کے الاؤ بھڑکا دیے تھے۔ بھنے ہوئے سالم اونٹ، بکرے اور بے وغیرہ تیار ہو چکے تھے۔ گوشت بھننے کی اشتہا آمیز خوشبو ہر طرف پھیلی تھی۔ تمام کو قتیلہ کی آمد کا انتظار تھا۔

قتیلہ کے بیٹھنے کے لیے دو مردوں نے تخت اس کے خیمے سے نکال کر چبوترے پر رکھا۔ دو تین محووں بعد وہ رشاقہ کو ساتھ لیے برآمد ہوئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رشاقہ کی ضد پر سرخ رنگ کا لبادہ اوڑھنا پڑا تھا۔ البتہ اس کے نیچے اس نے اپنا روزمرہ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

چبوترے پر چڑھتے ہی وہ کچھ کہنے کے لیے لب ہلانے ہی لگی تھی کہ اس کی نظر سامنے کھڑے بیشکر پر پڑی۔ اس کے دماغ میں دوپہر کو رشاقہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو تازہ ہوئی اور اس کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔

”اعلیٰ بن مکیت جب تمہیں ملکہ قتیلہ نے حکم دیا ہوا ہے کہ اپنا منحوس چہرہ نہیں دکھاؤ گے تو تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ بے نیازی سے بولا۔ ”آسان حل ہے، میری طرف دیکھتے ہوئے اگر آپ آنکھیں بند کر لیں گی تو یقیناً میں نظر نہیں آؤں گا۔“

اس کے دماغ میں جیسے دھماکا سا ہوا تھا۔ وہ حلق کے بل چلائی۔ ”حق انسان شاید تمہیں زندگی پیاری نہیں ہے۔“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”میری زندگی آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں ویسے بھی ایک دودن کا مہمان ہوں۔ آپ اپنا غصہ بنو طرید کے باسیوں کے لیے بچا کر رکھیں۔“

”تمہاری یہ جرات کہ مالکین سے بدتمیزی کرو.....“ امریل تلوار بے نیام کر کے غصے میں دھاڑتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ قتیلہ نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا، مگر امریل نے اُن سنا کر دیا تھا۔ اس کی تلوار بجلی کے کوندے کی طرح بیشکر کی جانب لپکی، ہدف بیشکر کی گردن تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے یشر کے بالائی بدن عقبی جانب جھکا، امریل کی تلوار دو تین انگل کے فاصلے سے اس کے چہرے کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یشر کی دہنی ٹانگ پوری قوت سے امریل کے ہاتھ پر لگی، تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔

امریل منہ سے جھاگ اڑاتا خالی ہاتھ اس کی جانب بڑھا، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ سکندر کے خصوصی شاگرد سے پڑگا لے بیٹھا تھا۔ سکندر نے ہتھیاروں کے استعمال کے ساتھ اسے کشتی اور خالی ہاتھ لڑنے کے داؤ پیچ میں بھی طاق کر دیا تھا۔ امریل کو بگولے کی طرح اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ ایک دم زانو حالت میں نیچے جھکا اگلے ہی لمحے امریل اس کے سر سے ہوتا ہوا پیچھے جا گرا تھا۔ امریل جیسے قوی الجشہ مرد کو یوں آسانی سے دونوں ہاتھوں پر اٹھانا یقیناً بہت زیادہ قوت کا متقاضی تھا۔ اور یشر میں اتنی طاقت موجود تھی۔

اسے پھینکتے ہی یشر نے لپک کر تلوار اٹھائی، اس دوران امریل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت کر پاتا، یشر نے تلوار کی نوک اس کی گردن سے لگا دی تھی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ امریل زور سے دھاڑا۔

”حالاں کہ میں نے خلیہ کو تمہارے لیے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“ یشر نے نہایت مدہم آواز میں کہا تھا۔

امریل کے غیض و غضب سے بگڑے چہرے پر حیرانی ابھری۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔“ یشر کی مدہم آواز صرف امریل ہی سن پار ہا تھا، ثقیلہ کے پلے پتھ نہیں پڑا تھا۔ ”کل میں چلا جاؤں گا اور اسے تمہارا ساتھ قبول ہے۔ تم اپنی سنہرا نہ کے ساتھ رہنا چاہو گے یا مجھ سے کہہ ان کو انا پسند کرو گے۔“

گہرے سانس لیتے ہوئے امریل نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو۔“ اس نے امید بھرے لہجے میں تصدیق چاہی۔

”ہاں۔۔۔ کیوں کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ لیکن یاد رہے یہ تلوار واپس نہیں ملے گی۔“ یشر اس کی مدہم تلوار پر قبضہ جمانے کا موقع ہاتھ سے نہیں کھوسکتا تھا۔

”آخر تم سچ کہہ رہے ہو تو امریل کی جان بھی لے سکتے ہو یہ تو گھٹیا سی تلوار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے امریل پیچھے ہٹ گیا تھا۔

یشر نے تلوار کی نوک حیران کھڑی ثقیلہ کی جانب تانی۔۔۔۔۔ ”سردار زادی ثقیلہ بنت جبلہ، میں صبح چلا جاؤں گا، اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو تم پوری کر سکتی ہو۔“

(باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ)

نا قابل فراموشی

بابا کے جھگڑات

پیدہ لوں بچے کوہ قاف کی مخلوق کی نظروں میں آ گئے ہیں۔ ان کی شادی جس کسی کے ساتھ بھی ہوگی، وہ جنوں کے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ یا تو ان کی آپس میں شادی کر دیا پھر انہیں ساری زندگی کنوارہ رکھنا۔

☆ راجہ مظہر علی



بہ

اُن دنوں کی کہانی ہے جب لوگوں کو قدرتی کھاد کی کاشت کردہ گندم اور ملاوٹ سے پاک گھی اور دودھ مل جاتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی صحت اچھی تھی اور ان کے جذبات بھی ہر قسم کی ملاوٹ اور آلائش سے پاک تھے۔ پاکستان کی عمر دس سال ہو چکی تھی لیکن لوگ ابھی میٹھی پاک اور مغربی کچھر سے نا آشنا تھے۔ اسی وجہ سے ان کے اندر غیرت اور بے غرضی کے جذبات پائے جاتے تھے۔

میں جو کہانی آپ کو سن رہا ہوں، یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھی۔ ہوا یوں کہ میرے ماموں نے مجھے یہ کہانی سنائی اور میرے والد صاحب نے اس کی تصدیق کی تھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک سچی کہانی ہے جو اس کہانی کے کرداروں کے لئے ناقابل فراموش ہے۔ اس کہانی کے کرداروں نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں یہ کہانی لکھ سکتا ہوں اور ان کا اصلی نام بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں اُن کے اصلی نام استعمال کروں لیکن آپ کے پرچے کی پالیسی کی وجہ سے میں اُن کے نام تبدیل کر رہا ہوں۔

وہ گرمیوں کے آغاز کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ احمد خان نامی ایک کسان کچھری سے اپنی تاریخ بھگت کر آ رہا تھا۔ اُس نے راستے میں سستانے اور کھانا کھانے کے لئے برگد کے ایک درخت کے نیچے گھوڑی روکی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک عورت بھی جو غالباً سفر میں تھی، اسی درخت کی چھاؤں میں سستا رہی تھی۔ اپنے لباس اور شکل و صورت سے وہ اچھے معزز خاندان کی عورت لگتی تھی۔ اُس کی عمر بھی چالیس کے لگ بھگ تھی۔ احمد خان اس چیز پر حیران ہو رہا تھا کہ یہ عورت اس دوپہر میں تنہا تھی۔ رواج کے مطابق اُس کے پاس کوئی سواری اور اُس کے ہمراہ کوئی نوکر وغیرہ ہونا چاہئے تھا۔

احمد خان نے اُس عورت سے خیر خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی کسی کھاتے پیتے گھرانے کی عورت تھی اور اس کا گاؤں احمد خان کے گاؤں سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس عورت کا نام زینب تھا اور اس کا سر گاؤں کا نمبر دار تھا جسے احمد خان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ احمد خان نے اُسے کھانا پیش کیا تو اُس نے دیہات کے رواج کے مطابق انکار کر دیا۔ احمد خان دیکھ رہا تھا کہ عورت خاصی تنگی ہوئی تھی اور اُس کا سفر ابھی باقی تھی۔

”بہن تکلف نہ کرو۔“ احمد خان نے کہا۔ ”کھانا میرے پاس بہت ہے۔“

اُس عورت نے کہا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے۔ احمد خان اٹھا اور نزدیک کے ایک گاؤں میں پانی لینے چلا گیا۔ اتفاق سے اُس گاؤں میں اُس کی واقفیت تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس عورت نے زینب سے اصرار کیا کہ وہ اُس کے گھر چل کر آرام سے بیٹھ کر کھانا کھائے اور پھر بعد میں جب جی چاہے چلی جائے۔ پہلے تو زینب نے انکار کیا لیکن اُس عورت کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ عورت احمد خان کے ایک جاننے والے کی بیوی تھی۔

”بھائی احمد خان نے بتایا کہ میری بہن بھی ساتھ ہے تو میرا خاوند اُس سے بہت ناراض ہوا۔“ اس عورت نے زینب کو بتایا۔ ”احمد خان کی بہن ہماری اپنی بہن ہے اور ہمارے گھر کے ہوتے ہوئے وہ درخت کے نیچے نہیں بیٹھ سکتی۔“

زینب احمد خان کے رویے سے بہت متاثر ہوئی۔ احمد خان نے یہ بات کہہ کر اُس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ زمانہ آج کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ اُس زمانے میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو بہن کہہ دیتا تو دل

”میں اپنے سسرال والے گاؤں نہیں جاؤں گی۔“ زینب نے بتایا۔ ”بلکہ اپنے بھائی کے گھر جاؤں گی۔ میرا میکا تھوڑا سا پہلے آتا ہے۔ کل شام میرا بھتیجا مجھے ملنے آیا تھا اور میں بھائی کے گھر چلی گئی۔ میرے اپنے گھر والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں بھائی کے گھر میں ہوں۔ کل صبح بھتیجے کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔“

”اتنی چوری چھپے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا آپڑی تھی؟“ احمد خان رہ نہ سکا اور پوچھ بیٹھا۔

”تم نے مجھے بہن کہا ہے اس لئے تم سے نہیں چھپاؤں گی۔“ زینب نے کہا۔ ”خدا نے مجھے ایک ہی اولاد دی ہے اور وہ بھی بیٹی کی ذات ہے جس کی وجہ سے مجھ پر اس نازک ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا ہے۔ اب لڑکی جوان ہو گئی ہے اور اس کے لئے رشتے آرہے ہیں۔“

”تمہاری برادری میں اتنے اچھے رشتے ہیں۔“ احمد خان نے کہا۔ ”کئی ایک کو تو میں بھی جانتا ہوں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔“ زینب نے کہا۔ ”میں نے غلطی یہ کی کہ بیٹی کو آٹھ جماعتیں پڑھا بیٹھی ہوں۔ اس کی شادی کسی اُن پڑھ سے کر دی تو وہ ساری زندگی اپنے خاوند اور سسرال والوں سے سکول کے طعنے کھاتی رہے گی۔ سوچتی ہوں ایسا لڑکا ہو جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو لیکن میرا سسر نہیں مانتا۔ اس کے ایک بھتیجے کا بیٹا باپ کی ساری جائیداد کا وارث ہے۔ اُس کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور وہ میری بیٹی سے کم از کم پندرہ سال بڑا ہے۔ اس کی بھی کوئی بات نہیں لیکن وہ بالکل اُن پڑھ اور جنگلی ہے۔ پہلی بیوی پر بہت ظلم کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے چاری اس کے ظلم اور زیادتیوں کی وجہ سے مری ہے۔ اب میرا سسر ضد کرتا ہے کہ لڑکی کا رشتہ اسی دے گا۔“

”تمہارے خاوند کا کیا خیال ہے؟“

”اُسے بہن سمجھتا تھا اور بالکل سگی بہنوں کی طرح اُس کا خیال رکھتا تھا۔ زینب نے اس عورت کو یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ وہ احمد خان کی سگی بہن نہیں بلکہ ان کی ملاقات تھوڑی دیر پہلے ہوئی ہے۔“

دھوپ کی پیش دراسی کم ہوئی تو وہ احمد خان وہاں سے نکلے۔ احمد خان نے اُسے گھوڑی پر بٹھالیا اور اُسے پوچھا کہ وہ اتنی سخت گرمی میں اکیلی کہاں سے آ رہی ہے۔

”کیا بتاؤں بھائی! زینب نے کہا۔“ تقدیر کے چکر نے پاؤں میں چکر ڈال دیا ہے۔“

”تمہارا سسر اتنا بڑا نمبر دار اور زمیندار ہے۔“ احمد خان نے کہا۔ ”تمہارے گھر میں نوکر بھی ہیں اور گھوڑی بھی ہوگی۔ سواری کے لئے گھوڑی لے آتیں اور ساتھ نوکر بھی ہوتا تو وقت پر گھر پہنچ جاتیں۔ میں نے تمہیں بہن کہا ہے اس لئے مجھے اچھا نہیں لگا کہ تم اکیلی سفر کرو اور وہ بھی اتنی دوپہر میں۔“

”بات ایسی ہے جو میں اپنے سسر یا خاوند کو نہیں بتا سکتی تھی۔“ زینب نے کہا اور کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔“ احمد خان نے کہا۔ ”مجھے بتانے والی بات نہیں تو نہ بتاؤ لیکن آئندہ اس طرح گھر سے باہر نہ نکلتا۔“

یہ بات نہیں کہ اکیلے سفر کرتے ہوئے اس عورت کی آبرو کو کوئی خطرہ لاحق تھا یا چوروں ڈاکوؤں کا کوئی مسئلہ تھا۔ اُس زمانے میں لوگوں کی اخلاقی حالت اتنی خراب بھی نہیں ہوئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اچھے خاندان کے لئے اُس کی کسی عورت کا تنہا باہر نکلنا اُس کے لئے بڑی بے عزتی کی بات تھی اور اب یہ عورت اگر نکلی تھی تو یقیناً گھر والوں کو بتائے بغیر آئی ہوگی۔

”تم اپنے خاوند اور سسر کو کیا بتاؤ گی کہ کہاں سے آ رہی ہو؟“

بزرگ کی مدد سے اپنے سر کے دل میں رحم ڈالنا چاہتی تھی۔

”اشج میرا دوسرا چکر تھا“۔ زینب نے احمد خان کو بتایا۔ ”اُس بزرگ نے بتایا ہے کہ میری بیٹی کی شادی اُس کی پسند کے لڑکے کے ساتھ ہی ہوگی۔“

احمد خان کو زینب کی بات سن کر چچکا سا محسوس ہوا۔

”زینب!“ احمد خان نے اُس سے کہا۔ ”تم نے مجھے بھائی کہا ہے، اس لئے جو بات میرے دل میں ہے وہ میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ تم بیٹی کا رشتہ صرف اس لئے اُس لڑکے کو دینا چاہتی ہو کہ اُسے تمہاری بیٹی پسند کرتی ہے۔ میرے خیال میں یہ بے غیرتی ہے۔“

”بھائی!“ زینب نے کہا۔ ”اپنی بیٹی کو دوزخ میں دھکا دینے سے بہتر تو یہ ہے کہ میں یہ بے غیرتی کر گزروں۔ اگر اُس کے دادا نے اُس کی شادی اپنے اُس جنگلی رشتہ دار سے کر دی تو میں بیٹی کو زہر دے دوں گی اور خود بھی زہر کھا لوں گی۔“

احمد خان بھی اُسی دیہاتی معاشرے کا فرد تھا۔ اُس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس بات کو پسند کرے کہ لڑکی کی مرضی کا رشتہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اُس زمانے میں تو اگر باپ بھائی یا دادا کو معلوم ہو جاتا کہ اُن کی لڑکی اپنے منگیت کو پسند کرتی ہے تو اچھے خاصے رشتے کو نامنظور کر دیتے تھے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ انہوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب شادی شدہ لڑکیوں کی طرف سے بھی خاوند کی پسندیدگی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ایسی باتیں کرتے کرتے ان کا راستہ کٹ گیا اور اتنی دیر میں زینب کے بھائی کا گاؤں آ گیا۔ احمد خان نے زینب کو گاؤں سے باہر اتارا۔ اُس نے احمد خان

”اُس بے چارے کا کہا خیل ہوگا۔“ زینب نے کہہ کر لڑکھائی۔ ”بڑا تو مناس ہی اپنے باپ سے پوچھ کر لیتا ہے۔“

”میں نے کیا دفعہ بات کی تھی کہ زینب نے یہاں زینب کی سر نے مجھے ذات کر چپ کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ عورتوں کو ایسے معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ لڑکے کے باپ کی چھوڑی ہوئی زمین جاکند پر لڑکی پیش کرے گی۔ میرے سر کو یہ معلوم نہیں کہ عورتوں کو ان معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں لیکن میری بیٹی بول پڑی ہے۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اس آدمی سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔“

احمد خان زینب کا مسئلہ سمجھتا تھا۔ ایک ایسی عورت جس نے صرف ایک بیٹی پیدا کی ہو، اُس کی سسرال میں اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے معاملے میں بات کر سکتی۔ اگر اُس کے دو چار بیٹے ہوتے تو کم از کم اُس کا خاوند اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکتا۔

”میری نظر میں ایک لڑکا ہے۔“ زینب نے بتایا۔ ”وہ میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری بیٹی بھی اُسے پسند کرتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا نہیں۔ ہماری ذات ایک ہی ہے لیکن ہمارا خاندان دوسرا ہے۔ وہ لڑکا مجھ سے مل چکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے ماں باپ کو میرے گھر بھیجے گا لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ اُس کے ماں باپ ہمارے گھر سے بے عزتی کرائے جائیں گے۔“

”اب تم کہاں سے آرہی ہو؟“

اس نے بتایا کہ دو تین میل کے فاصلے پر ایک قبضے میں ایک روحانی بزرگ بنگال سے آیا ہے جو کچھ مل سکتا ہے تو پھر دلی بھی نرم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس

کہا۔ ”میں اپنے پیرومرشد سے بات کرتا ہوں۔ میں بابا جی کا خاص بالکا ہوں اور وہ مجھ پر کرم کی نظر رکھتے ہیں۔ تمہارا سر بھی اُن کا ہی مرید ہے۔ اُن سے عرض کروں گا کہ وہ اُس کو بلا کر سمجھائیں۔“

زینب نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگائے۔

”بابا جی کے نام پر تو میری جان بھی صدمے۔“ اُس نے عقیدت سے کہا۔ ”اُن سے عرض کرنا کہ میرے حق میں دعا کریں کہ میری یہ مشکل حل ہو جائے۔“

احمد خان نے اپنے جس بابا جی کا ذکر کیا تھا، وہ کوئی ایسے ولی کامل تو نہیں تھے لیکن یک بزرگ تھے اور خلقِ خدا کے کام آتے تھے۔ احمد خان واقعی اُن کا خاص بالکا تھا۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ کسی دن جا کر اُن کی خدمت میں زینب کا مسئلہ پیش کرے گا۔

وہ گندم کی کٹائی کے دن تھے۔ اُن دنوں میں تو کسانوں کو کسی چیز کے لئے بھی فرصت نہیں ہوتی اس لئے احمد خان نے زینب کا مسئلہ تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو اُسے پتہ چلا کہ بابا جی داتا صاحب کے عرس پر لاہور چلے گئے ہیں۔ جہاں وہ کچھ دن اپنے مریدوں کے پاس ٹھہریں گے۔ احمد خان کے بابا جی سے تعلقات ایسے تھے کہ وہ اُن کے پیچھے لاہور بھی جاسکتا تھا لیکن اُس نے سوچا کہ وہ عرس سے واپس آ لیں تو اطمینان سے اُن کے ساتھ بات کرے گا۔

وہ کسانوں کے لئے بڑی مصروفیت کے دن تھے۔ کٹائی ختم ہو چکی تھی اور فصل کھلیانوں میں پہنچ گئی تھی۔ یہ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ کسانوں کو رات بھر کھلیانوں میں اپنی فصل پر پہرہ دینا پڑتا تھا کیونکہ لوگ دشمنی میں کسی کو تباہ کرنے کے لئے کھلیانوں میں پڑی

سے بہت کہا کہ وہ اُس کے بھائی کے گھر چلے لیکن احمد خان نے انکار کر دیا۔

”زینب! رخصت کے وقت احمد خان نے اُس سے کہا۔ ”میری تمہاری خون کی رشتہ داری کوئی نہیں لیکن میں نے تمہیں دل سے اپنی بہن کہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک اپنی بہن سمجھوں گا۔ میری جیب بھی اور جہاں بھی ضرورت پڑی ایک وفد آواز دے لیتا، ان شاء اللہ تمہارے پاس پہنچوں گا۔۔۔ ایک بات میں پھر جوں گا۔۔۔ آئندہ اس طرح گھر سے اکیلے نہ نکلتا اور اپنی بیٹی کی پسند کی شادی کا خیال دل سے نکال دو۔“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری بیٹی نے وہ لڑکا قابو کیا ہے؟“ زینب نے کہا۔ ”اور میں اُسے پھنسانے کے لئے جاؤ کر رہی ہوں؟ یہ بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ لڑکا میرے دل کو اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ساری برادری میں صرف وہی میری بیٹی کے قابل ہے۔ میں نے اپنی بیٹی سے بات کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ اس کے دل کو بھی اچھا لگتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے ورنہ میری بیٹی بڑی شرم اور پردے والی لڑکی ہے۔۔۔“

”بھائی جی!“ زینب نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ ”تم نے مجھے کہا ہے کہ میں ضرورت کے وقت آواز دوں۔ بہنیں بھائیوں کو ہی پکارتی ہیں لیکن اس وقت میری ضرورت ایسی ہے کہ میں کسی کو بھی مدد کے لئے نہیں کہہ سکتی۔“

”تم کہو تو میں تمہارے سر سے بات کروں۔“ احمد خان نے کہا حالانکہ اُسے یقین تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

”یہ غلطی نہ کرنا۔“ زینب نے کہا۔ ”اس معاملے میں وہ کسی کی بھی بات نہیں سنے گا۔“

”پھر میں ایک اور کام کروں گا۔“ احمد خان نے

احمد خان اس بات کے لئے اپنے آپ کو معاف نہ کر سکا کہ اُس کی سستی اور کوتاہی کی وجہ سے زینب کا کام نہ ہو سکا۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ اپنے بابا جی کے گاؤں چلا گیا اور اُن سے ساری حقیقت حال بیان کی۔ انہوں نے اس بات پر تو اس کی پیٹھ تھپکی کہ وہ نیک ارادے سے اپنی منہ بولی بہن کے کام آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ احمد خان کی نیک نیتی زینب کے کام ضرور آئے گی۔ انہوں نے احمد خان سے وعدہ کر لیا کہ وہ نصرت کے لئے دعا کریں گے اور اگر ہو سکا تو اس کے لئے کوئی عملی قدم بھی اٹھائیں گے۔

اُس رات احمد خان واپس آ کر کھلیان میں لیٹ تو گیا لیکن اُس کا دل بہت پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب جب کہ نصرت کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے، اباب جی ان کی مدد کے لئے کیا عملی اقدام کریں گے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو بچی نیند سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی دشمن اُس کے کھلیان میں گھس آیا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور کلباڑی چارپائی کے نیچے سے نکال لی۔ تھوڑی دور اسے دوسائے نظر آئے جو پرے جا رہے تھے۔ اُس نے ان کو لکارا اور کلباڑی لہراتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔ اُس کی لکار سن کر وہ دونوں جو کوئی بھی تھے رک گئے۔

”کون ہو تم؟“ اُس نے پوچھا، پھر ہلکی سی چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکا کھڑے تھے۔

”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ احمد خان نے پوچھا۔
لڑکے سے پہلے لڑکی بول پڑی اور اُس نے اپنے باپ کا نام اور دادا کا نام اور گاؤں کا نام بھی بتایا۔

فصل کو آگ لگا دیتے تھے۔ یوں سمجھیں کہ کھلیانوں میں گندم کی فصل نہیں بلکہ کسان کی پورے سال کی کمائی ہوتی تھی۔ اُن دنوں کھلیانوں میں سوئے ہوئے کسانوں کی قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ لوگ اسی موقع پر اپنی ہتھی پوری کرتے تھے۔

ان دنوں میں جب احمد خان کو یہ اطلاع ملی کہ نصرت کی بیٹی نصرت کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور اُس کی شادی اُسی رشتہ دار سے ہو رہی ہے جس کی پہلی بیوی مر چکی ہے تو احمد خان کو حیرت بھی ہوئی اور فحس بھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ان دنوں میں شادی کی تیاریاں کرنے یا شادی میں شریک ہونے کا وقت کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ زینب کے سسرال کو بیٹی کی شادی کے لئے ابھی تھوڑا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

اُسے فحس اس بات پر ہوا کہ زینب بے چاری کی کوئی پیش نہ گئی اور بالآخر اُس کی بیٹی اُس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے آدمی کی بیوی بن رہی ہے جسے نہ بیٹی پسند کرتی ہے اور نہ ہی وہ زینب کو اچھا لگتا ہے۔ زینب نے احمد خان کو بتایا تھا کہ یہ شخص خود زینب کا ہم عمر تھا۔

احمد خان کورہ رہ کر جس چیز پر فحس ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس منہ بولی بہن کے کسی کام نہ آ سکا۔ بابا جی شہر سے واپس تو آ گئے تھے لیکن نصرت کے دادا نے ایسے گھر سے رخصت کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔ احمد خان کو بھی کبھی خیال آتا کہ وہ کسی طرح نصرت کے ہونے والے خاندان کو مل کر ادے یا پھر کچھ عرصہ کے لئے غائب کر دے تاکہ زینب اور نصرت کے کیچے میں ٹھنڈک پڑے لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ آخر مرد اور عورت کی جوڑی تو آسمانوں پر ہی بن جاتی ہے اور اس سلسلے میں انسان کچھ کرنا چاہے تو بھی بے بس ہوتا ہے۔

لقمہ ایک لقمہ پیٹ تک پہنچانے کا قدرت نے کتنا انتظام کیا ہے کہ گرم ہے تو ہاتھ بتا دیتے ہیں۔ سخت ہے تو دانت بتا دیتے ہیں۔ کڑوا یا عرش ہے تو زبان بتا دیتی ہے۔ ہاسی ہے تو ناک بتا دیتی ہے۔ بس حرام ہے یا حلال یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔

کا علم روحانی طور پر پہلے سے ہو گیا تھا۔ بہر حال انہوں نے احمد خان کو بڑی دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اُسے سمجھاتے رہے کہ اُس نے نیکی کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس پر اُسے کس طرح آگے بڑھنا ہے۔ احمد خان شام کو گھر واپس آیا۔ رات کو ریاض بھی تھوڑی دیر کے لئے آیا اور پھر واپس چلا گیا۔

اگلے روز نصرت کے دادا اور باپ کو پیر صاحب کی طلبی کا پیغام ملا۔ وہ تو گزشتہ روز سے نصرت کی گمشدگی کی وجہ سے سخت پریشان تھے لیکن انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُسے کہاں تلاش کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں کسی پر شک بھی نہیں تھا۔ نصرت کا دادا رہ کر نصرت پر الزام لگاتا تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو کہیں غائب کیا ہے۔ اب انہیں پیر صاحب کا پیغام ملا تو وہ اور پریشان ہوئے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ انہیں کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔

وہ بابا جی کے آستانے پر پہنچے تو وہ سخت جلالی کے عالم میں تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں نصرت کے باپ اور دادا کو گالیاں دیں۔

”تم جیسے بے دین مریدوں کا پیر ہونا میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں۔“ بابا جی نے کہا۔ ”تم نے کیا بے احتیاطی کی ہے؟“

”ہمیں تو کچھ خبر نہیں حضور!“ دادا نے کہا۔ ”ہم تو خود پریشان ہیں، ہماری ایک جوان لڑکی۔۔۔“

”ہمیں بتانے کی کوشش نہ کرو۔“ پیر صاحب نے

”نہیب کی بیٹی نصرت ہو؟“ احمد خان نے پوچھا۔ ”تم ماما احمد خان تو نہیں ہو؟“ نصرت بولی۔ ”میری ماں نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔“

احمد خان کو معلوم ہوا کہ نصرت اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ فرار ہو رہی تھی جس کا نام ریاض تھا۔ اس فرار میں نہیب کی مرضی اور مدد شامل تھی۔ احمد خان نے اُن دونوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ریاض نصرت کو ساتھ لے کر شہر میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا تھا جہاں دونوں نے شادی کر لی تھی۔

”تم دونوں بے وقوف کے بچے ہو۔“ احمد خان نے انہیں کہا۔ ”اور تمہاری ماں کو بھی عقل نہیں۔ کیا صبح تمہارے گھر والے تم دونوں کو غائب دیکھیں گے تو انہیں پتہ نہیں چل جائے گا کہ نصرت کو کون ساتھ لے گیا ہے؟“ احمد خان پھر نصرت سے مخاطب ہوا۔ ”تم اپنے دادا کو نہیں جانتیں؟ وہ تو اس لڑکے کے گھر والوں کے لئے مصیبت کھڑی کر دے گا۔ شہر جانے کا خیال چھوڑو۔“

”پھر ہم کہاں جائیں؟“ لڑکے نے پوچھا۔

”نصرت کو میرے پاس چھوڑو اور اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔“ احمد خان نے کہا۔ ”میں اسے اپنے گھر میں چھپا لوں گا۔ تم کل رات کو میرے پاس آنا، پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“

ریاض نے سوالیہ نظروں سے نصرت کی جانب دیکھا۔ نصرت نے اُسے تسلی دے کر گاؤں واپس بھیج دیا اور خود احمد خان کے ساتھ اُس کے گھر آ گئی۔ احمد خان نے اپنی بیوی کو اٹھایا اور اُسے ساری بات سمجھائی۔ اُس عورت نے نصرت کو اپنے گھر رکھ لیا۔

اگلے روز احمد خان صبح ہی صبح اپنے بابا جی کے ذریعے پر حاضر ہوا اور انہیں ساری رپورٹ پیش کی۔ اُن کی مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اس واقعے

”ہاں نہ کہنا۔“ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے تمہاری لڑکی سے ہارے میں علم نہیں؟ اگر میں گزشتہ رات تہجد سے پہلے گھر سے باہر نہ نکلتا تو تم ساری زندگی اپنی بیٹی کو تلاش کرتے رہتے۔“

”کہاں ہے میری بیٹی؟“ زینب نے تڑپ کر پوچھا۔

”پہلے تو تم بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے؟“ پیر صاحب نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”بڑے شگن کرنے چلی تھی۔ میرا ایک جن اسے اٹھا کر کوہ قاف لے جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لڑکی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تمہارے ہی گاؤں کا ایک لڑکا تھا۔ میں نے دونوں بچوں کو جن سے چھین لیا۔ لڑکا تو اسی وقت اپنے گاؤں چلا گیا اور لڑکی میرے پاس ہے۔“

پیر صاحب نے اپنے ایک مرید کو اشارہ کیا اور وہ نصرت کو لے آیا۔ نصرت تم صم اپنے ماں باپ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنی دیر میں دروازہ کھلا اور ریاض اندر داخل ہو کر پیر صاحب کے قدموں میں گر گیا۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور اپنے پاس بٹھایا۔

”یہ ہے وہ لڑکا۔“ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے گناہوں کی سزا ان معصوموں کو پہنکتی پڑی ہے۔ اب ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ دونوں بچے کوہ قاف کی مخلوق کی نظر میں آ گئے ہیں۔ ان کی شادی جس کسی کے ساتھ بھی ہوگی، وہ جنوں کے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔ یا تو ان کی آپس میں شادی کر دو یا پھر انہیں ساری زندگی کنوارہ رکھنا۔“

”لیکن حضور! دادا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔“ اگر تمہاری نیت میں کھوٹ ہے۔“ بابا جی ایک بار پھر جلال میں آ کر کہنے لگے۔ ”اور تم نے اپنی مرضی کرنی سے تو پھر آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔“

”حضور!“ دادا بولا۔ ”ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم آپ کا حکم مانیں گے اور لڑکے کا باپ راضی ہوا تو ان کی شادی کر دیں گے۔“

”کم بختو!“ پیر صاحب نے جہاں سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”خدا کا شکر ادا کرو کہ میری نظر پر گئی ورنہ یہ لڑکی اور یہ لڑکا اس وقت کوہ قاف کی کسی غار میں قید ہوتے۔“

یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے نصرت کی شادی راضی سے کرنے کا وعدہ کر لیا۔ پیر صاحب کی بات رد کرنے کی کسی میں بھی جرأت نہیں تھی۔

کچھ دنوں بعد ایک کاما شادی کی دعوت لے کر احمد خان کے گھر پہنچا۔ اس کے سارے خاندان کو اس شادی میں بلایا گیا تھا۔ یہ دعوت زینب کے سر کی طرف سے تھی۔ احمد خان بالکل اسی طرح نصرت کی شادی میں شریک ہوا جس طرح کوئی ماموں اپنی بھانجی کی شادی میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح احمد خان کی وجہ سے زینب کا مسئلہ بھی حل ہوا اور اس کی بیٹی کی شادی اس کی مرضی کے مطابق ہو گئی۔

آج میں آپ کو یہ بات بتا رہا ہوں کہ احمد خان نے نصرت کو اپنے گھر میں چھپا کر پیر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ اس سے آگے ڈرامہ پیر صاحب کے دماغ کو پیداوار تھا۔ ایک تو ان کی احمد خان کے ساتھ بے تکلفی تھی، دوسرے وہ سچے دل سے نصرت اور ریاض کی بہ کرنا چاہتے تھے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ یہ ساری باتیں مجھے تندر کس طرح پہنچی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اسی احمد خان کا بیٹا ہوں اور مجھے یہ کہانی میرے والد صاحب نے خود سنائی تھی۔



ایک حقیقت ایک انسان

خالص عرق گلاب

اس کا باپ مرض الموت میں مبتلا تھا اور علاج کے لئے دہلی گلاب کے خالص عرق کی ضرورت تھی اور وہ پاگلوں کی طرح عرق تلاش کر رہا تھا۔

☆ محمد صدیق شاہ بخاری

ہیں۔ آج سے بیس برس قبل جب وہ چدرہ برس کا تھا تو وہ بھی ایسا ہی شدید بیمار ہوا تھا اور اس کے والد نے جی کتنی راتیں اس کے سر ہانے یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزار دی تھیں۔ مزدور باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے اپنی سائیکل بھی بیچ ڈالی تھی اور اس کی ماں نے اپنے جہیز کی آخری چیز، اگلوں بھی فروخت کر دی تھی، مگر پھر بھی اس کے علاج کے اخراجات سمجھ نہ پائے تھے۔ دن کو مزدوری کی مشقت اور راتوں کی جاگنے کی وجہ سے ایک دن اس کا باپ شدید بیمار میں مبتلا ہو گیا۔ مگر وہ پھر بھی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے کوئی دہلی دوا دے دیں کہ میرا بیمار فوراً تر جائے تاکہ میں کام پر جا سکوں۔ ورنہ شام کو اپنے بچے کے لئے دوا نہ خرید سکوں گا۔ بالآخر باپ کی محنت رنگ لائی۔ پٹا صحت مند ہو گیا۔

مگر انور کی تو ساری محنت رائیگاں جا رہی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ مرض بوھتا گیا جوں جوں دوا

انور کے والد صاحب کو بیمار ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہونے کو تھا۔ آج ان کی پوری رات کراہتے ہوئے گزری تھی۔ کھانسی کا دورہ تو ان کے لئے خاص طور پر بہت تکلیف دہ ہوا کرتا تھا کہ اس میں بعض اوقات سانس بھی رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آج شب یہ بھی کئی دفعہ ہو چکا تھا۔ ابھی چند منٹ قبل ان کی آنکھ لگی تھی۔ اسی اثنا میں قریبی مسجد سے اذان فجر بلند ہوئی۔ انور کو اذان کا سننا بہت اچھا لگتا تھا، مگر اس وقت اس پر یہ آواز گراں گزر رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ آواز والد صاحب کے آرام کو پھر تکلیف میں نہ بدلی دے۔

ابھی نماز میں آدھ ٹھٹھا باقی تھا۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لئے سستالے۔ وہ کرسی پر نیم دراز ہوا۔ اس کی نظر ابھی تک اپنے والد پر جمی ہوئی تھی۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ اسے محسوس ہوا جیسے سامنے چار پانی پر وہ خود لیٹا ہوا ہے اور اس کے والد اس کی جگہ پر

کی۔ وہ بھی ہر جتن کر رہا تھا مگر بے سود۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ حکیموں کے پاس پہنچا۔ کل شام وہ ساتویں حکیم سے ہو کر آیا تھا مگر عجیب بات تھی کہ سب حکما کی ایک ہی رائے تھی کہ تمہارے باپ کی بیماری بالکل قابل علاج ہے مگر وہ دبانے کے لئے خالص ویسی گلاب کا خالص عرق چاہئے۔ پیچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل خالص عرق گلاب کی تلاش میں سرگرواں تھا مگر خالص عرق گلاب ہر جگہ ناپید تھا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ویسی گلاب حاصل کر کے عرق کشید کرے گا۔ صبح ہوتے ہی وہ قبرستان میانی صاحب کے باہر پھول بیچنے والوں کے پاس پہنچا اور ان سے معلومات لیں کہ ویسی گلاب کہاں سے مل سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سال ویسی گلاب کی فصل کثیرا لگنے سے مکمل تباہ ہو گئی ہے، اب تو اس کا حصول ممکن نہیں۔

وہاں سے چلتا چلتا وہ بازار گل فروشاں لوہاری گیٹ پہنچا۔ وہاں سے بھی اسے یہی جواب ملا۔ وہ پھر بھی مایوس نہ ہوا، اس کی اگلی منزل شرق پور روڈ تھی۔ وہاں پھول بیچنے والے بکثرت موجود تھے۔ ان کے پاس ہر قسم کا گلاب بھی موجود تھا، سوائے ویسی گلاب کے۔ اس نے ان سے فردا فردا پوچھا کہ ویسی گلاب کے بننے کی کوئی صورت ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اب تو یہ ممکن نہیں، اگلی فصل تک انتظار کرنا ہوگا۔ انور بڑبڑایا۔ اگلی فصل تک؟ اس پر تو ایک ایک لمحہ بھاری ہو رہا تھا۔ اسی دوڑ دھوپ میں دن کے دس بج چکے تھے، اس نے سوچا کہ شرق پور کے پاس عباس پور گاؤں جا کر خود گلاب کی فصل دیکھے کہ شاید کچھ پھول کیڑے کی دست برد سے بچ گئے ہوں۔

ابھی اس نے موٹر سائیکل کا رخ اوھر کیا ہی تھا کہ اسے خیال آیا کہ آج تو والد صاحب کی طبیعت

زیادہ خراب تھی، انہیں ایک دفعہ دیکھ کر پھر جاتا ہوں۔ وہ گھر کی طرف پلٹا۔ ابھی گھر کے دروازے ہی میں تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ وہ تیزی سے والد صاحب کی چارپائی کی طرف لپکا۔ والد صاحب کا رنگ پہلے سے بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا۔ نبض کی حرکت احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی اور جسم کی بچی کچھی گرمی بھی سروی میں بدل چکی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ جب صبح وہ عرق کی تلاش میں نکلا تھا تو اس وقت ان کی روح بھی عدن کے باغوں کی تلاش میں نکل گئی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں دیکھیں تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی روشن ہیں اور جیسے وہ سوال کر رہی ہیں کہ مل گیا عرق گلاب؟

سوال کرتی آنکھوں نے اس کے اندر ایک موہوم سی امید کا دیا روشن کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا کہ حکیم صاحب کو بلا کر لائے کہ شاید وہ اس کی امید کی تائید کر دیں۔ اس کی والدہ نے بھاگتے ہوئے انور کے ہاتھوں میں ایک دفعہ پھر عرق گلاب کی خالی بوتل تھما دی تھی۔ حکیم صاحب کے مطب کے باہر سے اس نے انہیں آواز دی کہ جلدی آئیے۔ مگر اس نے دیکھا کہ وہ بڑے اٹھاک سے اخبار کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب اس کی آواز سن کر چونکے۔ انہوں نے اپنی عینک اتاری اور کہا۔

اندر آ جاؤ جلدی سے، تمہارے کام کی ایک چیز ہے۔ وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حکیم صاحب ایک خبر کو انڈر لائن کر رہے ہیں۔ اخبار کے صفحہ اوّل پر یہ خبر تصویر کے ساتھ نمایاں انداز میں چھپی ہوئی تھی کہ کل گورنر پنجاب نے انڈیا سے خصوصی طور پر درآمد کردہ ویسی گلاب سے تیار شدہ 50 من خالص عرق گلاب سے دربار داتا صاحب کو غسل دیا۔



پنگالین، غیبت اور سرائے موت

انہوں نے رات کے اندھیرے میں لڑکی کو چاقو اور خنجر دکھا کر دہشت زدہ کیا اور پھر اس کے منہ پر کپڑا باندھ کر گھوڑی پر بٹھا کر لے گئے۔

☆ سالار حسین راجپوت



بھی سن لو..... دیکھ بیٹا! سنسنی خیز اور حیران کن واقعات انہی کے ساتھ پیش آتے ہیں جو خطرے مول لیتے ہیں اور ایڈوچر کی خاطر خطروں میں کود جاتے ہیں..... اور پھر ڈرامائی واقعات اور پُر اسرار حالات انہیں نظر آتے ہیں جو اپنے ذہن کی محدود سی دنیا سے نکل کر دوسروں کو غور اور دھیان سے دیکھتے ہیں۔

”ہسکو، پاپ اور راک اینڈ رول فچر کے دہدادہ“ بند کمروں میں تنہا خائف نظر آتا ہے؟ گھر میں بیٹھ کر انڈین فلمیں دیکھ کر تم حقیقی زندگی کے واقعات اور حادثات کو کیسے دیکھ سکتے ہو؟ شہروں کی سڑکوں پر تم اس کے سوا اور کیا دیکھ سکتے ہو کہ دو کاریں ی ٹکرائیں، کوئی ویگن سائیکل یا موٹر سائیکل سوار کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ یا یہ کہ بینک سے ایک آدمی چیک کیش کروا کے نکلا اور ۱۱ نو جوان موٹر سائیکل سواروں نے ریوالور دکھا کر اس سے لوگوں کے سامنے کیش چھینا اور غائب ہو گئے، یا تم سڑکوں پر اُن لڑکیوں کو تاڑتے پھرتے ہو جنہیں نئی تہذیب نے نیم عریاں کر دیا ہے..... ہمارا لڑکپن..

ہماری جوانی خطروں سے کھیلنے لگتی ہے۔“ میں نے تمہیں لمبی کردی ہے۔ ایک بات اور کہوں گا۔ میرے سینے میں ابھی کئی راز دفن ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو میرے ساتھ قبر میں جائیں گے اور کچھ ایسے ہیں جو میں موقع مل کر کشف کرتا جا رہا ہوں۔ آج میں آپ کو شکار کی نہیں بلکہ جرم و سزا کی کہانی سناؤں گا۔

ہم حسب معمول شکار کو نکلے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بقر عید کو تین یا چار دن گزر گئے تھے اور موسم سردیوں کا تھا۔ پندرہ سولہ لڑکے اور آٹھ یا نو لڑکیاں تھیں۔ گندم کی فصل اٹھ رہی تھی۔ قربانی کا گوشت اتنا کھا لیا تھا جسے گاؤں میں رہ کر ہضم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ باہر نکلتا اور بھاگتا دوڑنا ضروری ہو گیا تھا۔

یاچہ چھ لڑکوں کے پاس غلیلیں تھیں۔ ان میں

ایک شعر کا دوسرا مصرعہ ہے:
اک شمع رہ گئی سو وہ بھی خوش ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے زندہ دل احباب کی محفل کی میں ایک ہی شمع رہ گیا ہوں لیکن خاموش نہیں ہوں۔ خاموش اُس وقت ہوں گا جس وقت اللہ کا بلاوا آنے کا اور میرے گاؤں کے لوگ کہیں گے۔ ”ہائے، باوا صابو مر گیا ہے۔“ پھر یہ لوگ باوا صابو کو بھول جائیں گے۔ افسوس ہو گا تو میری آل اولاد کو ہو گا۔ انہیں اتنا ہی زیادہ افسوس ہو گا جتنا مجھے اپنے آخری نئے کی موت پر ہوا تھا۔ یہ میرا تیسرا لگتا تھا۔ اس نے میرا بڑا لہبا ساتھ دیا تھا۔ اس کو موت کے ساتھ ہی میں نے شکار چھوڑ دیا تھا۔ شکار کی عمر ہی نہیں رہی تھی۔ میرا یہ لگتا بڑا ہی زندہ دل تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ عاشق مزاج تھا۔ جہاں کہیں اچھی نسل کی نو جوان تھیں دیکھتا، اس کے ساتھ پیار کی پیشکشیں بڑھانی شروع کر دیتا تھا۔ دیر اور وفادار اتنا کہ حیران کر دیتا۔ کبھی اس کی پوری سوانح حیات لکھوں گا۔

میں خاموش رہ ہی نہیں سکتا۔ ماضی کی یادیں ہی تو میرے بڑھاپے کا سہارا ہیں۔ ان یادوں میں کھوجاتا ہوں اور ابھی کوئی پرانا واقعہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور ابھی پوتوں پوتیوں کو ماضی کی کہانیاں سناتے لگتا ہوں اور اس طرح بڑھاپے میں جوان رہتا ہوں۔

”ابو جی!“ ایک روز میرے سب سے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے پوچھا۔ ”اتنے زیادہ اور اتنے سنسنی خیز واقعات صرف آپ کی زندگی میں ہی کیوں ہوئے ہیں؟ کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ یہ کہانیاں خود ہی گھڑ لیتے ہیں۔“

”تم نے شاید میری کبھی ہوئی تمام کہانیاں نہیں پڑھیں۔“ میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”میں نے ایک کہانی میں اس بات کا جواب تفصیل سے دیا ہے۔ تم

چوہے تھے جو کھیتوں میں ہل بنا کر رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کی جسامت کتیا کے نوزائیدہ بچوں جتنی ہوتی تھی لیکن بعض اس سے ڈگنے اور ٹکنے موٹے تازے بھی ہوتے تھے۔ یہ چوہے جس کھیت میں ہل بناتے تھے وہ کھیت دھنس جاتا تھا کیونکہ بارشوں کا پانی ان ہلوں کے اندر چلا جاتا تھا۔ ہل دور تک گئے ہوتے تھے۔ ان کشادہ ہلوں میں اتنا زیادہ پانی چلا جاتا تھا کہ کھیت کا خاصا حصہ دھنس جاتا تھا۔

میں نے اب دیکھا ہے کہ ہمارے آج کل کے نوجوانوں کی طرح ان جنگلی چوہوں کے بھی قد کاٹھ چھوٹے چھوٹے رہ گئے ہیں۔

میں بتا رہا تھا کہ اس گہرے اور ذرا وسیع نشیب میں ایک موٹا تازہ چوہا دوڑتا ہوا داخل ہوا اور اس کے پیچھے دو جنگلی بچے داخل ہوئے۔ میں نے اپنی دو تین کہانیوں میں جنگلی بچے کا ذکر کیا ہے۔ یہ اُن ہی بچیوں جیسا ہوتا ہے جو ہمارے گھروں اور گلیوں میں گھومتی پھرتی رہتی ہیں لیکن جسامت میں ان سے بڑا، موٹا تازہ اور طاقتور ہوتا ہے۔ بعض جنگلی بچے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ شیر کے بچے لگتے ہیں۔

جنگلی بچے خونخوار ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ مانوس نہیں ہوتا۔ کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا بلکہ انسان کو اور کتے کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے اور اگر اسے کہیں روک لیا جائے اور اسے بھاگنے کا راستہ نہ ملے تو اس کا حملہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ انسان یا کتے کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ جنگل میں اس کا شکار چوہے، گلہریاں، فیلہ، ہوتے ہیں اور یہ خرگوش کو بھی پکڑ لیتا اور کھاتا ہے۔

دو جنگلی بچے ایک بڑے ہی موٹے تازے چوہے کے پیچھے نشیب میں داخل ہوئے تو ہم بہت خوش ہوئے۔ یہ جنگلی بچے ہمارا شکار تھے۔ یہ جوڑا تھا، یعنی ایک مٹی تھی اور دوسرا بلا۔ ہمارے کتے ادھر ادھر پھر

سے دوڑنکوں کا نشانہ بڑا اچھا تھا۔ انہوں نے راستے میں دو جنگلی کبوتر اور دو تین فاختہ مار لیں۔ انہیں ہم نے فوج نہ کیا۔ پر اتنا کر یہ پرندے کتوں کے حوالے کر دیئے۔

کتوں کے بچوں سے ہم نے نہ زنجیریں اتار دیں۔ وہ ادھر ادھر اٹھیلیاں کرتے ہمارے ساتھ چلتے گئے۔ میں اپنے علاقے کے خدو خال کئی بار بیان کر چکا ہوں۔ یہ کھڈ نالوں، گھاٹیوں اور ٹیلوں کا علاقہ ہے۔ ہمیں آپ ایسی بلندی پر جا رہے ہوں گے کہ دور کشمیر کے برف پوش پہاڑ اور اُفق سے اُفق تک کی سرسبز وسعت نظر آنے کی اور ذرا ہی آگے جا کر آپ گھاٹی اتریں گے تو آپ قلعے جیسی بلند دیواروں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

ہم ایسی ہی ایک گھاٹی اترے۔ یہ برساتی نالہ تھا۔ اس میں سے گزر کر اگلی گھاٹی چڑھے۔ ہمارے سامنے وسیع و عریض میدان تھا۔ ذرا آگے گئے تو دائیں طرف کنوئیں جیسا گہرا نشیب نظر آیا لیکن یہ کنوئیں سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ ہمارے بائیں جانب اس کی دیوار میں زمین کے قریب اتنا بڑا دہانہ تھا جس میں سے ایک آدمی ذرا جھک کر گزر سکتا تھا۔ یہ بارش کے پانی کا راستہ تھا۔ ہمارے علاقے میں ایسے نشیب جگہ جگہ ملتے تھے۔ بعض تنگ اور بعض بہت ہی وسیع تھے۔ اب ان میں سے کئی نشیب بارشوں اور آندھیوں نے بھر دیئے ہیں۔

ہم اس نشیب کے منڈیر جیسے کنارے پر جا رہے تھے کہ نیچے کچھ دہلی دہلی آوازیں سنائی دیں۔ نیچے دیکھا تو ایک چوہا نظر آیا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ چھوٹا سا چوہا ہوگا جیسے شہروں کے گھروں میں پائے جاتے ہیں۔ شہر کے گھریلو چوہے کا وزن پوری دو چھانک نہیں ہوتا۔ میں جس چوہے کی بات کر رہا ہوں وہ بلا مبالغہ درمیانہ جسامت کی مٹی جتنا بڑا تھا۔ یہ کھیتوں کے

بلوں نے چوہے کو پکڑ لیا۔ بلوں کو ذرا سا بھی ڈر نہیں تھا کہ اتنے سارے انسان ان کے سر پر کھڑے ہیں۔ ایک تو وہ جنگلی بلے تھے، دوسرے وہ شکار کو پکڑ رہے تھے۔ اتنے میں ہمارے کتے آگئے۔ وہ بھونکنے اور غرائے تو بلوں نے دیکھا۔ وہ اپنا شکار چھوڑ کر ادھر کو بھاگے۔ چوہا ان کے بچوں اور دانتوں سے ابھی زیادہ رنجی نہیں ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بلے بھاگ گئے ہیں تو وہ واپس نشیب کی طرف دوڑا۔ اب وہ اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ دو تین گتے اُس کے پیچھے چلے گئے اور باقی بلوں کے پیچھے گئے۔

جنگلی بلے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ پنجہ مار کر کتے کی آنکھ نکال دیتا ہے اور اس میں شیر کی خصائیس ہوتی ہیں۔ کتے ان دونوں کے پیچھے گئے۔ وہ الگ نہیں ہو رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ جوڑا تھا۔ ان کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ کتوں کی رفتار بھی کم نہیں تھی لیکن آگے بڑکا ایک پرانا درخت آ گیا جو بہت ہی بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ دونوں بلوں نے اس کے قریب جا کر جپ لگائی اور درخت پر چڑھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر ہی اوپر چڑھتے ہوئے درخت پر ہی کہیں چھپ گئے۔ کتے نیچے ہی اچھلتے رہے اور ہم ایک دوسرے کے منہ دیکھتے رہ گئے۔

وہاں سے ہم آگے چل پڑے۔ کچھ دن پہلے ہمیں ایک آدمی نے ایک جگہ کا راستہ سمجھا کر بتایا تھا کہ وہاں بہت سے خرگوش اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وہ جگہ دور اور دیرانے میں تھی جہاں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا۔ وہاں سبزہ تھا اور پانی کا قدرتی تالاب بھی بنایا گیا تھا۔ خرگوشوں کے لئے ایسی ہی جگہ موزوں ہوا کرتی ہے۔ ہم اس روز اس جگہ جا رہے تھے۔ وہ جگہ ابھی دور تھی۔

ہم آبادیوں اور پگڈنڈیوں سے جہٹ کر جا رہے تھے۔ کتوں کو ہم نے کھانا چھوڑ رکھا تھا۔ کچھ اور آگے

سے تھے۔ ہم یہ دیکھنے کے لئے دوڑتے ہوئے آگے گئے کہ کتوں جیسے اس نشیب میں جو دہانہ بنا ہوا ہے، اس میں کتوں کو داخل کرنے کے لئے کدھر سے نیچے جانا پڑے گا۔

تھوڑی ہی دور آگے ہمیں نالہ سا نظر آیا جو گہرائی میں تھا۔ یہ سیدھا اُس نشیب کے دہانے تک جاتا تھا۔ ہم نے کتوں کو بلایا۔ شکار پر آ کر تو وہ اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ اتنے میں چوہا نشیب کے دہانے سے نکل آیا اور دونوں بلے اس کے پیچھے آئے۔ ہم نے دیکھا کہ اتنا بڑا اور طاقتور چوہا اتنا تیز نہیں دوڑ رہا تھا۔ جتنا تیز دوڑنے کی وہ طاقت رکھتا تھا۔ وہ ذرا ذرا اچھلتا تھا لیکن آگے کم ہی بڑھتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ شدید رنجی ہو گیا ہو اور اس سے چلا بھی نہ جاتا ہو۔

چوہا رنجی نہیں تھا، نہ اسے چوٹ لگی تھی۔ دراصل اس کی بھانسنے کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ کبھی آپ بلی کو چوہے یا گھبرے کے پیچھے دوڑتا دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ چوہا یا گھبرے تیز دوڑ ہی نہیں سکتے۔ ان پر بلی کا اتنا زیادہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ ان کے دوڑنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چوہا یا گھبرے چپناٹا ہو جاتے ہیں۔ اگر چوہے یا گھبرے کے سامنے اچانک سانپ آ جائے تو یہ وہیں رکے رہتے ہیں، بھاگ نہیں سکتے اور اگر انسان، کتا یا بھیڑیا وغیرہ انہیں پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے دوڑے تو ان کی رفتار جبراً گن حد تک تیز ہو جاتی ہے۔

وہ مونا اور ہٹا کتا چوہا بھی دوڑنے کی طاقت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ جگہ جسے میں نے نالہ کہا ہے، اس قسم کی تھی۔ دونوں طرف سے زمین ڈھلانی ہو کر نیچے چلی گئی تھی اور ان کے درمیان اتنی جگہ تھی جس سے دو آدمی پہلو پہ پہلو گزر سکتے تھے۔ اس میں سے بارش کا پانی گزرتا تھا۔

ہم بچتے، ہمارے تمام کتے اس اکیلے کتے پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے کتے اپنے لیڈر کی توہین برداشت نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس کتے نے بھاگ نکلنے میں ہی خیریت سمجھی۔ ہمارے کتے اس کے تعاقب میں گئے۔ وہ گھوڑی کے نیچے چلا گیا۔ گھوڑی رُکی ہوئی تھی۔ ہمارے کتوں نے اُس کتے کو گھوڑی کے نیچے سے جا پکڑا۔ گھوڑی ایسی بُری طرح بدک کہ بھاگنے لگی۔ جس آدمی نے باگ پکڑی ہوئی تھی، اُس نے گھوڑی کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کتے اس آدمی کی ٹانگوں سے بھی ایسے ٹکرائے کہ وہ گر پڑا اور اس کے ہاتھ سے باگ چھوٹ گئی اور گھوڑی ایک طرف دوڑ پڑی۔

”گھوڑی روکو اوئے“۔ ہمارے کسی ساتھی نے چلا کر کہا۔ ”یہ لڑکی گر پڑی تو ماری جائے گی۔“

ہمارے کچھ ساتھی گھوڑی کے پیچھے دوڑ پڑے اور باقی اپنے کتوں کو زنجیریں ڈال کر قابو میں لانے لگے۔ میں گھوڑی کو روکنے والی پارٹی میں تھا۔ ہم پانچ چھ لڑکے تھے۔ گھوڑی کو ہم دائیں، بائیں اور آگے کو پھیل کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی سوار جوان لڑکی تھی۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ اللہ نے اس پر یہ کرم کیا کہ گھوڑی کا رخ چٹان کی طرف ہو گیا اور چٹان نے اسے روک لیا۔ دائیں اور بائیں ہم تھے اس لئے گھوڑی دائیں اور بائیں نہیں جاسکتی تھی۔ ہم نے گھوڑی کو پکڑ کر اسے تھکیاں اور لڑکی کو تسلیاں دیں۔ لڑکی کا تو بُرا ہی حال تھا۔ وہ گندمی رنگ کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس سے اس کا گاؤں پوچھا تو وہ آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتی رہی۔ ہم سمجھے کہ وہ خوفزدگی کی وجہ سے ابھی بول نہیں سکتی۔ ہم سب نے باری باری اسے کہا کہ دل سے ڈراتا روئے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ وہ گھوڑی سے گری نہیں۔

کتے تو ایک گھاٹی اترے۔ یہ بھی ایک نشیب تھا جس کے وسط میں کچھ پانی تھا۔ نشیب لمبوتر اور کم و بیش پچاس قدم لمبا اور تقریباً بیس قدم چوڑا تھا۔ اس کے کنارے دیواروں جیسے اور اونچے تھے۔

اس میں نکلنے کے لئے ہم اگلی گھاٹی چڑھے۔ اب ہمارے سامنے ویران علاقہ تھا۔ کوئی گاؤں نظر نہیں آتا تھا۔ کہیں کہیں نیلے تھے اور ایک طرف سِلّوں والی چٹان تھی جو کچھ دور تک چلی گئی تھی۔ ہم چٹان کی طرف جا رہے تھے۔ خرگوشوں والی جگہ بتانے والے نے بتایا تھا کہ راستے میں سِلّوں والی چٹان آئے گی۔

ہم چٹان کے قریب پہنچے تو اس کے سامنے جو ٹیلہ تھا، اس کے پیچھے سے دو آدمی نکلے اور ان کے پیچھے ایک گھوڑی نکلی۔ گھوڑی کی باگ ان دو آدمیوں میں سے ایک نے پکڑ رکھی تھی۔ گھوڑی پر ایک عورت سوار تھی۔ ایک آدمی نے ایک کتے کی زنجیر پکڑی ہوئی تھی۔ کتا بھڑیے کی نسل کا معصوم ہوتا تھا۔ اس نسل کے کتے رکھوالی کے لئے بہت اچھے ہوتے ہیں اور لڑتے بھی خوب ہیں۔

وہ ہم سے تیس پینتیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ ہمارے کتوں نے اس کتے کو دیکھا تو آہستہ آہستہ غرائے لگے اور اس کی طرف چل پڑے۔ ہم نے اپنے کتوں کو منع کیا کہ وہ کوئی بدعاشی نہ کریں لیکن ہوا یوں کہ وہ کتا اچانک ایک جھٹکے سے اپنے مالک سے ہاتھ سے زنجیر چھڑوا کر ہمارے کتوں کی طرف دوڑتا آیا۔ وہ دیہ معصوم ہوتا تھا۔

ادھر سے ہمارا بولی دوڑ کر آگے ہوا۔ وہ کتوں کا لیڈر تھا۔ وہ اس کتے کی طرف دوڑا۔ ادھر سے وہ کتا دوڑتا آیا۔ بولی نے اُس پر حملہ کر دیا۔ وہ کتا مقابلے میں ڈٹ گیا۔ ادھر سے اُس کا مالک ادھر آیا۔ ادھر سے ہم گئے بڑھے کہ کتوں کو چھڑا دیں۔ پیشتر اس کے

”تم جو کوئی بھی ہو“۔ میرے دوست شاہباز خان نے کہا۔ ”اور جہاں کہیں کے بھی رہنے والے ہو، ہمیں پروا نہیں۔ اس لڑکی کو ہم نہیں جانے دیں گے۔ ہمیں اصل بات بتا دو“۔

یہاں سے ہمارے درمیان تقبی پیدا ہو گئی۔ ہمارا لبو پہلے سے ہی گرم تھا۔ ہم نے لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ان آدمیوں سے کہا کہ ہم لڑکی کو تھانے لے جائیں گے اور وہ تھانیدار کی اجازت سے لڑکی کو لے جائے۔

”تم اپنی موت کو سوازیں دے رہے ہو“۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم نے اپنے گاؤں میں جا کر بتا دیا کہ تم نے ہماری لڑکی ہم سے چھینی ہے تو گاؤں کا، بچہ بچہ لاشیاں اور کلباڑیاں لے کر پہنچ جائے گا اور تمہاری بوٹی بھی نہیں ملے گی“۔

”بسم اللہ، بسم اللہ“۔ میں نے کہا۔ ”جاؤ، گاؤں والوں کو ساتھ لے آؤ“۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ”بیٹھے جاؤ بھائیو“۔

وہ کچھ اور ہی باتیں کرنے لگے۔ اس ڈرامے کا ایک اور پردہ اٹھا جو بالکل ہی غیر متوقع تھا اور یہ بہت ہی عجیب اتفاق تھا۔ بنگال کی قسمت اچھی تھی اور وہ اتنی نیک لڑکی تھی کہ خدا نے اسے مدد بھیج دی۔ یہ مدد پولیس کی صورت میں تھی۔ قریب سے ایک راستہ گزرتا تھا جو ذرا آگے جا کر نیچے چلا جاتا تھا۔ وہاں سے علاقے کا تھانیدار اوپر اٹھا پھر اس کا گھوڑا نظر آیا پھر اس کے پیچھے ایک ہیڈ کاٹھیل اور دو کاٹھیل ابھرے۔ ان کے ساتھ کسی گاؤں کے تین چار آدمی تھے۔

”یہ بھی ٹھیک رہا“۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔ ”پولیس یہیں آ گئی ہے“۔

مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے اس آدمی کو دیکھا جسے میں نے معزز کہا ہے۔ اس کے چہرے پر

موت و دک منہ پھیر لیتے یا وہاں سے ہٹک جاتے ہیں۔ موقع کے گواہ بھی گواہی دینے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ہماری نوجوانی کے دور کی بات کچھ اور تھی۔ کسی گھر کے اندر کوئی شور شرابہ اٹھتا تھا تو پڑوسی دوڑ کر پہنچتے اور پیٹتے تھے کہ گھر والے خیریت سے تو ہیں۔ وہ انگریز کا رہتا جو اپنے قانون کی توہین برداشت نہیں کرتے تھے اور لوگوں میں اخلاق اور سردار تھا۔ ایک دوسرے کو کسی مشکوک و رخصیت میں دیکھ کر نظریں پھیر نہیں لیا کرتے تھے۔

ہمیں اس بنگالی لڑکی کے متعلق شک ہونے لگا کہ معاملہ گڑبڑ والا ہے۔ ہم نے ان دونوں آدمیوں پر جرح شروع کر دی۔ میں نے جس آدمی کو معزز کہا ہے، وہ غصے میں آ گیا۔ اس آدمی کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی، اس کا ساتھی اس سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔

”بھوش کرو لڑکوا“۔ اس معزز آدمی نے قدرے مضبوط آواز میں کہا۔ ”تم نے تو یوں تشویش شروع کر دی ہے جیسے تم سب تھانیدار اور حوالدار ہو اور ہم چور ہیں۔ میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ کھسکو یہاں سے، تم سر چڑھتے جا رہے ہو۔ یہ ہماری اپنی لڑکی ہے“۔

”پھر تمہارے ساتھ جاتی کیوں نہیں؟“ میرے دوست افضل نے پوچھا۔

”جاتی سے یا نہیں جاتی“۔ اس نے کہا۔ ”تم اس کے سامنے جا بچے متے ہو؟“

ہمیں متعلق کرنے کے لئے ”مے چاچے“ کہہ دینا ہی کافی تھا۔ اس کے ساتھ بنگال کا وادلا اور اس کا ہماری ٹانگوں کے ساتھ پیٹ لپٹ جانا، ہاتھ جوڑنا اور رو رو کر کہنا۔ ”ام نا میں جانا۔۔۔ ام اشرف کا بیوی۔۔۔“

یہ نائیں۔۔۔ ہماری عزت کو لٹکا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ درجن بھر کتے تھے اور سوا درجن ہم خود تھے۔ ہم ڈٹ گئے۔

سناتے تھے۔ اس سے انہیں بڑی اہمیت ملتی تھی۔ یہ تو دوسری جنگ عظیم میں جب ہر گھر کے ایک ایک دو دو جوان فوج میں بھرتی ہو گئے اور ان میں سے بہت سے بنگال گئے تو پتہ چلا کہ بنگال میں کوئی جادو نہیں اور نہ وہاں کی عورتیں حسین ہیں۔ کوئی بنگالین گورے رنگ کی نہیں ہوتی۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ بنگالی عورتوں کے بال لمبے اور ملائم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھیں موٹی اور دلکش ہوتی ہیں۔ پھر ہم نے بنگالیوں کی غربت اور نیم فاقہ کشی کی باتیں سنیں۔ 1947ء میں بنگال دو حصوں میں بٹ گیا اور ایک حصہ مشرقی پاکستان بن گیا تو بنگالیوں کو ہم نے قریب سے دیکھا اور پھر اخباروں میں آئے دن دریائی اور سمندری سیلابوں اور طوفانوں کی خبریں آنے لگیں۔ ایک ہی بار کئی کئی ہزار بنگالی سیلاب اور طوفانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے فوجی جو مشرقی پاکستان میں ہوتے تھے، بتاتے تھے کہ خرگوشوں کی طرح بچے پیدا کرتے رہتا بنگالیوں کی ہالی ہے۔ اگر سیلاب میں دو ہزار بنگالی مارے جائیں تو ان کے پسماندگان اگلے سیلاب تک سوا دو ہزار بچے پیدا کر لیتے ہیں۔

اب میں اس بنگالی لڑکی کی طرف آتا ہوں جس کی میں کہانی سنا رہا ہوں۔ تھنیدار نے وہیں، ہم سب کے سامنے، ان دونوں آدمیوں سے اقبال جرم کروالیا۔ اس وقت کے تھنیدار فرض شناس ہوتے تھے۔ اگر یہ واقعہ آج کے دور میں ہوتا تو وہ بنگالی لڑکی کی بات ہی نہ سنتا۔ کہتا کہ تھانے میں آ کر رپورٹ درج کراؤ۔ اگر وہ لڑکی کی سی بن لیتا تو طرہوں کو تھانے لے جا کر مٹا کر لیتا اور لڑکی کو طرہوں کے حوالے کر کے تھانے سے رخصت کر دیتا۔

وہ تھنیدار جو غالباً وزیر آباد کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، اپنی ڈیوٹی اور اپنی حیثیت کو سمجھتا تھا۔ اُس

اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”یہ تمہارا شاگرد ہے؟“

اُس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ یہ اس کا شاگرد ہے۔ تھنیدار نے دونوں سے کہا کہ وہ یہیں اور سب کے سامنے بیان دے دیں ورنہ وہ ان پر گتے چھوڑ دے گا اور اُسے پوچھنے والا کوئی نہیں۔

یہ بنگالی لڑکی پٹھو ہار میں کیسے آگئی تھی؟ پہلے اس سوال کا جواب سن لیں۔ انگریزوں کے دور حکومت میں بنگال پولیس اور برما پولیس میں انگریز پٹھانوں اور پنجابیوں کو بھرتی کر کے لے گئے۔ وہ برما اور بنگال کے باشندوں کو پولیس اور فوج کی نوکری کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے علاقے کے کسی آدمی بنگال پولیس میں تھے۔

اُس زمانے میں اگر کوئی دیہاتی ریل گاڑی پر دس پندرہ میل سفر کرتا تھا تو یہ اس کی زندگی کا یادگار واقعہ ہوتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ فلاں شخص نے ریل گاڑی پر اتنا لمبا سفر کیا ہے صرف فوجی تھے جو دور دراز چھاؤنیوں تک سفر کیا کرتے تھے۔ بنگال تو ملک کے دوسرے سرے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی کوئی سوچ بھی نہیں ملتا تھا۔

بنگال کے متعلق ہمارے خطے میں عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں۔ زیادہ مشہور بنگال کا جادو تھا اور بنگالی عورتوں کا حسن بھی بہت مشہور تھا۔ کہتے تھے کہ بنگال کی عورت کسی آدمی پر عاشق ہو جائے اور وہ آدمی اس کی طرف توجہ نہ دے تو متعلقہ بنگالین اُس کی روح گئے میں ڈال لیتی ہے۔ وہ جب گنا چوستی ہے تو وہ آدمی درد سے تڑپتا ہے اور نہچتا ہوا اس عورت کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

ہمارے وہ آدمی جو بنگال پولیس میں تھے، چھٹی پر آتے تھے تو اسی قسم کی سنسنی خیز اور پراسرار باتیں

انہوں نے پلان بنا لیا۔ اس پلان میں کوئی دانشمندی یا استادی نہیں تھی۔ منگنی والی لڑکی کے بھائی نے یہ سوچا تھا کہ بنگال کو غائب کر کے یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ لڑکی خود کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اس پلان پر ٹل در آمد بہت ہی مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کہ یہ کام ہو جائے تو اس کے لئے خود ہی حالات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ کام یا حادثہ یا واقعہ ہو جاتا ہے۔

انگو کی رات ان کے گاؤں میں ایک شادی کا ہنگامہ تھا۔ وہاں بجلی کی چراغیاں تھیں نہیں کہ گاؤں میں روشنی ہی روشنی ہوتی۔ صرف شادی والے گھر روشنی تھی۔ سارا گاؤں اس شادی میں شریک تھا۔ بنگالی لڑکی بھی دو تین لڑکیوں کے ساتھ اس ہنگامے میں شامل تھی۔ سوائے بھی آئے ہوئے تھے جن کا فطر مزاج کا اور پھر کانے بجانے کا پروگرام ساری رات چلا کرتا تھا۔ یہ اتنا دلچسپ ہوا کرتا تھا کہ لوگ اس میں غم ہو جایا کرتے تھے۔

بوٹا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تھا۔ دونوں گاؤں سے کچھ دور چھپے رہے تھے۔ بنگالی لڑکی کا خاوند اس رات گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ جہلم یا راولپنڈی کے قریب کسی گاؤں میں اپنے ایک دوست کی شادی پر چلا گیا تھا اس نے تین چار دن وہیں گزارنے تھے۔

بوٹا نے ایک عورت کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ آدھی رات سے ذرا پہلے یہ عورت بنگالی لڑکی کو ورغلا کر ایک طرف لے گئی۔ بوٹا اور اس کا ساتھی تیار تھے۔ انہوں نے لڑکی کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور اُسے قتل کی دھمکیاں دیتے ہوئے گھوڑی پر بٹھا کر لے گئے۔ راستے میں وہ ویرانے میں رکے۔ انہوں نے لڑکی کا منہ کھول دیا۔ چاقو اور خنجر سے اُسے بہت ڈرایا۔

یہ کس نہ سوچا کہ یہ کون سے تھانے کا کیس ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ یہ پولیس کا کیس ہے۔ اس نے ذی جہدہ لوتھ نہ سمجھ لیا اور ملازموں پر ٹھوڑا سا تشدد کر کے قتل جرم کر لیا۔

یہ رات اس طرح ہوئی تھی کہ ہمارے علاقے سے نیک گاؤں کا ایک جوان بنگال پولیس میں ملازم تھا۔ گاؤں میں ہی اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اب یہ انتظار تھا کہ وہ چھٹی آئے تو اس کی شادی کر دی جائے۔ وہ دو مہینوں کی چھٹی لے کر آیا تو اس کے ساتھ یہ بنگالی لڑکی تھی۔ اس نے اس سے شادی کر لی تھی اور اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو بتایا تو گھر والوں نے سر پیٹ لئے۔ زیادہ صدمہ تو انہیں ہوا جن کی لڑکی نے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی اور وہ شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

یہ شخص بڑی جرات والا جوان تھا۔ اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ اس لڑکی کو قبول کر لیں۔ اگر انہوں نے اسے تنگ اور پریشان کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر انہیں بنگال چلا جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

پس بڑی کے ساتھ اس جوان کی منگنی ہوئی تھی۔ اسے دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی بد معاشی میں منہ مارتا تھا۔ یہ خوشحال زمیندار خاندان تھا۔ یہ بڑا بھائی جوا بھی کھیلا کرتا تھا۔ اس کی یاری بوٹا کے ساتھ تھی۔ بوٹا کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ جوا کھینے آیا کرتا تھا اور سزا یافتہ جرائم پیشہ تھا۔ منگنی والی لڑکی کے بھائی نے بوٹا کے ساتھ بات کی اور کہا کہ وہ اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس کا طریقہ اس نے یہ سوچا کہ بڑی کو قتل کر دیا جائے۔

بوٹا نے کہا کہ وہ اس بنگال کو اغوا کرے گا اور ایک جگہ لے جا کر بیچ دے گا۔

مقدمے تک سرکاری طور پر روک لیا گیا تھا۔ ان لوگوں کا گاؤں ہمارے گاؤں سے بارہ تیرہ میل دور تھا۔ مقدمے کے فیصلے کے دو اڑھائی مہینے بعد ہم نے سنا کہ منگنی والی لڑکی کا بھائی مقدمے کے خاتمے کے تیسرے روز قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا سراغ نہیں ملا۔

تقریباً بیس سال گزر گئے۔ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ بنگال کا خاوند پنشن پر گھر آ چکا تھا۔ ایک روز اس قاتل کا راز مجھ تک پہنچ گیا۔ ہوا یوں تھا کہ بنگال کا خاوند مقدمہ ختم ہونے کے دوسرے تیسرے دن بیوی کو ساتھ لے کر بنگال کو روانہ ہو گیا۔ تیسری رات منگنی والی لڑکی کے بھائی کی لاش کھیتوں سے ملی۔ اُس کے گلے میں رسی ڈال کر مارا گیا تھا۔ اسی نے بوٹا سے کہا تھا کہ اس بنگال کو غائب کرو۔

راز یہ کھلا کہ بنگال کا خاوند اسے ساتھ لے کر بنگال کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اس نے ریل گاڑی کا ٹکٹ جہلم کا لیا تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست پنجاب پولیس میں تھا۔ اس نے بیوی کو اس کے گھر چھوڑا اور واپس اپنے گاؤں آیا لیکن گاؤں میں داخل نہ ہوا۔ اس نے اپنے ایک ہم عمر رشتہ دار سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مقتول کو فلاں رات اور فلاں وقت باہر کھیتوں میں لے آئے۔

یہ پلان کامیاب رہا۔ بنگال کا خاوند پہنچ گیا۔ مقتول اُس کے رشتہ دار کے ساتھ مطلوبہ جگہ موجود تھا۔ قاتل نے اس کے گلے میں رسی ڈالی اور اُسے مار کر واپس چلا گیا۔ جہلم سے وہ ریل گاڑی میں بیٹھا اور بنگال چلا گیا۔

بنگال کو غائب کرانے کا اصل مجرم تو یہی تھا لیکن قانون نے اُسے مجرم تسلیم نہ کیا۔ بنگال کے خاوند کی غیرت نے اُسے سزائے موت دے دی۔



اس کی آمد ہوا ہی تھی کہ نور اُس پر دہشت طاری کر گئی۔

وہاں سے پھر جن کے وقت چپے۔ ان کا رخ پکنول کی طرف تھا لیکن راستے میں ہمارے کتے آ گئے اور ایک مظلوم لڑکی کی مدد کے لئے خدا نے ایک فرض شناس لڑکھارہ کو وہاں بنگال بیا بان میں بھیج دیا۔ وہ تھوہدار دونوں مظلوموں کو بنگالی لڑکی کو اور ہم سب کو تھانے میں لے گیا۔ غلاموں کی شناسدہی پر اس عورت کو بھی تھانے ہوا کہ درست ہیں لے لیا گیا۔ بنگالی لڑکی کی کشدگی کی رپورٹ ابھی تک تھانے نہیں دی گئی تھی۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ منگنی والی لڑکی کے جس بھائی نے بوٹا اور اس کے ساتھی کو بنگالی لڑکی کے اغوا کے لئے کہا تھا، اسے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ اسے شامل تحقیق کیا گیا تھا لیکن اس کے خلاف مقدمہ نہیں بنایا تھا۔ وجہ یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ اس جرم میں عملی طور پر شامل نہیں تھا۔ اس کا کسی کو یہ کہنا کہ تم یہ جرم کرو اور نہ اس میں شامل نہ ہو، جرم نہیں، البتہ وہ اس جرم میں جرموں کی مدد عملی طور پر کرے تو وہ سزا کا حقدار ہوتا ہے۔

یہ دیکھیں کہ اس دور میں مقدموں کا فیصلہ کتنی جلدی ہوتا تھا۔ تینوں مظلوم اقبالی ہو گئے تھے۔ گواہ موجود تھے۔ چار ماہ مقدمہ چلا۔ بوٹا اور اُس کے ساتھی کو اغوا کرنے والے کی جرم میں سات سات سال سزائے قید ہوئی۔ اس عورت کو جو بنگالی لڑکی کو دھوکے میں بوٹا اور اُس کے ساتھی تک لے گئی تھی، تین سال سزائے قید ملی تھی۔ میری ساری شکاری پارٹی اس کیس میں گواہ تھی، ہمارے لئے سیر سپالے کا بڑا اچھا انتظام ہو گیا تھا۔ ہم پیشی پر راولپنڈی جاتے تھے اور ہمیں کورٹ سے خرچہ ملتا تھا۔

بنگالی لڑکی کے خاوند کی چھٹی وہ مہینہ تھی لیکن اسے

کاروبار... حقیقت یا سازش؟

یہ ڈرگ مافیا جو کچھ کر رہا ہے محض اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے کر رہا ہے۔ اس کے ایک سرے پر وائرس کا خوف اور دوسرے سرے پر ویکسین کی Sale ہے، بس اور کچھ نہیں۔

شیخوپورہ

0321-7612717

☆ ڈاکٹر زاہد اقبال

بھی جاری و ساری ہے۔ مگر حقیقت میں دیکھیں تو ٹی وی، اخبارات اور حکومتی شور شرابے یعنی میڈیا سے ہٹ کر یہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کئی خاندانوں سے پتہ کرایا، کوئی نہیں مرانہ مریض۔ سبزی منڈیوں میں بھی جہاں کوئی احتیاطی تدابیر نہیں اور گندگی اور ش بھی بہت ہے کوئی اس مرض سے نہ مرا۔ خدا کا شکر ہے!

کئی لوگ اس کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں مگر حقیقت کو اس طرح چھپایا گیا ہے کہ وہاں تک شاید ہی کسی کی رسائی ہو کیونکہ یہ ایک ہائی پروفائل کیس ہے (محترم عمران خان صاحب وزیراعظم پاکستان از خود کہتے ہیں کہ میں اس طرح کے لاک ڈاؤن کے حق میں ہرگز نہ تھا مگر مجبور کیا گیا)۔ جس طرح غریب عوام کو بھوکا مارا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔

جو حقائق اب تک مظہر عام پر آئے ہیں ان کی روشنی میں آپ خود ہی اندازہ لگالیں۔

مارچ 2020ء کا مہینہ پاکستان اور دیگر ممالک میں ایک خوف ناک حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔ ہر چیز تقریباً نارمل حالت میں تھی جب اچانک چائینہ کے شہر ووہان کے بارے میں ایک عجیب و غریب رپورٹ شائع کی گئی کہ وہاں ایک نیا وائرس بنام Corona پھوٹ پڑا ہے اور کئی لوگ مبتلائے مرض ہو گئے ہیں۔ الگ ڈاؤن ہو گیا ہے اور یہ خطرناک مرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ (ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک طے شدہ منصوبہ تھا۔ اچانک ہی سارے ممالک میں لاک ڈاؤن، احتیاطی تدابیر، پروازیں بند، کاروبار بند اور مساجد، مدارس، گرجے ہر چیز بند کر دی گئی۔ لوگ گھروں میں مقید وغیرہ وغیرہ۔ کئی مولوی حضرات کے فتوے اور حکومتی اقدامات کے حق میں تقاریر وغیرہ اور خوفناک انداز میں خبریں مثلاً اتنے مریض بن گئے، سنے فوت ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ معاملہ مٹی جون تک

ہے۔

(c) کورونا سبزی منڈی نہیں جاتا؟ گوشت کی دکان پر نہیں جاتا؟ ہفتہ اتوار سوکر گزارتا ہے۔ اگر جاتا ہے تو صرف مسجد میں اور وہاں سے صفیں اٹھا دی جاتی ہیں۔ واہ..... عقل مندو!

(d) گلیوں دسڑکوں پر کلورین کا سپرے کرایا جاتا ہے جو کہ دیکھنے میں نہایت بھلی بات لگتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت زہریلی اور مہلک گیس ہے جو کہ دماغ اور پیچھڑوں کو آؤف کر دیتی ہے اور جب یہ ہوا میں شامل ہوئی تو تمام لوگوں، چرند اور پرند کے لئے بھی خطرناک ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی سائنس کے میچر سے پوچھ لیں۔ جب سپرے شدہ اشیاء پرندے اور دیگر جانور کھائیں گے تو وہ مریں گے یا نہیں؟

(e) کورونا کی احتیاطوں میں شامل ایک مزے کی بات یہ ہے کہ 20 سینڈ تک کئی بار ہاتھوں کو صابن سے دھوئیں یعنی صابن کی Sale بڑھے گی اور پانی کتنا استعمال ہو گا جب کہ پاکستان پہلے ہی پانی کی کمی کا شکار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سازش ہی لگتی ہے۔

(f) اب ماسک ہر بندے کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے کرتا دھرتا افراد تو اسے ہی میں بیٹھتے ہیں، گرمی میں اس کا استعمال غریب عوام کیسے کریں گے۔ یہ انہوں نے نہ سوچا لیکن ماسک کی Sale تو کروا دی نا۔ اسی طرح Sianitizar اور Ventilater کی Sale کا معاملہ ہے۔

(g) اب ایک سنگین معاملہ (SOP) کا یہ ہے کہ اگر کوئی اس بے نام مرض سے مرتا ہے تو اس کی لاش بھی غائب۔ اب چیف جسٹس صاحب کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ لاشیں کہاں جاتی ہیں؟ کون سی ایجنسی لے جاتی ہے اور کہاں تجربات کرتی ہے۔ یہ

جس دن سے یہ خبر ملی دی سے نشر کی گئی اس دن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ جھوٹ گھڑا گیا ہے کیونکہ میڈیکل سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جس طرح ایک شخص کی کچھ خصوصی علامات ہوتی ہیں مثلاً شکل، رنگ، قد، عادات وغیرہ اسی طرح امراض بھی اپنی اپنی خصوصی علامات (Sing s & Symptoms) رکھتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بار بار بدلتے ہیں (یہ کوئی جادو کا کھیل تو ہے نہیں) مگر ہر روز نیا بیان، نئی شکایں، نئی علامات، واہ بھئی واہ! پاکستان میں جو اقدامات ہوئے اور نتائج ظاہر ہوئے ان کے بارے میں بھی پڑھ لیں تاکہ مزید وضاحت ہو سکے۔

(1) تمام O.P.D بند کر دیئے گئے۔ اب وہیں وہ مریض کہاں جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یا تو پرائیویٹ ہسپتال میں جائیں یا پھر کورونا وارڈ۔ اب دل کے مریض کو مشنٹ تو نہ لگا اس کو Ventilator پر ڈال دیا۔ ظاہر ہے وہ سب تک جئے گا۔ مرے گا تو ”کورونا“ بن جائے گا بات ختم۔

(2) اس بارے میں جو SOP بنائے گئے وہ بھی بڑے حیران کن ہیں اور نہایت قابل احترام سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس صاحب نے بھی کئی سوال اٹھائے مثلاً

(a) ہمارے حکومتی اعداد و شمار کے مطابق اس وقت صرف محدود تعداد میں مریض ہیں جن پر ایسوں کھڑیوں روپ لگائے جا رہے ہیں۔ کہاں اور کیسے، کچھ معلوم نہیں۔

(b) دیگر امراض سے اموات (مثلاً کینسر، مارٹ ٹیک اور ہائی بلڈ پریشر اور ٹی بی وغیرہ سے) ٹہیں زیادہ ہوتی ہیں مگر وہاں کوئی لاک ڈاؤن نہیں بلکہ ان سب مریضوں کو بھی کورونا کے کھاتے میں ڈالا جا رہا

اب ایک نئی بات سامنے آ رہی ہے کہ جو شخص بھی باہر جائے گا ”نام نہاد کورونا“ ٹسٹ کروانے کا چر کہ 6500 روپے کم از کم فیس میں ہوگا۔ تو کتنا مال اکٹھا ہو سکتا ہے۔ یہ فارمولا مزید وسعت اختیار کرے گا۔

اس سلسلے میں ایک رپورٹ ماہنامہ ”احرار نامہ“ شمارہ جولائی 2020ء میں شائع ہوئی ہے جس کے پیشہ پوائنٹ درج کر رہا ہوں۔ (دروغ بگردن راوی)۔

(1) یہ ایک امریکی منصوبہ ہے۔ دنیا پر راج کرنے کا جس کے بانی کے ہنری کسنجر، جارج اور ویر اور بل گئیس جو کہ کئی فارماسیوٹیکل کمپنیز کے مالک ہیں، وہ دنیا میں ”آن دیکھے مرض کا خوف پیدا کر کے اور نام نہاد ویکسین اور ایسی ہی مشینری جو کہ ان کی مرضی کے رزلٹ دے، دنیا پر راج کرنے اور پھر دنیا کو بے روزگار کر کے ان کو Lock Down سے گھروں میں بند کر کے اور ان کے استعمال میں نہ آنے والی اشیاء بیچ کر ان کو مزید غریب سے غریب اور اپنے تلخے پھسانے کا منصوبہ ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ بل ٹینس نے ویکسین ”اگاسٹ کے نام سے دنیا کی سب سے بڑی شراکت دار کمپنی “Gavi” کے نام سے قائم کی اور اس کے لئے 750 بلین ڈالر مہیا کئے۔ یہ ایک ڈرگ مافیا ہے جو کہ بظاہر ہر مرض کی ویکسین بنائے گا (کورونا کی فی الحال ویکسین بھی نہیں بنی مگر اس کو Pass کرانے کی زبردست جدوجہد ہو رہی ہے۔ کیسی جی رانی کی بات ہے کہ جو چیز موجود نہیں اس کے لئے کوششیں لیجنم جیسے کورونا موہو، نہیں مگر اس کا خوف پیدا کر کے متعلقہ سامان کی خرید و فروخت اور ملکوں کے کاروبار کا بھٹ بٹھایا جا رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ سپریم کورٹ میں بھی معاملہ گیا مگر کسی نے Pursue نہیں کیا۔

بات صیغہ راز میں ہے اور شاید ہمیشہ ہی رہے گی۔ (h) ماہرین معاشیات یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ملک کا کاروبار اگر بند کر دیا جائے تو کتنا Loss ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہر ملک Revenue سے ہی چلتا ہے جو کہ کاروبار سے حاصل ہوتا ہے تو ہمارے ملک کا کتنا نقصان ہوا خود ہی اندازہ کر لیں۔

یہ ہیں وہ بھیجا تک حقیقتیں جو کہ اندھا دھند تقلید کی وجہ سے پیدا ہونے لگی جو مشکلات لوگوں کو ہونیں جو Loss or Revenue سرکاری محکموں کو ہوا وہ الگ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ میں محترم جناب وزیراعظم پاکستان کی رائے سے شفق ہوں کہ ایسے ملک ڈاؤن وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی جس نے عوام کو بے حال اور ملک کو بد حال کر دیا اور کئی کمپنیوں اور صاحب اقتدار سیاستدانوں نے بے حساب کمائی کی۔

حدیث قدسی میں ہے کہ ہم نے کوئی ایسا مرض نہیں اتارا جس کی شفا نہ اتاری ہو۔ اب کورونا کا ڈرامہ کتنا ہے کہ (1) یہ مرض بغیر علامات ہے۔ (2) بغیر علاج ہے۔ (3) ویکسین کب بنے گی پتہ نہیں۔ تو یہ بات حدیث کے خلاف ہی ہوئی نا؟ مزید

مزید بات یہ ہے کہ ہفتہ اور اتوار کو کورونا صاحب چھٹی پر ہوتے ہیں اور پتہ نہیں اسے یہ چھٹی کون دیتا ہے۔ جمعہ کو کورونا صاحب پورے زور پر ہوتے ہیں۔ دراصل سمجھداری کی بات ہے سیدھی سی کہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی پہلے ہی پورے یورپ میں ہوتی ہے اور وہ (1) ہاتھ نہ ملانا، (2) دستانے اور ماسکس اور اب مذکورہ چھٹیاں دراصل پاکستانیوں کو یورپی ڈھب پر لانے کی ترکیب ہیں۔ ہفتہ یہودیوں کا متبرک دن ہے اور اتوار ہمارے محترم عیسائی بھائیوں کا۔ تو اس طرح ہم بھی ان کے ساتھ ہی مل جائیں گے۔

ہے وہ کسی کی نظر میں نہیں ہے۔ اگر صرف آرام ہی کرنا ہے اور مرض ختم تو پھر ویکسین کی تکلیف کیوں کرنی ہے؟ یعنی خانا خانا کا خرچہ۔

دوبان لیبارٹری کو امریکہ کے وہابی امراض کنسلٹنٹ کرنے والے ادارے کی جانب سے امداد دی جاتی ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر وکس ہیں جو کہ ملک میں سب سے بڑے دوست اور بیمار ہیں۔ اب ان کا لکھ جواز کھینچ لیا گیا ہے کہ یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کر رہے ہیں اور ان کی ٹرانسپاں اور انٹرا سٹراشیر ایک طے شدہ حیل کا حصہ ہیں۔

یہ کتنی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ جو چیز دنیا میں شاید ہی نہیں ہو اس کے پیچھے ساری دنیا کو پاگل کر دیا گیا ہے۔ کاروبار، مزدور اور کاروباری طبقہ برباد ہو رہا ہے مگر سب کے ذہن، کلیں کی فوجیں، چھوٹے میڈیکل بورڈ بے شمار اسی طرح ہیں ان کے لئے کون سا

یہ ڈرگ مافیا جو کچھ کر رہا ہے محض اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے کر رہا ہے۔ اس کے ایک سرے پر وائرس کا خوف اور دوسرے سرے پر ویکسین کی Sale ہے، بس اور کچھ نہیں۔ جس کی بنیاد جعلی مفرہ ہے، جعلی حل اور زبردستی ایک ڈاؤن پر ہے۔

ایک ٹیب حقیقت یہ کہ اگر کسی غریب کو ٹاسم نہاد کورونا ہوتا ہے تو اس کی لاش بھی SOP کے مطابق نہیں ملتی مگر جب یہ مرض ایک امیر کو ہوتا ہے تو وہ نہیں نہیں جاتا، کوئی دوا بھی نہیں لیتا۔ پھر ایک دو ہفتے کے بعد دانت نکال کر واپس آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ”دیکھا میں نے کورونا کو شکست دے دی“۔ کیسا لطیفہ ہے، تا مزید۔

آج بھی، مگر کسی کورونا سینٹر میں جائیں تو ڈاکٹر سپینہ مریض کو کوئی دوا ہی نہیں دیتے صرف آرام اور نگہبانی ہی اوفرموئے ہیں اور اس کی آڑ میں جو کرپشن

ISO 9001:2008

النورین

رجسٹرڈ

النورین لیکچرنگ اینڈ سٹریٹ 75-B، شمال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، انجرات

053-3726024, 053-3726026, 0300-9702203

<http://www.alnoorfans.com>

پھیلاتا بھی ایک سنگین جرم ہے کیونکہ جتنی تیزی سے وہ امراض کا پھیلاؤ بتاتے ہیں اس طرح تو کلیوں اور سرخوں پر لاشیں ہی لاشیں ہونی چاہئیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب مرنے والوں کی تعداد بہت کم بتائی جاتی ہے اور تو اور مردے دفن کرنے والے بھی تقریباً بے روزگار ہو گئے ہیں۔ مگر میڈیا ہے کہ ایک ہی مزدوری پر لگا ہوا ہے بغیر سوچے۔ وہ ایک مثال ہے کہ کسی شخص پر ایک جگہ بجلی کی Heavy Tnson تار گر پڑی تو وہ خوف سے مرنے لگ گیا کہ اب مرا اور تب مرا۔ پھر اسے یاد آیا کہ بجلی تو ایک بجے سے بند ہے اور دو گھنٹے کے بعد آئے گی۔ تب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پٹرے چھاڑ کر اپنی راہ چلا گیا۔

اگر آپ سب حالات کو میڈیا کی باتوں سے ہٹ کر دیکھیں تو ہر جگہ عجیب حقیقتیں نظر آئیں گی۔ آنکھ والوں کے لئے عبرت ہے۔

ایک اہل حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ فرضی دواؤں کو ردنا ایجاد کرنے والوں کو خود بھی پتہ نہیں کہ اس جھوٹ کو بچ کیسے بنانا ہے۔ لہذا وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے جا رہے ہیں۔ کبھی کوئی بیان بازی، کبھی کسی ڈرامہ بازی کا سہارا لیتے ہیں مگر چھپ نہیں پائے۔ اگر محترم چیف جسٹس اور وزیراعظم صاحب منصفانہ انکوائری کرائیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اب ایک مشورہ ہے۔

اگر اب بھی یہ مرض ایجاد کرنے والوں کو سمجھ نہیں آتی تو کسی پاکستانی ڈاکٹر خصوصاً ہومیوپیتھک والوں سے رجوع فرمائیں۔ وہ چند دن میں آپ کو Vaccine بنا کر دے دے گا۔ اگر نیت نیک ہو تو کوئی کام نامکن نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔ ترجمہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔



قانون نہیں بناتا۔ ملک پانی کی قلت کے خطرے سے دوچار ہے مگر اراکانِ اسمبلی اور اشرافیہ کو اپنی جعلی لڑائیوں اور بے کار الزام تراشیوں سے ہی فرصت نہیں۔

ان کی تنخواہیں حال میں جتنی بار بھی بڑھیں ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ کرپشن سے پیٹ نہیں بھرتے مگر ان کو اپنے فرائض اور ملک کی وفاداری یاد نہیں آتی۔ ان کو خدا اور آخرت کے عذاب کا بھی کوئی خوف نہیں۔ کوئی ذمہ داری نہیں لیتا، اگر سب پاک و ایماندار ہیں تو پھر ملک پاکستان اس قدر زبوں حال کیوں ہے؟

چند روز قبل ٹی وی پر ایک مذاکرہ آیا تھا غالباً ARY پر۔ اینکر پرسن نے صاف کہا کہ کورونا سے مرنے والوں میں اکثریت ہارٹ اٹیک، کینسر اور دیگر امراض میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر ٹرمپ صاحب نے بھی چند دن قبل فرمایا، ”کئی ممالک میں کورونا کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو انہیں سٹنٹ ہی نہیں کروانے چاہئیں“۔ کتنی سچائی انہوں نے بیان کر دی ہے۔ ایک غیر مسلم ہو کر اور ادھر ہمارے مسلمان بھائی ہیں کہ بس خدا کی آیات کو بھلا کر ایسے منصوبے کا حصہ بن رہے ہیں۔ صاف لگتا ہے کہ وہ سچ بولنے سے گریزاں ہیں۔

ایک بات اور بھی سوچنے کے قابل ہے کہ یہ مرض اچانک کہاں سے آ گیا اور پوری دنیا میں پھیل گیا۔ ایسے جیسے بجلی۔ اگر بغور دیکھیں تو میڈیا (ٹی وی اور اخبارات) ہی اس کو پھیلانے کا بڑا سبب ہیں پتہ نہیں نہیں انہیں کیا مفادات ملے ہوں گے۔ ورنہ اگر محلوں، گلیوں، بازاروں میں جائیں خصوصاً دیہات میں تو ہر طرف چین ہی چین ہے۔ صرف میڈیا نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے اور اب موبائل کمپنیوں والے بھی اس بے جا خوف و ہراس کو ہر وقت پھیلانے میں شب و روز مصروف ہیں اور ہمارے صاحب اقتدار ان کو پوچھتے تک نہیں۔ حالانکہ ملکی قانون کے تحت ایسی خبریں

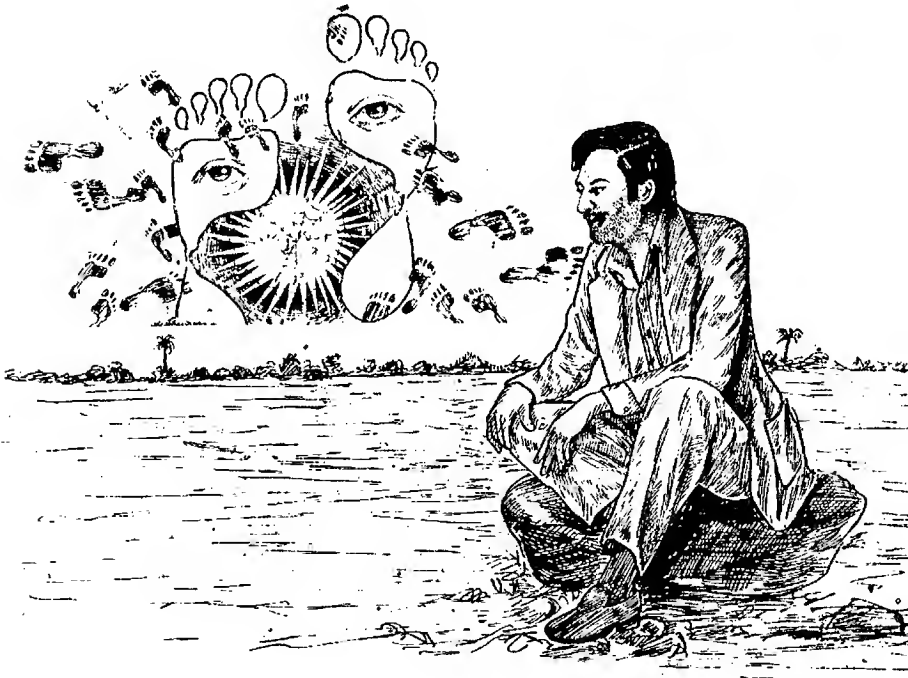
عمر رفته گواہ از دنیا

عمر رفته گواہ از دنیا

نکڑی سے بنے سامان والا ربٹ جب چٹا تو اس کی ”روں روں“ کی آواز کانوں کو بہت بھلی لگتی جیسے کوئی اللہ کی تسبیح اور حمد کر رہا ہو۔

راولپنڈی

☆ محمد زید ملک



ہے کہ زندگی جینے کی سزا دیتی ہے۔ میرے ذہن میں تو ایسے کردار اب بھی بچے، نو جوان، جوان اور تروتازہ چہرے ہیں مگر اب پچاس ساٹھ سال کے وقفے کے بعد ان کی زیارت کرنا کچھ خوشگوار تجربہ نہ رہا۔

ادھر ان کی نظر میں میرا بھی یہی حال ہو گا۔ جیسے ایک کردار کو میں 64 سال بعد ملا ہوں۔ جو میرا چھٹی جماعت کا کلاس فیلو تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے مجھے پہچان لیا اور میرا نام لیا۔ حالانکہ اگر میرے ساتھ میرا بشپیا ارشد حبیب ملک جو وہاں کا بی بی سی ہے، نہ بتاتا کہ یہ آگے آگے گدی پر پہن رکھے جو شخص پانی بھرنے جا رہا ہے یہ آپ کا کلاس فیلو محبوب عالم ہے، تو میں اسے پہچان نہ پاتا۔ اس طرح میرے بچپن کا ایک کردار محمد اصغر عرف کا کو ہوا کرتا تھا، اب وہ جب سامنے سے ہو کر گزر گیا اور میں نے اس پر ایک اپنی سی نگاہ بھی ڈالی تھی تو مجھے سمجھنے نے بتایا کہ یہ کا کو تھا۔ اب چونکہ بھرے گاؤں میں کا کو ایک ہی تھا جو میری یادداشت میں محفوظ تھا تو میرے سامنے کا کو کا وہ چہرہ آیا جو 64-65 سال پہلے کا تھا جو جوڑے والی کبڑی کا ماتا جانا کھلاڑی تھا۔ اتنا تیر کہ کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا اس کے جسم میں گویا بجلی بھری تھی۔ اب اس کا کو کی جو جھک میں نے دیکھی تو مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ یہ کا کو جو جھکی ہوئی خمیدہ کمر لئے، موٹے شیشے کا چشمہ لگائے انھیں مکتے بمشکل قدم اٹھا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ راستہ کے کنارے ہولیا کہ مبادا کسی کی ٹکر نہ لگے۔

”نہیں بار! یہ کا کو کوئی اور ہے۔“ میں نے کہا۔
”وہ نہیں جو میرے بچپن کا کا کو تھا۔“ لیکن وہ سچ سچ کا کو تھا۔

ایک اور کردار جیسی ہتھوڑے سے بن کے پہلو میں زمین میں گڑے بڑے سے پتھر پہ پہلوانوں کی کشتی کی تصویریں بناتا تھا جو بہت ہی دل آویز ہوا

نیاوی غرض وغایت کے حوالے سے بہتر سہولیات کے حصول کے لئے گاؤں، دیہاتوں سے عموماً شہروں کی جانب ہجرت ہوتی ہے۔

انسان بہل پسند ہے لہذا ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہجرت کے لئے شہروں سے گاؤں یا دیہی علاقوں کا رخ کیا جائے۔ ایک بار جو شہر آ کر بس گیا اور وہاں کی زندگی کا عادی ہو گیا تو پھر اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تاہم آج کل کورونا وائرس نے کچھ ایسا خوف جمایا ہے کہ عارضی سہی ہجرت کے لئے شہر والوں کا رخ گاؤں دیہاتوں کی طرف ہی ہے۔ ان کے خیال میں شہر کی نسبت دیہی علاقے زیادہ محفوظ ہیں۔

کچھ اسی خیال کے زیر اثر راقم نے بھی گزشتہ ماہ جون میں گاؤں کی طرف رخصت سفر باندھا اور نہ نہ رستے پورا مہینہ گاؤں میں گزارا۔ جہاں شہروں کی نسبت کم بلکہ تھا شہری زندگی والی نیز رفتاری نہیں دیکھی گئی۔ گو کہ آج کل کے گاؤں دیہات بھی پہلے والے نہیں رہے۔ گلیوں میں لوگ پیدل کم چلتے ہیں کثرت موٹر سائیکل سوار نظر آتے ہیں تاہم گاؤں میں بدشت اتنا وقت گزارنا تک بھگ پچاس ساٹھ سال بعد ہوا۔ یعنی نصف صدی کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ اس سے قبل جب بھی جانا ہوا تو ایک آدھ دن ہی ٹھہرنا ہوا۔ اس دفعہ یہ خیال بھی ہوا کہ ان جگہوں اور مقامات کی زیارت کی جائے جہاں گزشتہ چھ سال سے ماہنامہ ”حکایت“ میں مسلسل لکھی جانے والی ناقابل فراموش کہانیوں اور واقعات نے جنم لیا اور پھر ان جیتے جاگتے سرداروں سے ملاقات کا شوق بھی پورا ہو گا جو ان واقعی کہانیوں کے روح رواں تھے۔ بس یہی شوق ایک بار پھر کشاکش کشاکش گاؤں لے گیا۔

وہاں میری کہانیوں کے انسانی کردار تو خال خال ہی رہ گئے ہیں اور جو رہ گئے ہیں انہیں پہچاننا بھی محال



خبردار کبھی اپنی اولاد اور اموال کے لئے بددعا نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے وقت میں اللہ سے دعا کر بیٹھو جس میں دعا قبول ہو جاتی ہے۔ (سنن ابی داؤد: 1532)

کی کہ ملے بھی اور پھر بچھڑنے کے لئے۔ کہنے لگا۔ ”بھائی جی مٹی دا ہک استھہ ائی لکھیا سی، اس بے چاری دا“۔ بالا صبر کر گیا اور مسجد پکڑ لی۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ ہاتھوں اور گردن میں ہلکا سا عرشہ ہے۔ بالے کے وہ دونوں بچے اب ماشاء اللہ، جوان ہیں وہ بھی مسجد آتے ہیں۔ اب تو ان کے بھی بچے ہیں۔ بالا دادا بنا پھرتا ہے۔

بالے کے دادا قادر بخش کے زمانے میں ہمارا بچپن تھا۔ قادر بخش نے ایک خونخوار لڑاکا کتا رکھا ہوا تھا۔ جو ہر بھیڑی جیت کر آتا تھا۔ وہ جب کتے کو باہر لے جانے کے لئے گلی میں نکالتا تھا تو لوگ خوف کے مارے راستہ سے ہٹ جاتے۔ ہم خود بھی کتے سے بہت ڈرتے تھے۔ جس دن کتا جیت کر آتا تھا تو قادر بخش کے گھر رات گئے تک ڈھول بجاتا اور گولے چھوڑے جاتے۔

جہاہ سے ملاقات

مغرب کی نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے بالے کے گھر کے بالکل قریب ایک دوسرے گھر کے دروازے کے سامنے سر راہ جہاہ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ملاقات بھی 65 سال بعد ہوئی۔ جہاہ سورج غروب ہوتے ہی اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا۔ اس کی کمین گاہ وہ گھر تھا جہاں سے نکلا تھا۔ گوکہ انہوں نے بہت مضبوطی سے کواڑ بند کئے ہوئے تھے اور چھوٹے بڑے سوراخوں

نہیں۔ کافی عرصہ تک وہ تصویریں اس پتھر پر کندہ رہیں اور ہم انہیں نہایت لگن سے دیکھا کرتے تھے۔ پھر وقت کی آندھیوں نے یہ تصویریں مٹا ڈالیں لیکن وہ پتھر اب بھی اسی طرح زمین میں گڑا ہوا ہے۔ میں نے اس بار نتیجے کو دکھایا۔ مگر اس پر تصویر نہ تھی۔ یہ کردار اس دفعہ میرے سامنے سے ہو کر گزر گیا۔ میں اسے بشکل پہچان پایا وہ بھی تب جب وہ مجھ سے آگے نکل چکا تھا۔ پیچھے سے میں نے اسے بہت آوازیں دیں مگر وہ جلدی سے جا کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ جیسے کہہ گیا ہو کہ ”عر رفتہ بھی لوٹی نہیں۔ جا پتھروں سے میری جوانی اٹھا کے لا“۔ اس کا نام احمد ایوب تھا وہ 90 کے پیٹھ میں ہوگا۔ واہ رستہ زندگی !

بعد میں پتہ چلا کہ وہ شعل ساعیت کا بھی شکار ہے۔ اس لئے مہری آواز نہ سن پایا ہوگا۔ کچھ دوست جن سے ملنے کا شوق تھا، اپنے اپنے گھروں میں قریطینہ میں پڑے تھے اور منہ منہ سے گریزاں تھے۔ جان بہ ایک کو پیاری ہوتی ہے۔

ابنہ مساجد میں نو جوان طبقہ زیادہ دیکھنے میں آیا جو کہ خوش آئند بات تھی۔ جوان نمازی زیادہ تھے۔ پہلی صف میں بالا (محمد اقبال) موجود تھا۔ مجھ سے خاصا چھوٹا۔ سفید داڑھی، پکا نمازی، کچھ اعصابی کمزوری کا شکار پایا۔ بالا کی کہانی بڑی دردناک تھی۔ جوانی میں سنی بیوی روتھ کر مینے چلی گئی، ساتھ دچھوٹے چھوٹے بچے بھی لے گئی۔ ایک طویل مدت ناچاقی رہی اور سالوں بعد بالا اس کے گاؤں گیا اور اسے منالایا۔ باے کا ٹوٹا ہوا گھر پھر سے بس جانے پر گاؤں والوں کو دلی مسرت ہوئی۔ مجھے بھی پتہ چلا تو میں نے راولپنڈی سے اسے فون کر کے مبارک باد دی۔ اللہ تعالیٰ کا کرتا تھا کہ اس کے آنے کے ایک ہفتہ بعد وہ اس سے پھر پہلی بچھڑ گئی۔ مجھے جب پتہ چلا تو پھر فون کیا اور تعزیت

اب ان جگہوں اور مقامات کا ذکر جن سے ناقابل فراموش واقعات اور کہانیاں وابستہ ہیں اور وجود میں آئیں۔ ایک حالیہ کہانی ”پانی، پرنا لہ اور پروین“ کے عنوان سے چھپی ہے۔ جو ”حکایت“ کے قارئین نے پسند کی ہے۔ جس میں بڑے کنویں کا ذکر ہے۔ جسے پھر سے دیکھنے کو بے قراری تھی۔ گھروں میں پانی آ جانے کے باعث اب یہ کنواں متروک ہو گیا ہے۔ میں اور میرا بھتیجا نماز فجر سے فارغ ہو کر علی الصبح واک کے لئے دور دراز کے علاقے میں نکل جاتے تھے۔ ایک صبح اس کنویں کو ہو لئے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچے راستہ بہت خراب تھا۔ راستے، راہ چلنے والوں سے آباد رہتے ہیں۔ جب راہ گیر اٹھ جاتے ہیں تو راستے ویران ہو جاتے ہیں۔ ان میں خود رو جھاڑیاں اور کانٹے دار درخت اُگ آتے ہیں۔ یہ وقت تمام کنویں میں جھانکنے کا موقع ملا۔ وہ کنواں جو ٹری کے اس موم میں تہہ تک خشک ہو جاتا، صرف سحری کے وقت جانے پر کچھ پانی حاصل ہوتا۔ دن چڑھے تو خالی کیچڑی ملتا۔ اب اوپر تک بھرا تھا۔ اسے یوں لمبا لب بھرا دیکھ کر بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ ایسا منظر کبھی دیکھا نہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ گاؤں کے نوجوان تیرا لڑکے اس میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ بڑے دل گردے والے لڑکے ہوں گے۔ تیرا کی تو میں نے بھی سیکھی ہوئی ہے اور بن کے پانی میں کی بھی ہے لیکن پانی سے لمبا لب بھرے اتنے گہرے کنویں میں غوطے اور چھلانگیں لگانے والے لڑکوں کو داد دینے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کنویں کے قریب سے ملک کرم داد کا وہ کنواں تھا جس میں پروین گر گئی تھی۔ لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازے کو معمولی سنڈی لگی تھی۔ کھٹکھٹایا مگر کوئی نہ آیا۔ دھکا دینے پر کھل گیا۔ اندر جا گھسے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کنواں دیکھا ننڈی کی مالا اور دیگر سامان کی جگہ سب جگہ لوہا لگا تھا۔ فوراً

کو پہلے کے کھڑے ڈال کر بند کیا گیا تھا لیکن جھانک یہ خاصیت ہے کہ یہ تنگ سے تنگ سوراخ سے بھی پتلا اور لمبا ہو کر نکل لیتا ہے (حیران کن حد تک)۔ مجھے دیکھتے ہی ٹھنک اور ڈک گئی۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ چوبے کی طرح جھانک جائے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پاؤں لگایا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیسے گزر رہی ہے؟ اس نے فوراً گیند بن کر بتلا دیا کہ ”ایسے“۔ اب کراؤ جو میرا کرتا ہے۔ اس کا مطلب کہ وہ فطری زندگی گزار رہا ہے۔

جھانک بہت شرمیلا سا جانور ہے۔ آدمی کو دیکھ کر ہنستا نہیں بلکہ وہیں پر اپنا منہ گود میں چھپا کر گیند بن جاتا ہے۔ جب تک خطرہ مل نہیں جاتا وہ اندر سے منہ نہیں نکالتا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی فطرت وہی عادت اس کی یہ ادا اچھی لگتی ہے۔ ہم اسے اٹھا کر جھولی میں ڈال لیتے تھے اور اس کے کانٹوں سے جھولی میں چھنکی کی طرح چسید ہو جاتے تھے۔ دل چاہا کہ ایک بار پھر اس کو جھولی میں ڈال لوں مگر رستے سے لوگ گزر رہے تھے۔ سو چاہہ کیا نہیں گئے کہ بقول محترم بھائی صدیق صاحب جنڈ والے کہ اس پٹھو باری بابے کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ بھی کوئی اٹھانے والی چیز ہے۔ کانٹوں سے بھر ابدن، کالا کلونا، بغیر دم کے۔

نماز پڑھ کر آیا تو وہ وہیں پھر رہا تھا۔ اب کی بار میں نے اسے نہ چھیڑا وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ اندر سے دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے لے چلوں اور پٹھو باری کی سیر کراؤں۔ راولپنڈی آ کر پتہ چلا کہ سامنے 4-10-1 والے پارک میں مغرب کے وقت دیکھے جاتے ہیں وہ جھانک۔ حیرت ہوئی کہ نصف صدی گزر گئی اس بچپن کے دوست سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جون 2016ء میں نکھی جانے والی میری کہانی ”دگوہ کا کھمنڈ“ میں جھانک سے دوستی کا ذکر ہے۔

ساب اور سپہران“ جنوری 2015ء کی بہترین کہانی تھی۔ اس کا تعلق گندھالہ کے نیگلوں پہاڑیوں والے جنگل سے تھا۔ گندھالہ جانا نہیں ہوا۔ گاڑی جانے کا راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ ”سونے والی بن کا خونی معرکہ“ جولائی 2014ء۔ کتے لڑاتے لڑاتے ہندے آپس میں لڑ پڑے اور چار قتل ہو گئے۔ دو کتے بھی مارے گئے۔

”جب بیٹی ماں کی بہو بنی“ اگست 2014ء میں لکھی گئی۔ بھرپور تاثر والی کہانی رہی۔ اس کے تمام کردار اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ”بھلا موئے تے دچھڑے.....“ اگست 2016ء کی ناقابل فراموش کہانی تھی۔ اس طرح ”آزادی کی جیت“ اگست 2015ء۔ ”جنگ اور جذبہ“ برائے سالگرہ نمبر ستمبر 2015ء۔ ”بارش، برگد اور عورت“ مئی 2019ء سراسی گئی۔

مل ملا کر اب تک 42 کہانیاں لکھی گئیں۔ جو قارئین ”حکایت“ نے پسند کیں، یہ میرا اثاثہ ہے۔

مدیر ”حکایت“ جناب عارف محمود صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے انہیں قابل قدر سمجھا اور میری رہنمائی فرمائی۔

محترم اعجاز حسین سٹھار صاحب، جناب محمد صدیق جند والے، میری کہانیوں پر اظہار خیال فرماتے ہیں اور اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

قارئین کے فون بہت آتے ہیں۔ ان کا بھی احسان مند ہوں۔ کہانی خود بتا دیتی ہے کہ اس میں آدھا سچ ہے یا پورا۔ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ آدھا سچ نہ ہو۔ باقی سچی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سچ بولنے، سچ لکھنے اور سچ کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

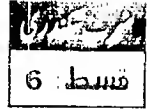


بے اور سڑک کنارے واقع ہے۔ جہاں سے مٹی خود کر گاؤں والے اپنے گھروں کی چھتوں کی لپائی کرتے تھے۔ آج اس بن میں ملحقہ سینٹ فیکٹری کا فضلہ پھینکا جا رہا ہے۔ سینکڑوں اس کی مٹی کی ضرورت نہیں رہی اور فینڈ کی دالوں کو اس کی ضرورت تھی، وہ اسے کام میں لے آئے۔

اپریل 2016ء کے شمارے میں ”میاں جی کی ناگنی“ کا بڑا غفلہ تھا۔ یہ کہانی کسی الف لیوی داستان کی طرح دلچسپ تھی۔ میاں جی تو زمانہ ہوا اس دنیا سے اٹھ گئے اب ان کے پوتے بھی جوان ہیں۔ یہ سارا کنبہ حفاظ کرام کا ہے۔ میاں جی کے جانے سے ناگنی بھی ان کے گھرت اٹھ گئی ہے۔ میاں جی کے گھر کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے۔

ستمبر 2016ء کے شمارے میں کہانی ”وہ دشمن نے مورچوں میں شہید ہوا“ چھپی۔ اس میں میرے دوست اور کلاس فیلو سپاہی محمد اسلم شہید کی داستان شہادت رقم کی گئی ہے۔ محمد اسلم نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں مادر وطن کے دفاع میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر کے شہادت کا اعلیٰ رتبہ حاصل کیا۔ محمد اسلم شہید کے گھر کے سامنے سے گزر ہوا جیسے وہ اب بھی کہہ رہا ہو۔ ”اندر آ جاؤ نذیر! میں تمہیں کریلوں کی مٹی پر کئے خوبصورت پھول کھلے دکھاتا ہوں“۔ یہ بیل محمد اسلم نے اپنے گھر کے سامنے کی دلیلیز کے بالکل سامنے لٹائی ہوئی تھی۔

”مقبرے والی رات“ جنوری 2018ء یہ میری اپنی پسندیدہ کہانی ہے۔ یہ مقبرہ موضع مٹھال (Maghal) سے ملحقہ پہاڑی پر واقع ہے۔ گاؤں آتے جاتے اس پر نظر پڑ جاتی ہے۔ اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ فیکٹ نہیں رہا۔ نہ جانے ہماری اس بہن یہ حال ہے۔ بہت وقت گزر چکا ہے۔ ”سرنگ“



سائنس مشرقی پاکستان

ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر سے کئے عالم میں تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ امداد اس طرح بھیجی جائے؟ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر C-130 جہاز تیار رکھا گیا۔

ملتان

balochsk@yahoo.com



چٹا گانگ ایئر پورٹ کا قبضہ

فوجی نقطہ نظر سے میں جب بھی مشرقی پاکستان میں بنگالی بغاوت اور ان کی کاروائیوں کا تجربہ کرتا ہوں تو ایک بات جو واضح طور پر متاثر کرتی ہے وہ ہے ان لوگوں کی نفسیاتی منصوبہ بندی۔ اس ساری منصوبہ بندی کا خالق کون تھا۔ یہ وقت ضرورت عملدرآمد اس نے سرایا اور پورے مشرقی پاکستان میں فوری رابطے کا نظام کس طرح قائم کیا گیا، بہت غور طلب عوامل ہیں جو کسی بھی فوجی منصوبہ ساز کے لئے حیران کن ہیں۔ یہ منصوبہ سازی اتنی تفصیلی گئی کہ کوئی بھی اہم مقام نہ چھوڑا گیا اور بغاوت کی کاروائی ایک ہی وقت میں پورے مشرقی پاکستان میں شروع ہوئی۔ جگہ مغربی پاکستانی ٹروپس انجانے میں پکڑے گئے اور بہت نقصان اٹھایا۔ انہیں اس بغاوت کا شک و شبہ نہ تھا۔ یہ خیال نہ تھا کہ پوری بنگالی فوجیں، ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ پاکستان پولیس یکدم پاکستانیت کا لبادہ اتار چھینیں گے اور آسانی سے بنگلہ دیش بن جائیں گے۔

کچھ لوگوں کے دل میں یہ بھی غلط فہمی تھی کہ ہماری ایک دوسرے کے ساتھ برسوں کی رفاقت ہے۔ فیملی تعلقات ہیں۔ ہارڈ شپ کی صورت میں دوستیاں ہیں۔ جدوجہد آزادی میں اکٹھے تھے۔ 1965ء کی جنگ میں مل کر بہادری کے خلاف لڑے ہیں اور یہ مضبوط رشتے یوں یکدم ٹوٹ جائیں گے۔ یہ بنگالی ٹروپس ہمارے خون کے پیاسے ہوجائیں گے، اس کی امید نہ تھی۔ بنگالی ٹروپس نے باہمی اعتماد کا لبادہ آخر تک اوڑھے رکھا جس وجہ سے مغربی پاکستانی ٹروپس مشرقی پاکستانیوں کے خلاف آخری لمحے تک متدبذ نہ ہو سکے اور کسی قسم کی فوجی کاروائی کی منصوبہ بندی نہ ہو سکی۔ جب اچانک ہر طرف سے گولیاں برسنی شروع

ہوئیں۔ لاشیں اٹھانی پڑیں تو ہوش آیا کہ بنگالی ٹروپس کے خلاف فوجی کاروائی کی جائے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بھارتی کمانڈوز اور "را" اپنے پہنچے گاڑ چکے تھے۔

چٹا گانگ کے حوالے سے بھی تفصیلی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ کتنی ہائی ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ پاکستان پولیس کے مابین گہرا رابطہ تھا۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ بغاوت کے وقت اس نے کہاں ہونا ہے اور کیا کاروائی سرانجام دینی ہے۔ بریگیڈ میجر مجاہد ار کی گرفتاری کے بعد سارا کنٹرول میجر ضیاء الرحمن نے سنبھال لیا۔ جونہی اس نے بغاوت کی کال دی تمام لوگ پہلے سے مقرر کردہ ہندوئی کاروائی میں مصروف ہو گئے۔ شہر کے تمام اہم مقامات یعنی ایر پورٹ، ریڈیو سٹیشن، ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور واپڈا وغیرہ کے دفاتر پر قبضہ کر لیا گیا۔ میجر ضیاء الرحمن کی راہنمائی میں شہر کا کنٹرول کتنی ہائی نے سنبھال لیا۔ چٹا گانگ کو باہر سے ملانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی کر لی گئی اور بنگالی ٹروپس کو مغربی پاکستانی فوج سے لڑنے اور میزموں پر پاکستانی فوج کے خلاف لکھائیں لگانے کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ جو انہوں نے بہت دلیری اور جوش و جذبے سے سرانجام دیئے اور پاکستان فوج کو گہرے رخ رکھا۔

چٹا گانگ ایر پورٹ اہم ترین مقامات میں سے ایک تھا۔ اس پر 25 مارچ کو کتنی ہائی اور ایسٹ پاکستان پولیس نے قبضہ کر لیا کیونکہ اس وقت تک مغربی پاکستان سے فوجی یونٹس مشرقی پاکستان پہنچنا شروع ہوئی تھیں۔ لہذا ایئر پورٹ کا فوری قبضہ بریگیڈیوں کے لئے ضروری تھا تاکہ کوئی فوجی یونٹ وہاں پر اتاری نہ جاسکے۔ بنگالی غلام دیسے ہی وہاں سے بھاگ گیا جو چند ایک بہاری تھے یا تو قتل کر دیئے گئے یا اغوا کر لئے گئے اور کچھ اپنی جان بچانے کے لئے جہاں ممکن ہو۔ کا چھپ گئے۔

پاکستان رجمنٹل سنٹر کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ یہ سنٹر شہر۔
 نئی میل دور تھا۔ خوش قسمتی سے چٹاگانگ نیول بیس
 پر کچھ مغربی پاکستانی نیول دستے موجود تھے۔ لہذا فوری
 طور پر نیوی کی مدد حاصل کی گئی اور نیوی نے لیفٹیننٹ
 کمانڈر اختر بلوچ کی زیر نگرانی ایک دستہ روانہ کیا۔ اختر
 بلوچ کا تعلق بنیادی طور پر تو ”سب میرین“ گروپ سے
 تھا لیکن کمانڈو ٹریننگ بھی حاصل کر رکھی تھی۔ وہ آرام
 سے اپنے جوانوں کے ساتھ ایرپورٹ پہنچا۔ مغربی
 پاکستانی JCOS کو ساتھ لیا اور کنٹرول ٹاور کے پاس چلا
 گیا۔ بغیر کوئی مسئلہ کھڑا کئے ہوئے اپنے حواس قابو میں
 رکھے اور سیدھا بنگالی ٹروپس کے پاس گیا۔ احتیاطاً کچھ
 نو جوانوں نے خصوصاً مغربی پاکستانی NCOS نے
 LMGs کی پوزیشنز لے رکھی تھیں جو ایمر جنسی حالات
 میں کارروائی کر سکتی تھیں۔

ایسے حالات میں بے جا بہادری دکھانے کی
 بجائے ہوش اور عقلمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمانڈر
 اختر نے نہایت ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ اس نے موقع پر
 پہنچ کر تمام بنگالی ٹروپس کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ
 ہمیں آپ لوگوں کی جگہ لینے کے لئے بھیجا گیا ہے اور وہ
 بلاچوں و چراں عمارات سے باہر آ گئے۔ جب کمانڈر اختر
 کے لوگوں نے اہم پوزیشنز سنبھال لیں تو اس نے بنگالی
 ٹروپس کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار ایک جگہ رکھ کر تاحکم ثانی اندر
 آرام کریں چونکہ آپ لوگ تھک چکے ہیں اور نیوی کے
 ٹروپس تازہ دم ہیں لہذا وہ ڈیوٹی دیں گے۔ بنگالی ٹروپس
 بغیر شک کے ہتھیار رکھ کر اندر چلے گئے۔ کمانڈر اختر نے
 کمرے کی کنڈی بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا اور ان
 لوگوں کے اوپر گارڈ تعینات کر دی۔ کمانڈر اختر بلوچ کی
 دلیری اور حاضر دماغی کام آ گئی۔

دوسرے دن کیپٹن سجاد کو ایک دستہ دے کر
 انرپورٹ بھیجا گیا۔ کیپٹن سجاد کا تعلق کمانڈو گروپ سے

مغربی پاکستانی فوج کے لئے ایرپورٹ کا قبضہ اہم
 رہا۔ بداف میں سے ایک تھا۔ لیکن قبضے کے لئے ٹروپس
 نہ تھے۔ جلدی میں نزدیک ترین بارڈر سے ایسٹ
 پاکستان رائفلز کا ایک بھاری دستہ منگوا دیا گیا۔ کسی کو یہ
 ہوش نہ تھا کہ ایسٹ پاکستانی تو ہمارے خون کے پیاسے
 ہو چکے ہیں۔ انہیں وہاں نہ بھیجا جائے یا انہیں کم از کم
 مغربی پاکستانیوں سے علیحدہ کر لیا جائے۔ بہر حال اس
 دستے کو بغیر سوچے سمجھے بھیج دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس
 دستے میں دو مغربی پاکستانی صوبیدار اور چند ایک
 NCOS بھی تھے۔ بھلا ہوا ان لوگوں کا کہ انہوں نے
 حالات قابو میں رکھے۔ انرپورٹ پہنچتے ہی مغربی پاکستانی
 NCOS نے نہایت ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے
 LMGs اپنے پاس رکھ کر اہم جگہوں پر پوزیشنیں لے
 لیں۔ بنگالی ٹروپس کو آگے کنٹرول ٹاور اور ہائی جگہوں پر
 قبضے کے لئے بھیجا گیا لیکن انہیں مسلسل LMGs فائرنگ
 زد میں رکھا۔ مغربی پاکستانی JCOS نے بھی اہم کردار
 ادا کیا اور مزید خوش قسمتی یہ کہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے
 ان جوانوں کو تاحل بنگالی بغاوت کے وقت کا علم نہ
 تھا۔ یونٹ مکمل بغاوت 25/26 مارچ کی رات کو شروع
 ہوئی۔ ان دستوں کے پہنچنے ہی آتی ہائی اور ایسٹ پاکستان
 پولیس کے اوک چپکے سے غائب ہو گئے لیکن اب ایسٹ
 پاکستان رائفلز کے جوانوں کی وہاں پر موجودگی مزید
 خطرناک تھی۔ وہ کسی وقت بھی بغاوت کر کے ایرپورٹ کا
 مکمل قبضہ حاصل کر سکتے تھے۔

بنگالی ٹروپس اگرچہ شہ میں ہونے والی بغاوت
 سے علم تھے لیکن انہیں زیادہ دیوہاں رکھنا خطے سے
 خالی نہ تھا خصوصاً جبکہ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ انہیں
 حالات کا علم کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ بد قسمتی سے اس
 وقت فوجی ٹروپس نہیں بھی میسر نہ تھے۔ پورے چٹاگانگ
 میں صرف 20 بلوچ رجمنٹ موجود تھی اور وہ ایسٹ

تھا۔ ہڈلاس نے ایرپورٹ کا کنٹرول سنبھال لیا اور میڈرائٹر کے دستے کو واپس بھیج دیا۔ ایرپورٹ کے ایئر ٹیکنیکل سٹاف کو مشکل سے تلاش کیا گیا اور مکمل قبضہ اور فضائی رابطہ 29 مارچ کو بحال ہوا۔

جب ہر لمحہ موت کا پیغام دینے لگا

جنگ میں وقت سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بروقت اقدامات بڑے سانحہ سے بچا سکتے ہیں جبکہ سستی یا دیری تباہی کا موجب بن سکتی ہے۔ جنگ میں ایک لمحہ قسمت و فتح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایسے لمحات آئے جب زندگی اور موت کے درمیان محض لمحات کی بات رہ گئی۔ ایسا ہی ایک موقعہ 29 مارچ 1971ء کو پیش آیا۔ ڈھاکہ کے بعد چٹاگانگ مشرقی پاکستان کا اہم ترین شہر تھا اور سب سے بڑی بندرگاہ بھی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ یہاں بنگالی فوج سب سے زیادہ تھی اور مغربی پاکستان کی محض ایک بوچی رجمنٹ۔ سب سے سینئر مغربی پاکستانی فوجی آفیسر بریگیڈیئر ایچ بیج انصاری تھا جو اس وقت وہاں کا ایڈفٹ کمانڈر تھے فوجی اصطلاح میں عام طور پر ”کے ایم بی“ کہتے ہیں۔ بریگیڈیئر انصاری نے چٹاگانگ کے بچے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ درحقیقت چٹاگانگ بچا ہی انہی کی وجہ سے تھا۔ اس لئے فوری طور پر انہیں جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ایک ڈویژن کی کمان سونپ دی گئی۔ آنے والے مشکل حالات میں بھی ان کا کردار بہت اہم رہا۔

جو بھی 25 مارچ کو فوجی کا روائی کا فیملہ ہوا تو بنگالی یونٹوں اور غیر فوجی تھیںمیں کے جوانوں نے بغوت شروع کر دی۔ جس کی پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ ہذا 27 مارچ کی رات کو میجر ضیاء الرحمن نے چٹاگانگ ریڈیو پر بگلہ دیش کا اعلان آزادی کر دیا۔ خود آزاد بگلہ

دیش فوج کے کمانڈر انچیف کے فرائض سنبھال لئے۔ پورے شہر میں مکتی باہنی کے لوگوں نے کنٹرول سنبھال کر قتل و غارت شروع کر دی جس کی مکمل منصوبہ بندی پہلے سے ہی کر رکھی تھی۔ ایسٹ بنگال رجمنٹس، ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹل سنٹر اور ایسٹ پاکستان پولیس کے لوگوں نے شہر بیل کر دیا تاکہ باہر سے کوئی مدد نہ آ سکے اور شہر کے اندر سے بچ کر کوئی باہر نہ جاسکے۔ باغی ہونے والی یونٹوں اور جوانوں نے تمام اسلحہ اور اسلحہ خانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ حالات یکدم بہت خراب ہو گئے۔ ایسا نظر آتا تھا مغربی پاکستانی سویلین اور بہاریوں کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستانی فوج میں سے بھی شاید کوئی زندہ نہ بچ سکے۔ ان مشکل حالات میں بریگیڈیئر انصاری نے چٹاگانگ میں موجود تمام مغربی پاکستانی ٹروپس کی کمان سنبھال لی۔ ایتر حالات کا ادراک کرتے ہوئے ڈھاکہ باہنی کمان نے نزدیک ترین جھاؤنی کو میلا سے 53 بریگیڈ کو 26 مارچ کی صبح ہی روانگی کے احکامات جاری کر دیتے تھے اور بریگیڈ روانہ بھی ہو گیا۔ اس بریگیڈ میں صرف ایک انفنٹری یونٹ 24 فریئر فورس رجمنٹ تھی۔

کو میلا سے چٹاگانگ تک پیدل تین دنوں کا راستہ تھا۔ راستے میں مکتی باہنی کے لوگوں نے تمام پل جلا دیے تھے۔ باغی بنگالی سپاہیوں نے جگہ جگہ تارے لگا رکھے تھے۔ اس طرح بریگیڈ کی نقل و حرکت بہت مشکل ہو گئی۔ ان سب مشکلات کے باوجود بریگیڈ مسلسل چٹا 28 کی رات کو چٹاگانگ کے گرد و نواح میں پہنچ گیا۔ کو میلا روڈ پر ایسٹ پاکستان رائفلز سنٹر کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت تھی۔ اس سے ایک کلومیٹر پیچھے کو میلا کی طرف قرہ نامی گاؤں کے پاس میجر ضیاء الرحمن نے بہت بڑا ٹانک لگا رکھا تھا۔ ان جوانوں کو حکم تھا کہ کسی قیمت پر 53 بریگیڈ کو چٹاگانگ داخل نہ ہونے دیا جائے۔ لہذا یہاں شدید لڑائی ہوئی۔ 24 ایف ایف کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ

مکمل عدم واقفیت کی بنا پر کوئی تفصیلی منصوبہ بندی بھی نہ ہو سکی۔

کرنل محمد سلیمان کو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ ناکہ لگائے گئے علاقے میں تھوڑا پہلے شہر کی طرف ایسٹ پاکستان رائل فلو سنٹر واقع ہے اور سنٹر کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت عین شاہراہ کومیلہ پر واقع ہے۔ سنٹر کے لوگ بغاوت کر چکے تھے۔ سنٹر میں موجود مغربی پاکستانیوں اور ان کے اہل خانہ کو قتل کر دیا گیا تھا اور کچھ قید کر لئے گئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی عمارت کے سامنے ناکہ لگادیا تاکہ کوئی آدمی شہر کی طرف سے باہر نہ جاسکے۔ مکتی باہنی کے مخبر پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ کرنل سلیمان کے ٹروپس بعد دوپہر جوہنی لاگ ایریا ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے ان کی اطلاع ایسٹ پاکستان رائل فلو پونچاؤ کی گئی اور وہ اپنے شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ جوہنی یہ وگ سنٹر کی عمارت کے نزدیک پہنچے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ کرنل سلیمان، اس کے تین آفیسرز اور تیس جوان موقع پر شہید ہو گئے۔ باقی سارے زخمی تھے جنہیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا۔

یہ سانحہ پاکستانی ٹروپس کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ مزید بد قسمتی یہ ہوئی کہ 53 بریگیڈ کے سامنے سے ناکہ ختم کرانے کے لئے نیوی سے مدد مانگی گئی۔ نیوی نے ایک کھڑے جہاز سے ضرورت کے مطابق ایسٹ پاکستان رائل فلو سنٹر پر توپ سے گولہ بھینکا۔ یہ گولہ باغیوں پر گرنے کی بجائے سیدھا 53 بریگیڈ پر جا گرا اور وہ چلا اٹھے۔ خیال تھا کہ شاید گولہ فیئر کرنے والے توپچی کی بیج رہنمائی نہیں کی گئی۔ لہذا اسے دوبارہ نئے ریفرس سے گولہ چھیننے کا حکم دیا گیا۔ یہ گولہ بھی سیدھا اپنے جوانوں پر جا گرا مجبوراً فائر بند کرادیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ توپچی کو ریفرس دینے والا سنٹل مین بڑکا تھا اور یہ ساری کارستانی اسی کی تھی۔ فوری طور پر علاقے میں موجود

کرنل شاہ پور اور بہت سے جوان شہید ہو گئے۔ بریگیڈ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر اطلاع دی گئی اور وہاں سے کمانڈو بٹالین بھیجنے کی استدعا کی گئی۔ اس وقت حالات کچھ اس طرح تھے کہ چٹاگانک میں موجود مغربی پاکستانی واحد بٹالین 20 بلوچ شہر سے 20 کلومیٹر باہر ایسٹ بنگال ریمپل سنٹر کی بغاوت سے نہر آ رہا تھا۔ وہ شہر میں نہیں آ سکتی تھی کیونکہ شہر کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ انیئر پورٹ مکتی باہنی کے قبضے میں تھا۔ 53 بریگیڈ بھی ناکے کے سامنے بے بس تھا۔ بہت سی شہادتیں ہو چکی تھیں جن کی لاشیں اٹھانا بھی مشکل تھا۔ شہر میں کوئی خاص ٹروپس موجود نہ تھے۔ ہر لمحہ موت کو دعوت دینے لگا۔ بریگیڈیئر انصاری نے رات ہی سے انیئر پورٹ پر دوبارہ قبضہ کی کوشش شروع کر دی۔ من سب ٹروپس چونکہ موجود نہ تھے انڈانیوں کے موجود دستے کی مدد لی گئی اور یہ کام نیوی کے کمانڈر اختر بوج نے بہت دیر ہی اور بہت ذہانت سے سرانجام دیا۔

ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر سیکرٹے کے عالم میں تھا کہ اب کیا یہ بے؟ امداد کس طرح بھیجی جائے؟ ڈھاکہ انیئر پورٹ پر C-130 جہاز تیار رکھا گیا۔ کمانڈو بٹالین بمعہ کمانڈنٹ سیفیدین بٹکرل محمد سلیمان تیاری کی حالت میں تھے۔ خوش قسمتی سے 29 مارچ کو 10 بجے تک انیئر پورٹ کا مکمل قبضہ حاصل کر لیا گیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔ یہ ٹروپس جوہنی چٹاگانک پہنچے انہیں دشمن میں گھرے ہوئے 53 بریگیڈ کی مدد کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ بڑی مشکل سے دوسری پرواز میں مزید جوان اور راش وغیرہ بھیجے گئے۔ شاید تھذیر کو سمجھا گیا ہی منظور تھا۔ کرنل سلیمان ورس سے کمانڈو شہر کی طرف سے 53 بریگیڈ کی مدد کے لئے روانہ ہوئے۔ علاقے سے ناواقف تھے۔ ”رینی“ جو کسی بھی فوجی کارروائی کے لئے بہت اہم ہوتی ہے وقت کی کمی کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکی۔ لہذا علاقے سے

بٹالیوں کو غیب سے کھینچ کر کے پونٹ الائنز میں قید کر دیا گیا لیکن بوئسٹان ہونا تھا وہ ہو گئی۔ خدا راجا کا سر دکھانے لگے۔

بہنیں یونٹوں میں اسلحہ تھا وہ تمام کی تمام بغاوت کر چکی تھیں۔ لاگ ایریا کے پاس جو تھوڑا بہت اسلحہ تھا وہ اب خاتمے کے قریب تھا۔ ہینڈ بریگیڈ نیر انصاری نے اس خطرناک صورت حال کا سنل ڈھا کہ روانہ کیا کہ اگر اسٹو نوئی نہیں پہنچتا تو چنا گانگ پر باغی قابض ہو جائیں گے۔ 53 بریگیڈ کی شہادتیں اور ناکہ بندی، کمانڈوز کی شہادتیں، اسلحہ کا خاتمہ قدرتی طور پر ڈھا کہ ہیڈ کوارٹر میں سب کے پسینے چھوٹ گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ چنا گانگ نیہ پورٹ پر رات کو جہاز اتارنے کی سہولت نہ تھی۔ ہر لمحہ موت کا پیغام دے رہا تھا اور اب پوری رات درمیان میں تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لہذا ایک دوسرے C-130 میں اسلحہ ادا نا شروع کر دیا گیا۔ جب اسلحہ ادا جا چکا اور پائلٹ سکواڈرن لیڈر ٹم یوس نے روانگی کے لئے لوڈ چیمپ کیا تو اسلحہ ہانڈ کھڑے ہوئے۔ پاسز میں طور پر بند رہے اور ترتیب سے رکھنے کے لئے کسی کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ کھلے رکھے ہوئے پاسز جہاز میں خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمیشہ انہیں اس طرح باندھا جاتا ہے کہ دوران پرواز میں نہ تسلیں۔ ہٹنے سے پھٹ سکتے ہیں اور جہاز کا حادثہ ہو سکتا ہے۔ لہذا پائلٹ نے اس طرح جہاز اڑانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب باندھنے کے لئے نہ تو رسیاں تھیں نہ جوان اور نہ وقت کیونکہ اندیشہ ابونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ یہاں تمام افسران نے رنگ دوف سے چپے ہو گئے۔ اب کیا کیا جائے؟

ہیڈ کوارٹر کے کرنل افضل ورائج پائلٹ کو اسلحہ لے لے اور بتایا کہ اگر سامان کی ترسیل کل تک ملتی کی جاتی ہے تو شاید ہم دوبارہ چنا گانگ بھی نہ اتر سکیں۔ لیڈر یوس بھی ایک دیدہ آفسر تھا اور جنگ میں بہت سے مہینے چڑتا ہے۔ اس نے بھی حالات کی

خطرناک صورت حال بھانپ لی۔ ملک کی سالمیت کا سوال تھا۔ یوس نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے اگر صورت حال اتنی خطرناک ہے تو میں تیار ہوں۔ اگر کوئی اور چیز لے جانا ضروری ہے تو وہ بھی رکھیں۔ ساتھ کھڑے میجر محمد افضل نے فوری کہا ہاں ایک Recoilless 106 Rifle ایک جیب پر فکس ہے۔ یہ اس نے کسی درکشاپ میں پڑی ہوئی ڈھونڈی تھی۔ یوس کے کہنے پر اس رائلفل سمیت جیب جہاز کے اندر کھڑی کر دی گئی۔ جہاز کے مسمے کے لئے بیٹھنے کی جگہ نہ پئی۔ ہندوہ تمام اس جیب کے اوپر بغیر سیٹ بیٹ باندھے بیٹھ گئے اور سکواڈرن لیڈر یوس نے اللہ کا نام لے کر کھلے اسلحہ اور بغیر ہندھی جیب کے ساتھ جہاز ٹوپر واز کر دیا۔ سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ شام تک یہ طیارہ بحفاظت چنا گانگ ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ یوس اور اس کا علم یہ اسلحہ اس طرح حفاظت سے لے گئے جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو دودھ میں جھولا دیتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر نے آفیسرز نے خصوصی شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ بروقت اسلحہ پہنچنے سے بریگیڈ نیر انصاری نے ایسٹ پاکستان رائل فوج ہیڈ کوارٹر پر فوری حملہ ترتیب دیا۔ خود رہنمائی کی۔ باغیوں کو مار بھگا کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر لیا۔ 18 ہزار رائل فوج اور بہت سا اسلحہ ہاتھ لگا جو ان لوگوں نے جمع کر رکھا تھا۔ اسی دن سنبھ میں حالات خراب ہو گئے تو ایک پی آئی اے کا فوکر جہاز لیا گیا جس میں 70 جوانوں کو فوری روانہ کیا گیا جبکہ اس میں زیادہ سے زیادہ 40 آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ عظیم اور نڈر پائلٹ یقیناً مہار کباد کے مستحق ہیں جن کی بے خوف قیادت سے بروقت کارروائی ممکن ہوئی۔ دفاع وطن میں ان لوگوں کا کردار یقیناً قابلِ تحسین تھا اور قوم انہیں سلام پیش کرتی ہے۔



حکیم آفتاب احمد قرشی

آسمان طب کا روشن ستارہ

اب ان کے صاحبزادے محسن آفتاب قرشی اپنے والد کے مشن کی تکمیل کیلئے سرگرم ہیں اللہ ان کو کامیاب کرے۔



حکیم محمد آفتاب قرشی



شفائے ملک حکیم محمد حسین قرشی

آپ کے دوستوں میں میر محمد علی شاہ اور جمال الدین افغانی جیسے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے داعیان کا نام نامی آتا ہے۔

آفتاب کی والدہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی کی زوجہ محترمہ ایک تہجد گزار خاتون تھیں اور اپنے

حکیم آفتاب احمد قرشی 1925ء کو لاہور کے ایک علمی و طبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا قاضی فضل الدین شہر گجرات کے قاضی تھے علاوہ ازیں آپ امیر کابل کے دربار نیز ریاست ہائے کشمیر اور ناٹھہ کی سرکار سے بھی وابستہ رہے۔

غزل

مجھے بیگانے کی ضرورت کیا تھی
یہ بتانے کی ضرورت کیا تھی
ہم سے کہتے نہ دیکھتے چھہ کو
منہ چھپانے کی ضرورت کیا تھی
ترک تعلق نے ہمیں مار ڈالا
زہر کھانے کی ضرورت کیا تھی
زلف زنجیر سے رہائی نہیں ممکن
قید خانے کی ضرورت کیا تھی
میری میت پہ آئے ہیں بہانے آنسو
اس بہانے کی ضرورت کیا تھی
خامشی سے میرے شہر سے جاتے شاکر
شور مچانے کی ضرورت کیا تھی
(ایم سرفراز شاکر)

شوہر اور بزرگوں کے اتباع میں شب و روز بسر کرتیں۔ گھر میں نوکروں کی کمی نہ تھی لیکن وہ آفتاب کی دادی کی خدمت اپنے ہاتھوں سے انجام دیتیں وہ اسے عبادت کا درجہ دیتی تھیں۔ آفتاب کے والدین سیاسی اور سماجی لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت تھے۔ تمام نعمتوں سے بہرہ ور آفتاب احمد عجز و انکسار اور سادگی کا پیکر بنے رہے۔ آپ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تمام عمر دینی انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔

آفتاب احمد قرشی نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ طبیہ کالج لاہور سے زبدۃ الحکما کی سند پہلی پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ وہ شروع ہی سے حضرت علامہ اقبالؒ کے اس نظریہ سے متفق تھے کہ برصغیر کے مسلمان ایک علیحدہ خطہ ارضی کے حصول کے لئے جدوجہد کریں جب مسلم لیگ کی

سرگرمیاں بڑھیں تو اس وقت وہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ آپ نے عملاً اس تحریک میں بحیثیت رکن مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن حصہ لیا اور پھر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے 1940ء میں اقبال پارک میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے انعقاد کے سلسلے میں دیگر ساتھی طلباء کے ہمراہ انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ 1944ء میں انہیں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری منتخب کیا۔ 1946ء میں اسلامیہ کالج کے جنکشن اور بہادر فرزندوں کی بدولت پنجاب میں مسلم لیگ نے انتخابی معرکہ سر کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف خود حضرت قائد اعظمؒ نے کیا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کی اور حکیم آفتاب احمد قرشی اور سید قاسم رضوی کو قومی کارکردگی کی اسناد دیں جن پر ان کے دستخط ثبت تھے۔ اس انتخابی مہم کے سلسلے میں حکیم آفتاب احمد قرشی دو اڑھائی ماہ مسلسل پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے انتخابی مہم چلاتے رہے۔ ان تھک محنت اور مسلسل بے خوابی کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی لیکن انہوں نے مطلق پروا نہ کی اور ہمیشہ یہی کہتے ایسی کئی زندگیاں وطن عزیز پر قربان کر سکتا ہوں۔

حکیم عبدالرحمن سوانی انجمن حمایت اسلام کے اس جلسہ میں شریک تھے جو اسلامیہ کالج طبیہ کالج کی مشترکہ وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا اور اس میں حضرت قائد اعظمؒ تشریف فرما تھے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں قائد اعظمؒ نے شفا الملک سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کا صاحبزادہ آفتاب جو اس وقت سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر ہیں مجھے ان

الملک گھر واپس آئے تو سونے کے لئے بستر تھا اور نہ تکیہ زوجہ محترمہ نے بتایا کہ ہم تو کئی روز سے اسی طرح رہ رہے ہیں گھر کا سامان آفتاب بھارت سے آنے والے مہاجرین کو دے آئے ہیں غالباً انہیں احساس نہیں ہوا کہ یہ بستر آپ کا ہے۔ یہ سن کر شفاء الملک مسکرا دیئے۔ ہاں! ایثار تو اسی کو کہتے ہیں بیگم صاحبہ نے نوکر کے ذریعہ شفاء الملک کے لئے تکیہ پڑوسیوں کے گھر سے منگوایا کیونکہ وہ تکیہ کے بغیر سو نہیں سکتے تھے اس رات شفاء الملک ننگے فرش پر تکیہ رکھ کر سوئے اگلے دن شفاء الملک نے تمام ضروری اشیاء کی خریداری کروائی۔

تحریک پاکستان کے دوران آپ نے شب و روز محنت کی اور مسلسل سفر میں رہے۔ ان صوبوں کی وجہ سے نزلہ بخار اور دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ علاج کراتے تھے لیکن چونکہ اپنی ذات کی نفی کر چکے تھے لہذا اس میں باقاعدگی نہ تھی طبی اور ملکی سیاست میں حصہ لینے کی والد کی طرف سے اجازت نہ تھی لہذا وہ بلا روک ٹوک حصہ لیتے لیکن والد محترم کو تمام حالات و واقعات سے آگاہ رکھتے۔ والدہ محترمہ ایک انٹرویو میں فرماتی ہیں والد نے تمام بچوں کو علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں سونپ رکھی تھیں۔ آفتاب احمد نے طبی اور سیاسی میدان میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ریاض احمد کا رجحان تصنیف و تالیف کی طرف تھا اس لئے ان کی توجہ مطب اور تصنیف و تالیف کی طرف رہی انہیں اس پر کام کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ سعید احمد کو گھریلو ذمہ داریاں اور گھر پر آنے والے مریضوں کو ادویات دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اقبال احمد نے کیمیکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی

کی شبانہ روز محنت پر بہت خوشی ہے مجھے کامل بھروسہ ہے کہ انشاء اللہ پاکستان کے قیام کے بعد ہم ضرور طب اسلامی کی سرپرستی کریں گے۔ حکیم آفتاب احمد قرشی کو 24 جنوری 1947ء میں پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا اور سینٹرل جیل لاہور میں رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد رہائی ملی تو کسی اور مقدمہ میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مرتبہ انہیں میانوالی کی جیل میں قید رکھا گیا۔ ان کی رہائی اس وقت عمل میں آئی جب سول نافرمانی کی تحریک اختتام کو پہنچی جب وہ بذریعہ ریل لاہور کے پلیٹ فارم پر اترے تو ایک شاندار جلوس ان کے استقبال کے لئے موجود تھا انہیں نعروں کی گونج میں گھرنک لایا گیا۔

مئی 1947ء میں جالندھر میں تقسیم پنجاب کیخلاف فسادات شروع ہو گئے تو وہاں کی مسلم لیگی قیادت نے حکیم آفتاب احمد قرشی کو ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت بھجوائی۔ فسادات کی وجہ سے سفر میں جو خطرات لاحق تھے ان کی وجہ سے احباب کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے جلسہ میں شرکت کی۔ قومی سطح پر ان کا شخص مرکزی لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ جون 1947ء میں انہیں سرحد کے مسلم لیگی زعماء نے مدعو کیا۔ انہوں نے سرحد کے استصواب میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے مہاجرین کی آباد کاری میں حصہ لیا جو لوگ بے سر و سامانی میں نظر آتے انہیں اپنے گھر سے ضروریات کی اشیاء دے آتے حتیٰ کہ گھر میں بستر اور سر کے نیچے رکھنے کے لئے تکیہ بھی نہ رہا۔ ایک رات شفاء

کی تھی لہذا قرشی صاحب نے انہیں قرشی دوا خانہ کی تمام ذمہ داری سونپ دی تھی ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا یوں تو ماں کو تمام اولاد پیاری ہوتی ہے مگر آفتاب کو مجھ سے اور مجھے آفتاب سے بہت پیارتھا۔ اس نے دسٹل ہونے کے باوجود اپنا علیحدہ مکان نہیں بنایا بلکہ تمام عمر میری محبت کی وجہ سے میرے ساتھ گزار دی۔

حکیم آفتاب احمد قرشی آزادی کشمیر کے لئے بھی سرگرم رہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف چودھری غلام عباس، سردار محمد ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم خان نے کیا۔ موثر عالم اسلامی کی پہلی نشاۃ ثانیہ کے انعقاد کے موقع پر وہ اپنے والد کے ہمراہ تھے اور کانفرنس کے انتظام و انصرام میں نمایاں حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں مسلم لیگ کے مرکزی ذمہ دار نے عہدوں کی پیش کش کی لیکن انہوں نے ٹھکرادی اور حکومت کا حصہ نہ بنے قناعت انہیں ورثے میں ملی تھی کسی بھی قسم کی دنیاوی چمک دمک نے انہیں متاثر نہ کیا۔ البتہ ایسے اعزازی منصب کو قبول کر لینے میں عار محسوس نہ کرتے تھے جس کا مقصد عوام الناس کی خدمت ہوتا تھا۔ 1962ء میں انہوں نے آل پاکستان یوتھ کونشن منعقد کیا جس میں ملک بھر سے نوجوان شریک ہوئے۔ اجلاس نے متفقہ طور پر انہیں صدر منتخب کیا۔ اس پلیٹ فارم سے انہوں نے بیرون ملک نوجوانوں کے مختلف بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کی وہ ویانا، فرانس اور سری لنکا گئے اور پاکستانی نوجوانوں کی نمائندگی کی۔

آفتاب احمد قرشی کے والد موثر عالم اسلامی کی پاکستان شاخ کے صدر تھے اس حوالے سے وہ اس

تنظیم کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ انتظامات اپنی نگرانی میں کروا دیتے۔ لاہور میں موثر عالم اسلامی کے شاخ اور جماعت کے انعقاد میں آپ کا اہم شہر ہے۔ 1974ء میں لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر چونکہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی شدید علیل تھے لہذا اس کانفرنس میں والد محترم کی نمائندگی حکیم آفتاب احمد قرشی نے کی۔ 1978ء میں موثر عالم اسلامی کا ایک وفد لے کر روس کے دورہ پر گئے۔ آپ تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراؤ گئے اور وہاں مسلم اکابرین سے ملے۔ آپ مختلف تعلیمی اور رفاہی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ آپ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن اور طبیبہ کمیٹی کے رکن تھے آپ اسلامیہ کالج لاہور کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں آپ نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں ان سرگرمیوں کو انجام دیتے ہوئے سردی، گرمی اور برسات کبھی ان کے آڑے نہ آئے کبھی کوئی تکلیف آپ کو ان کاموں سے نہ روک سکی۔ صحت کی طرف سے اغماض برتنا بالآخر رنگ لایا دسمبر 1981ء کو چھپن سال کی عمر میں تحریک پاکستان کا یہ خاموش سپاہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ خانوادہ قرشی نے تحریک پاکستان کے دوران جو خدمات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے مقام یا تعلقات کی بنیاد پر کبھی کوئی مفاد حاصل نہیں کیا بلکہ اپنا تنہا من و دھن سب کچھ قربان کیا۔





کشمیری عوام پر بھارت نے جنگ مسلط کر رکھی ہے۔ کشمیر سے بھارتی فوج لداخ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ پاکستان کے لئے یہ موقع ہے کہ بھارت سے بات چیت کی زبان نہیں بلکہ توپ اور میزائل کی زبان سے بات کرے۔

چین کی لداخ میں پیش قدمی

کشمیر کی آزادی کے امکانات بڑھ گئے



E-Mail: gulzar.akhtar@gmail.com

☆ گلزار اختر کا شمیری

تاریخی حیثیت

برٹش انڈیا کے دور میں یہ جگہ نامعلوم اور دشوار گزار راستے تھے۔ جہاں برف جمی رہتی تھی۔ وادی لیپہ سے تعلق رکھنے والے غلام رسول گلوآن نے یہ علاقہ 1818ء میں دریافت کیا تھا۔ اسی کے نام پر اس وادی کا نام گلوآن وادی جہاں بہتے دریا کا نام دریائے گلوآن رکھا گیا۔ یہ لداخ کے اس ایریا میں ہے جو چین کے

15 جون 2020ء کو ریاست جموں و کشمیر لداخ کے علاقے میں بھارت اور چین کے

فوجیوں کے درمیان جھڑپ میں بھارت کے فوجیوں سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ اور 35 سے زیادہ زخمی بھی ہوئے۔ اس مضمون میں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ اس کے جغرافیائی حالات کیسے ہیں۔ اور مستقبل میں تحریک آزادی کشمیر اور سی پیک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کو ہم نے بھارت میں ضم کر دیا ہے۔ دفعہ 35A اور دفعہ 370 کو ہدف کر دیا گیا ہے۔ اب آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور اکسائے چین پر بھی قبضہ کریں گے۔ چین نے اس پر اعتراض کیا۔ مگر بھارت نے چین کو کوئی ٹفٹ نہ کرائی۔ بلکہ آگے بڑھ کر لداخ میں تعمیرات شروع کر دیں۔ بھارت نے بیک وقت 35 سڑکوں پر کام شروع کیا۔ جو چین کے 3500 کلومیٹر مکمل باروڑ کو کور کر سکتی ہے۔ تبت پر چین کے قبضے سے چین بھارت کا ہمسایہ بن گیا۔ چین سے تبت تک رسائی صرف اکسائی چین کے راستے ہی ممکن ہے جہاں چین نے ایک کشادہ شاہراہ بنائی ہے بھارت صرف اسی لیے اکسائی چین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اکسائی چین کا علاقہ بھارت کے قبضے میں آئے گا بلکہ تبت کا راستہ بند ہونے کی وجہ سے تبت تک چین کی رسد اور ملک بند ہونے سے زمینی راستے سے تبت پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارت کی طرف سے اکسائی چین کا علاقہ مشکل ترین جبکہ چین کی طرف سے آسان راستہ ہے۔ لداخ میں بھارت اور چین کی سرحد 320 کلومیٹر ہے۔ بھارت نے لداخ سے اکسائے چین کے راستے پر ایک سڑک تعمیر کرنی شروع کی جو 255 کلومیٹر لمبی تھی۔ دریاے گلوان پر پل بھی بنایا۔ جس کا افتتاح وزیر دفاع راج ناتھ نے کیا۔ چین نے اس پر اعتراض کیا۔ مقامی فوجی کمانڈروں سے درمیان مذاکرات ہوئے مگر بھارت نے ہٹ دھرمی اختیار کی۔ ناچار مئی میں چین نے اپنے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر LAC پر جو علاقہ چین اپنا کہتا تھا مگر 1962ء کی جنگ کے بعد وہاں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یہ لداخ میں تین جگہوں سے اندر آئے جو درج ذیل ہیں۔

علاقے آسائی چین اور قراقرم پاس سے نزدیک ہے اور ان دونوں علاقوں کا گیٹ وے ہے۔

جغرافیائی صورتِ حال

اس کے ساتھ تبت کا علاقہ ہے۔ چین نے 1950ء میں تبت کی خود مختاری ختم کر کے چین کا حصہ بنالیا۔ تبت میں برٹش انڈیا کے ریٹ ہاؤس ٹیلی گراف آفس اور کچھ پراپرٹی تھی۔ بھارتی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے خیر سگالی کے طور پر نہ صرف تبت پر چین کے قبضہ کو تسلیم کیا بلکہ برٹش انڈیا کی تمام پراپرٹی اور ٹیلیٹ ہاؤس چین کو دے دیے۔

اکسائی چین کا علاقہ جس پر بھارت اور چین دونوں کا دعویٰ تھا۔ چین اور بھارت کے درمیان 1962ء میں جو جنگ ہوئی تھی۔ چین نے اکسائی چین پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ آخر میں یہاں لائن آف انچول کنٹرول قائم ہوئی۔ جسے LAC کا نام دیا گیا ہے۔ LAC دونوں فریقین نے مل کر طے نہیں کی بلکہ چین نے اپنے طور پر اسے طے کیا اور بھارت نے اپنے طور پر 1993ء میں چین اور بھارت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے درمیان یہ طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے پر فائر نہیں کریں گے۔ لداخ کا یہی علاقہ گلوان وادی کا ہے۔ جہاں سے اکسائی چین کی طرف راستہ جاتا ہے۔ اور یہاں سے قراقرم پاس کی طرف بھی راستہ جاتا ہے۔ جو پاکستانی زیر قبضہ سکرو اور گلگت بلتستان کی طرف جاتا ہے۔

بھارتی پیش قدمی

5 اگست 2019ء کو بھارتی لوک سبھا میں بھارتی قومی سلامتی کے مشیر امیت شاہ نے اعلان کیا کہ

۱۔ گلوآن ویلی

اس وادی میں چین چار ہزار آدمی لے کر اندر آیا۔ یہاں اس نے بھارت کے زیر کنٹرول ایریا جہاں نئے فینگر سرکس اور مورچے زیر تعمیر تھے قبضہ کر لیا۔ یہ وادی آسائے چن کا دروازہ ہے۔ یہاں ہی سے بھارت اکسائے چن کی طرف حرکت کر سکتا ہے۔ یہاں چار کلومیٹر کے علاقے میں متعدد پوشیں بھی بنا میں جو دریائے گلوآن کے دونوں اطراف میں ہیں۔ ساتھ ہی اس پل پر بھی قبضہ کر لیا۔ جسکا راج ناتھ نے افتتاح کیا تھا۔

۲۔ پیگانگ

یہاں سے چین کی فوج اندر داخل ہوئی۔ یہاں پر ایک جھیل بھی ہے۔ پہاڑ میں فنگر بنی ہوئی ہیں۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ فنگر ایک سے فنگر آٹھ تک اس کا قبضہ تھا۔ اور چین نے فنگروں سے فنگر چار تک قبضہ کر لیا ہے۔ جھیل میں چین کی موٹر بوٹ گشت کر رہی ہیں۔ یہ خاصی لمبی پوزی گیری اور خوبصورت جھیل ہے۔ چین کے گلوآن دریا اور پیگانگ جھیل پر قبضے کی وجہ سے بھارتی فوج کی کئی پوسٹوں تک رسائی بند ہو گئی

ہے۔ بند ہونے والی پٹرولنگ پوسٹوں میں 14-16-18 اور 19 شامل ہیں۔ لداخ میں چین کے ہزاروں فوجیوں کے مقابلے میں بھارتی فوج کی تعداد کم ہے۔ اس وجہ سے چین بھارتی فوج کو دبوچنے میں کامیاب رہا۔

چین نے گلوآن اور ویب تک کے میدانی علاقے میں چین کی فوج نے دو سڑکیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ بھارت ان سڑکوں کو اپنے علاقے میں مداخلت قرار دے رہا ہے۔ پیگانگ سولیکٹر میں چین کے فوجیوں نے فنگر فور کا علاقہ جو فنگر آٹھ تک 8 کلومیٹر محیط

ہے۔ چینی فوج کے گلوآن دریا کے دونوں اطراف پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کر کے گلوآن وادی کے شمال میں ڈومیسانگ میں داخل ہو گئی ہے۔ اسی طرح اتر کھنڈ کے ہرسل سیکٹر میں بھی چینی فوج نے جو پیش قدمی والے علاقوں کو سپورٹ کرتی ہیں۔ پینگانگ سو سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر چین نے اپنے لڑاکا جہازوں کے لئے ایئر پورٹ بنانا شروع کر دیا ہے۔ یہ 14 ہزار فٹ کی بلندی پر ایئر پورٹ ہے جو تبت کو بھی سپورٹ کرے گا۔ تبت میں اس کے علاوہ بھی تین ایئر پورٹ موجود ہیں۔ 2017ء میں ڈوکلام میں جھڑپ کے بعد تبت میں چینی جنگی جہاز ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ چین نے پچھلے عرصے تبت کے علاقے میں بڑی فوجی مشقیں بھی کی ہیں۔ جن میں جنی طیاروں، راکٹ فورسز ایئر ڈیفنس، ریڈار جبر زسمیت ہر شعبہ نے حصہ لیا ہے۔ یہ چین کی طرف بھارت کے لئے پیغام تھا۔

۳۔ ڈونچال

یہ علاقہ بھی لداخ کے جنوب میں واقع ہے۔ جہاں چین فوج ساتھ مربع کلومیٹر علاقے میں داخل ہوئی ہے۔

۴۔ سقم

چوتھا علاقہ سقم کا ہے۔ جہاں چینی فوج نے پیش قدمی کی ہے۔ بھارت پاکستان میں سی پیک کے منصوبے پر تنقید پاتھا اور گلگت ہنستان میں سے گزرنے والی شاہراہ کو تباہ کرنے کی وہمکیاں دیتا رہتا ہے۔ بھارت اگر سکرو اور گلگت ہنستان کی طرف پیش قدمی کرے تو صرف وادی گلوآن کی طرف سے ہی کر سکتا ہے۔ جہاں چین کا قبضہ ہو چکا ہے۔ لداخ میں وادی گلوآن کے ساتھ دولت بیگ کا علاقہ جہاں سے قراقرم پاس کی طرف راستہ جاتا ہے اس پر قبضہ کر کے چین

قریب انتہائی زخمی ہوئے باقی گرفتار ہو گئے۔ بھارت نے چین سے یہ جگہ خالی کرانے کے لئے اس کے بعد طاقت استعمال نہیں کی البتہ انڈیا نے دوست ممالک کے ذریعے بھی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈیپو بینک چینل بھی استعمال کیے مگر کچھ نہ ہو سکا۔

بھارت کی اہم مجبوری

جون، جولائی، اگست پہاڑی علاقوں کی فوج کا ڈیمپنگ سیزن ہوتا ہے۔ سردیاں آنے سے قبل فوج سردیوں کے لئے اپنا ایوینشن راشن جس میں گوشت دالیں لکڑی مٹی کا تیل وغیرہ جو انتہائی برف باری میں استعمال ہوتا ہے، وہ جمع کرتی ہے۔ جہاں تک سڑک جاتی ہے وہاں گاڑیوں کے ذریعے وہاں سے آگے نچروں سے۔ سیاحین اور اس طرح کے علاقوں میں پاک بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بعض ایسے علاقے جہاں نچر یا پاک بھی نہیں جاسکتے وہاں مزدور لگائے جاتے ہیں۔ ایسے سیزن میں چین نے آگے بڑھ کر بھارت کا ڈیمپنگ سیزن متاثر کر دیا کئی علاقوں کے راستے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ چین نے سڑکیں بند کر دیں۔ ان میں ایک راستہ سیاحین کی طرف جانے والے راستوں میں سے ہے۔ سیاحین کا ایک سیکٹر جو پاکستانی فوج کے سامنے ہے وہ بلاک ہو گیا بھارت ہیلی کاپٹر استعمال کر سکتا ہے۔ مگر خرچہ بہت زیادہ آئے گا۔ یا تو بھارت کو کچھ علاقے خالی کرنے پڑیں گے۔ جہاں ہماری فوج لڑے بغیر قبضے کر سکتی ہے۔

چین بھارت کی حالیہ جھڑپ

اور سی پیک کی حفاظت

چائنا پاکستان اکٹائس کا ریڈور یعنی سی پیک کشمیر

نے سی پیک کو محفوظ کر لیا ہے۔ دولت بیگ جس کا آج کل دنیا بھر کے میڈیا پر چرچا ہے ہمالیہ اور قراقرم کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں ایک وسیع علاقہ ہے یہاں درجہ حرارت منفی 55 ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے یہاں سے چینی سرحد 8 کلو میٹر اور انسانی آبادی 100 فلو میٹر دور ہے۔ یہاں بلتی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ چین نے اس پر قبضہ کر کے سی پیک اور گلگت بلتستان کو محفوظ کر لیا ہے۔

حالیہ جھڑپیں

چین کی پیش قدمی کے بعد مئی سے اس وقت تک بھارتی فوج اور چینی فوج کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا پھر یہ ملاقات کور کمانڈر سطح پر ہوئی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مؤرخہ 15 جون 2020ء کو 16 بہار جھٹ کے کمانڈنٹ کرنل سنٹوش اپنی یونٹ کے تقریباً ایک سو سے زائد افراد کو لے کر رات کے اندھیرے میں گلوان دادی چینی کیمپ میں داخل ہوئے۔ ان کا اصل منصوبہ کیا تھا یا ان کو کیا حکم ملا تھا اس کی پوری کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ اس علاقے میں بھارت اور چین کی فوجوں کے درمیان فائر نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔ چین کا یہ فوجی کیمپ پہاڑ کی چوٹی پر تھا جہاں آگے انتہائی ڈھلوان تھی۔ جو دریائے گلوان پر ختم ہوتی تھی۔ چین نے یہاں پر مارشل آرٹ کے ٹرینڈ لوک رکھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے ڈنڈوں کے ساتھ بھارتی فوجوں پر حملہ کیا اور زخمی ہونے والوں کو نیچے کھائی میں لڑھکا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر زخمی اور ہلاکتیں اسی کھائی میں گرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ بعض فوجی راستے میں ہی چٹانوں اور پتھروں سے ٹکرا کر مر گئے بعض دریا میں گر گئے۔ 20 کے قریب لوگ موقع پر مر گئے۔ جن میں کرنل سنٹوش بھی شامل ہیں۔ 35 کے

چین ہوتا ہے۔ امیت شاہ نے مزید کہا کہ اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سارے علاقے اور پورا جوں و کشمیر بھارت کا الٹو انگ ہے۔ اس اعلان نے ہلچل مچادی۔ اسی وجہ سے چین نے اکسائے چن اور سی پیک کی حفاظت کی خاطر دولت بیگ، لداخ کے علاقوں پر قبضہ کیا۔ امریکہ اور چین کی سرد جنگ میں بھارت امریکہ کا فرنٹ مین ہے اور سی پیک کے خلاف سازش کا مین کردار بھی۔ ممکن ہے چین بھارت کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ امریکہ کے زیادہ قریب جانے سے گریز کرے۔ بھارت پہلے ہی چین کی ابھرتی ہوئی طاقت کے دباؤ میں ہے۔

مغرب میں چین سی پیک کے ذریعے ترقیاتی منصوبوں میں مصروف ہے۔ امریکہ اسرائیل اور بھارت نہیں چاہتے یہ منصوبے کامیاب ہوں۔ وہ بھارت کو اکسار ہے ہیں کہ سی پیک کی شہ رگ شاہ راہ ریشم میں رکاوٹ ڈالی جائے تاکہ آئندہ صرف رک سکے۔ بھارت نے امریکہ اور اسرائیل کے بریکانے پر سی پیک کو ایک ناجائز منصوبہ قرار دیا۔ جو چین کی نافرمانی کا سبب بنا۔ چین کی اس وقت سب سے بڑی ترجیح سی پیک کی تکمیل ہے۔ جس کے لئے وہ ہر طرح کے آپشن استعمال کر سکتا ہے۔ چین علاقے میں امن و امان کا خواہش مند ہے۔ تاکہ معاشی منصوبے بدامنی کا شکار نہ ہوں اسی وجہ سے دولت بیگ پر قبضہ کیا گیا۔ تاکہ یہ منصوبہ بھارت کی پہنچ سے دور ہو جائے۔

موجودہ حالات اور کشمیر کی آزادی

1962ء میں چین اور بھارت کے درمیان جو جنگ ہوئی وہ اسی اکسائی چن میں ہوئی تھی۔ اکسائے چن کا علاقہ 37550 کلومیٹر ہے۔ بھارت اور چین دونوں اس کے دعویدار ہیں۔ چین کا تبت کے

کے علاقے گلگت بلتستان سے گزرتا ہے۔ جو پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازع علاقہ ہے۔ بڑھتے ہوئے پاک چین تعلقات بھارت کے لئے پریشانی کا سبب بن گئے ہیں۔ سی پیک شروع ہونے سے چین کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جوں و کشمیر کے مسئلے پر چین نے ہمیشہ پاکستان کا ساتھ دیا۔ حالیہ چین بھارت ٹکراؤ سے دونوں ممالک کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے ہیں۔ جو مستقبل قریب میں حل ہونے نظر نہیں آتے۔ جب سے سی پیک شروع ہوا۔ بھارت نے پاکستان میں تخریب کاری میں اضافہ کر دیا۔ تاکہ پاکستان اور چین کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے۔ لداخ سے آگے آ کر دولت بیگ ایک بڑا مقام ہے۔ جہاں بھارت اپنا مٹریکس بنا رہا تھا۔ اس راستے سے وہ گلگت بلتستان کی طرف فوجی کارروائی کر سکتا تھا۔ تھامیہ اور قراقرم کے بلند و بالا پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک وسیع سرد میدان ہے۔ سردیوں میں یہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ گرمیوں میں دو تین ماہ یہ خالی ہوتا ہے۔ یہاں سے چینی سرحد 8 کلومیٹر ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں۔ قریبی انسانی آبادی تقریباً سو کلومیٹر دور منور کو گاؤں ہے جہاں ملتی نسل کے لوگ آباد ہیں چین نے دولت بیگ پر قبضہ کر کے بھارتی مٹریکس میں جو بن رہا تھا۔ اس پر قبضہ کر لیا۔ اسی وجہ سے دولت بیگ کا اس وقت ساری دنیا کے میڈیا پر چرچا ہے۔ دولت بیگ پر قبضہ کر کے چین نے سی پیک کو محفوظ کر لیا۔ جس کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں۔

چین تو چین سی پیک کے معاملات پر امن طریقے سے حل کرنا چاہتا تھا۔ جب بھارت کے مشیر قومی سلامتی امیت شاہ نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ جب ہم جموں و کشمیر کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ آزاد کشمیر گلگت بلتستان اور اکسائے

ہائی وے کے عین اوپر چین کی چوکیاں بن چکی ہیں۔ جس کے بعد بھارتی فوج کو سب سیکٹر ناتھ سے جوڑنے والی یہ سڑک خطرے میں پڑ چکی ہے۔

یہ سیکٹر اب چین کے رحم و کرم ہے۔ اگر پاکستان بھی کارگل جنگ کی منصوبہ بندی پھر سے زیر غور لاتا ہے تو بھارت پاکستان اور چین کے درمیان چھٹس سکتا ہے۔ چین کی فوج دریائے گلوان اور دریائے شیوک کے ملاپ کے مقام پر پہنچ چکی ہے۔ یہ مقام اس سڑک سے صرف ڈیڑھ کلومیٹر دوری پر ہے۔ یہ سڑک شیوک دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اور چین کی فوج اونچائی سے اس سڑک کو آرٹلری، میزائلوں کی مدد سے نشانہ بنا سکتی ہے۔ اگر چین اس سڑک پر مستقل قبضہ رکھے اور مسلسل دھاؤں میں رکھ لے اور چینی انجینئر علاقے کو اپنی حدود میں بنی سڑکوں سے جوڑ لیں اور چینی فوج کنکریٹ کے ٹینگر جو بنا رہی ہے تیار ہو گئے تو بھارت کے لئے کافی مشکل ہوگی۔ پاکستان کے لئے اس میں سیکھنے کے اسباب موجود ہیں گو کہ بھارتی فوج کے ساتھ کارگل میں بھی یہی ہوا تھا اس نے انٹیلی جنس ناکامی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اور یہ کہ شمالی کمانڈر نے غفلت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ 2013 میں دولت بیگ، اولڈی میں بھی بھارت نے لینڈنگ گراؤنڈ تیار کر لیا تھا۔ جس میں چین نے مداخلت کر کے قبضہ کر لیا۔ کشمیری عوام پر بھارت نے جنگ مسلط کر رکھی ہے۔ کشمیر سے بھارتی فوج لداخ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ پاکستان کے لئے یہ موقع ہے کہ بھارت سے بات چیت کی زبان نہیں بلکہ ٹوپ اور میزائل کی زبان سے بات کرے۔ اس صورت حال میں مناسب منصوبہ بندی کر کے بھارت کو جارحیت سے باز رکھا جا سکتا ہے۔



ساتھ سڑک کا رابطہ صرف اکسائے چین کے راستے ہی ہے۔ 1962 میں چین نے اس پر ایک شاہراہ بنائی جو چین اور تبت کو جوڑتی ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگل میں جو لڑائی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ جوں و کشمیر کی مجاہدین کی تنظیم حزب المجاہدین کے سکرو کے کمانڈر عبدالاحد صاحب جو رہنے والے تو لداخ کے تھے۔ پھر ان کو سکرو کا کمانڈر بنایا گیا۔ سردیوں میں وہ اپنے دستے کے ہمراہ کارگل سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ بھارتی فوج کے بنگر خالی پڑے ہیں۔ جب کہ اسلحہ کا ذخیرہ بنگروں میں موجود ہے۔ انہوں نے ہاڈر لائن پر جاکر (NLI) نادرن لائن انفنٹری بٹالین کے سی او کو بتایا۔ سی او نے ایک مسلح دستہ ان کے ہمراہ بھیجا۔ مسلح دستہ رات تک وہاں ٹھہرا مگر بھارتی فوج کا کوئی آدمی، کوئی فرد یہاں نہ آیا۔ جس سے اندازہ ہوا ہے کہ بھارتی فوج سخت سردی میں کچھ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ مگر سڑک نہ ہونے کی وجہ سے اپنا زیادہ ایونینشن یہاں ہی چھوڑ جاتی تھی۔ اب بھارت یہاں سڑکیں بنوا چکا ہے۔ اور ڈیٹیس کو کافی مضبوط کر چکا ہے۔ پاکستانی فوج نے سٹل لپشن شیر خان شہید (لشون جہر) کی قیادت میں سرینڈرو جیلا اور کارگل، ندیہ ہائی وے کو شمال کی جانب سے لداخ سے کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان دریائے سورو کے آ رہا قبضہ کر لیتا تو بھارت کے لئے تباہ کن ہو سکتا تھا۔ چونکہ اس شاہراہ پر امریکی تنصیبات تھیں جہاں چین کے خلاف امریکی تحقیقاتی ادارہ ہے۔ اس لئے امریکہ نے دباؤ دے کر نواز شریف سے وہ علاقہ واپس بھارت کو دلویا تھا۔ اور وہ بھارت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اب چین گلوان و بی میں دریا کے دونوں اطراف اونچی چوٹیوں پر بیٹھا ہے۔ اور داربک شیوک، دولت بیگ، اولڈی

منظور احمد تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیبؐ کا منظورِ نظر تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سعیِ جلیلہ کو منظور کر کے اُس کے درجات بلند کر دیئے ہیں۔

منظورِ منظور

ایک نام ایک کہانی

چکوال

☆ حکیم مختار احمد خان

ہوں یا اتنا محروم ہوا میں نے شادی کی ہے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ آپ صدقہ دیئے اور استغفار کرنے کی تلقین فرماتے۔

صدقہ کرنے کا ایک مختصر مگر پُر مغز واقعہ ایک عزیز نے سنایا۔ یہ واقعہ میں قارئین ”حکایت“ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

منظور احمد ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ بیوی سمیت گھر کے چار افراد کا کفیل تھا۔ اس کی اپنی کوئی جائیداد نہیں تھی سوائے چار مرلہ مکان کے۔ نہ ہی اس کا کوئی اور آمدنی کا ذریعہ تھا۔ تین بچے اور ایک بیوی تھی۔ فیکٹری کی تنخواہ سے اُن کی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ بیوی ایک گھڑ اور صابرش کر خاتون تھی، وہ ہر ماہ تنخواہ سے کچھ نہ کچھ بچا لیتی تھی۔ خاندان کو کہتی تھی کہ جب اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی تو تم موٹر سائیکل لے لیتا۔ منظور احمد پہلے پہل چار کو میٹر پیدل فیکٹری جاتا تھا، اب اس نے ایک سال قبل سائیکل لے لی تھی۔

فیکٹری کا مالک ایک خدا ترس انسان تھا، وہ

صدقہ بلا کو کھاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”صدقہ دیا کرو، صدقہ معیتوں کو اس طرح کھاتا ہے جیسے نکوی آگ کو“۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسولِ گم از کم تفتی مقدار میں صدقہ دیا جانا چاہتے؟ فرمایا۔ اگر ایک دانہ بھجور کا بھی صدقہ دل سے کسی کو دے دو، کسی سے مسکرا کر مل لو تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اُس اپنے کاموں سے گھر لوٹو یا بازار سے واپس آؤ اور اپنے گھر والوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاؤ۔ اگرچہ وہ چیز مقدار میں تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی تمہاری طرف سے اللہ رب العزت کے ہاں صدقہ ہی کے طور پر منظور کی جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صدقہ کے زیادہ حق دار کون ہیں۔ رحمت دو جہاں نے فرمایا۔ تمہارے نادار اور مفلس عزیز رشتہ دار پھر تمہارے پڑوسی اور پھر دیگر مفلس و نادار لوگ۔

صحابہ کرامؓ میں اگر کوئی حضور خاتم النبیینؐ کی خدمت میں عرض کرتا کہ یا رسول اللہ میں اکثر بیمار رہتا

”سرا! وجہ کوئی نہیں ہے۔ آپ کسی اور کو بھیج دیں۔“

کافی بحث تکرار کے بعد بھی اس کے یہی الفاظ تھے سر میں حج پر نہیں جاسکتا۔ منظور احمد نے بغیر کوئی وجہ بتائے مالک پر واضح کر دیا۔

”بد نصیب ہے۔“ جس نے سنا یہی کہا۔ ”اسے کسی کی بدعا ہے۔“

فیکٹری کے مالک نے منیجر کو کہا کہ دوبارہ قمرعہ اندازی کراؤ اور منظور احمد کا نام بھی شامل کرنا۔ دوبارہ قمرعہ اندازی میں پھر منظور احمد کا نام آ گیا۔

اب تو سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ جب تم کو بلاوا آ چکا ہے تو اب تمہیں ضرور جانا پڑے گا۔ مالک نے دوبارہ منظور احمد کو بلوایا اور پوچھا کہ اب بتاؤ کیا کہو گے؟

”سرا! میں دو گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔“ منظور احمد نے کہا۔ ”ایک یہ کہ کیا میرے حج پر جانے کے لئے زاو راہ مہیا کیا جائے گا اور کیا مجھے میری تنخواہ پوری ملے گی؟“ منظور احمد نے پوچھا۔

”آپ کو زاو راہ بھی ملے گا اور پوری تنخواہ بھی ملے گی۔“ مالک نے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ منظور احمد نے کہا۔

منظور احمد حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں تمام ارکان پورے کرنے کے بعد حجاج کرام کی روانگی مدینہ منورہ ہونے والی تھی کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ قبل اُس کے ہسپتال پہنچ پاتا روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ بیت اللہ کے سامنے جنازہ پڑھ کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ منظور احمد جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اللہ کے حکم پر ملک الموت نے اس کی روح کو اس مقدس مقام پر قبض کرنا تھا اور اس کو وہاں کی مٹی نصیب ہوئی تھی۔

تقریباً ہر مذہبی تہوار اور دیگر کئی ایام میں فیکٹری میں لنگر نیا زکا اہتمام کرتا اور عیدین اور دیگر تہواروں پر تمام ملازمین کی حسب استطاعت مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ بنبہ ہر سال فیکٹری کے ملازمین کے لئے حج کے لئے قمرعہ اندازی بھی ہوتی تھی۔ خاکروب سے لے کر منیجر تک ہر بندہ بہت ہی دل لگا کر کام کرتا تھا۔ فیکٹری مالک تمام ورکروں سے خوش تھے اور تمام ورکر مالک سے مطمئن تھے۔

اس سال بھی فریضہ حج کے لئے قمرعہ اندازی ہوئی اور منظور احمد کا نام نکل آیا۔ سب نے منظور احمد کو مبارکباد پیش کی۔ وہ مبارکبادیں تو وصول کر رہی رہا تھا لیکن وہ بھجا بھجا سا تھا۔

”لوگ تو حج کا نام سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن پتہ نہیں اس کو کیا ہے چپ چپ سا ہے۔“ ایک ورکر نے دوسرے ورکر کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں، بے تو شریف آدمی اخلاق کا بھی اچھا ہے لیکن نماز کے قریب تم جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے کسمپرسی کا شکار ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن جس روح نے عالم ارواح میں لبیک کہہ رکھی ہے وہ تو ضرور اس فریضہ سے بہرہ مند ہوں۔“

چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور فیکٹری مالک کو منظور احمد کے نام کی ذمہ داری بھجوا دی گئی۔ دوسرے دن مالک نے منظور احمد کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ منظور احمد فلاں دن سے تم چھٹی پر ہو گے اور حج کی تیاری کرو۔

”صاحب! میں حج پر نہیں جاؤں گا۔“ منظور احمد کے یہ الفاظ مالک نے سنے تو حیران ہو گیا۔

”وجہ؟“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

فیکٹری اور منظور احمد کے گھر اطلاع پہنچ چکی تھی۔ فیکٹری کے مالک نے فیکٹری کے اندر ہی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کر دیا اور شام کو منظور احمد کے دو دوستوں اور نیچر کو ساتھ لیا اور منظور احمد کے گھر کی طرف تعزیت کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک درکر جو منظور احمد کا بہت قریبی دوست تھا، اُس نے مالک کو بتایا کہ سر آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ منظور احمد رچ پر کیوں جانا نہیں چاہتا تھا۔

”بتاؤ کیا وجہ تھی؟“ مالک نے کہا۔

”سرخجی! بات یہ ہے کہ منظور احمد کی میرے ساتھ بہت گہری دوستی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارا ایک دوسرے کے گھر کھانا آنا جانا تھا۔ منظور احمد کے گھر کے عقب میں دو میاں بیوی تین بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر ہیں۔ تقریباً ایک سال قبل خاوند ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھا، گھر کی گزر بسر ہو رہی تھی، ٹرک مالکان نے کفن دفن کا اہتمام کر دیا اور اس کی بیوہ کو چند ہزار روپے دے کر یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ ہم تمہاری مدد امداد کرتے رہیں گے لیکن بعد میں کسی نے حال احوال بھی پوچھنا گوارہ نہیں کیا۔ بیوہ جوان تھی اور بہت خوبصورت تھی چنانچہ گاؤں کے کئی نیچے جوانوں اور چند ایک سفید پوش بزرگوں نے مدد امداد کی آڑ میں تعلقات بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک رات کھانا کھانے کے بعد منظور احمد اور اس کی بیوی حال احوال پوچھنے ان کے گھر چلے گئے۔ تعزیت کے لئے تو وہ پہلے بھی کئی دفعہ جا چکے تھے۔ مرحوم ڈرائیور کی بیوہ سے تعزیت کی اور اُن کا حال احوال اور گزر بسر کے بارے میں پوچھا تو ڈرائیور کی بیوہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ منظور کی بیوی اور منظور نے اُسے تسلی دلا سہ دیا اور کہا۔ بہن! فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔

اگر آپ کا رب آپ سے ناراض ہو اور استغفار سے بھی کام نہ لے تو اس کی مخلوق کو خوش کرنے کی کوشش کریں۔

”میں اس لئے نہیں رو رہی کہ میں بھوکی مر جاؤں گی۔“ بیوہ نے کہا۔ ”بلکہ میں تو اس لئے رو رہی ہوں کہ امداد کرنے کے لئے آنے والے مردوں کی زیادہ تعداد مجھے کسی اور نظر سے دیکھ رہی ہے۔ وہ میری امداد کرنے کے بہانے مجھ سے دوستی اور تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔“

”بہن! تم فکر نہ کرو، تم اپنے آپ کو مضبوط کر لو تو کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“ منظور احمد نے کہا اور اپنی بیوی کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ اٹھتے ہوئے منظور احمد نے کہا ہم آپ کے پاس آتے رہیں گے۔ دونوں میاں بیوی گھر آ گئے۔ منظور احمد نے بیوی سے کہا کہ جو تم نے میرا موٹر سائیکل خریدنے کے لئے رقم رکھی ہوئی ہے وہ کتنی ہے؟

”کوئی پانچ چھ ہزار روپے ہوں گے۔“ بیوی نے کہا۔

”وہ رقم لے آؤ۔“ منظور بولا۔

بیوی اندر گئی اور ایک خاکی رنگ کا بڑا سا لفافہ پکڑے آ گئی اور منظور کے سامنے رکھ دیا اور کہا گنتی کر لو منظور احمد۔ گنتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لفافہ اٹھاؤ اور اس میں جو بھی ہے وہ اس بیوہ کو دے آتے ہیں۔ منظور احمد نے کہا۔ بیوی نے کوئی پس و پیش نہ کی اور دونوں نے پھر جادروانہ کھنگٹایا۔ بیوہ نے دروازہ کھولا، صحن میں جا کر منظور نے بیوہ کو لفافہ پکڑایا اور کہا۔ اس میں کچھ روپے ہیں، یہ اپنے ایک بھائی اور بہن کی طرف سے قبول کر لو۔ آئندہ بھی آپ کا یہ بھائی آپ کی مدد کرتا رہے گا۔ بیوہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے

سے انکار کیوں کر رہا تھا؟“ مالک نے استفسار کیا۔
 ”اُس کا خیال تھا کہ حج پر جانے سے اس کی
 تنخواہ رک جائے گی۔ بیوہ کو جب رقم نہیں ملے گی تو
 بیوہ کی آس ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا اس کے گھر کی
 نگہبانی کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ بات منظور احمد نے
 مجھ سے کہی تھی اور میں نے اسے تسلی دی تھی۔“ درکر
 نے مالک کو بتایا۔

اسنے میں منظور احمد کا گھر آ گیا تھا۔ منظور احمد کی
 بیوہ اور اس کا ایک رشتہ دار مالک کا انتظار کر رہے تھے
 انہیں اطلاع مل چکی تھی۔ مالک کو الگ چھوٹی سی بیٹھک
 میں بٹھایا۔ مالک نے تعزیت کی فاتحہ پڑھی اور منظور
 احمد کی بیوہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”بہن ہماری طرف سے یہ تھوڑی سی کاوش ہے
 قبول کیجئے۔“ ایک لفافہ منظور کی بیوہ کو دیا اور کہا۔ ”ہر
 ماہ منظور احمد کی تنخواہ پوری کی پوری مع عیدین، الاؤنس
 اور دیگر مراعات باقاعدگی سے ملتی رہیں گی۔۔۔۔۔ اور اگر
 آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات کرنی ہے؟“ مالک
 نے کہا۔

”جی فرمائیے؟“ منظور کی بیوہ بولی۔

”آپ کی کوئی ہمسائی ہے جو بیوہ ہو گئی ہے۔
 جتنی مراعات آپ کو ملیں گی اتنی ہی اُس کو بھی دی
 جائیں گی۔ ہم منظور احمد کی روایات کو جاری رکھیں گے
 لیکن وہ آپ تک پہنچ جایا کرے گی اور آپ نے حسب
 روایت ان تک پہنچا دینی ہیں۔ منظور احمد تو اللہ تعالیٰ اور
 اُس کے حبیب کا منظور نظر تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے
 اس کی اس سعی جلیلہ کو منظور کر کے اُس کے درجات بلند
 کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بھی یہ چھوٹی سی نیکی
 مقبول و منظور فرمائے۔“



فرمانِ رسول ﷺ

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔
 اس پر ظلم نہ کرے، نہ ہونے دے۔ جو شخص اپنے
 بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی
 ضرورت پوری کرے گا۔ جو کسی کی مصیبت دور
 کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے
 ایک مصیبت دور فرما دے گا اور جو کسی کے عیب
 چھپائے گا، اللہ قیامت کے دن اس کے عیب
 چھپائے گا۔

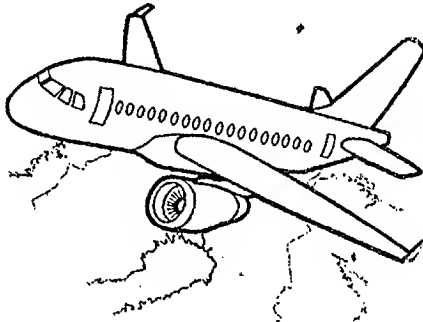
لکھی۔ منظور احمد نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے،
 سر پر بوسہ دیا اور اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔
 منظور کی بیوی بھی بیوہ سے بغلگیر ہو گئی۔

صاحب جی! اب منظور کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ماہ
 کی تنخواہ سے نصف رقم اپنی بیوی کے ہاتھ بیوہ کو بھجوا دیتا
 تھا۔ بیوی اور بیوہ کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کسی کو
 بالکل اشارتاً بھی نہ بتانا۔ بیوی کو کہہ رکھا ہے کہ جب
 بھی تم بیوہ کے ہاں جاؤ میری طرف سے اس کے سر کا
 بوسہ لینا اور کہنا یہ بھائی کے حصے کا بوسہ ہے۔ خود
 روزانہ رات کو لگی سے گزرتے ہوئے اس کے گھر پر نظر
 رکھتا تھا کہ کوئی لوہر لنگا اسے تنگ نہ کرے۔ اس طرح
 کرتے ہوئے منظور احمد کو دو سال ہونے کو ہیں۔

”یہ بات میرے، اُس کی بیوی اور بیوہ کے علاوہ
 کسی کو معلوم نہیں۔“ درکر نے واقعہ مالک کو سناتے
 ہوئے کہا۔ مالک رومال سے آنسو پونچھے جا رہا تھا اور
 اس کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکل رہے تھے۔

”واہ، منظور احمد واہ۔ تو کتنا خوش نصیب تھا، ہم
 کتنے بدنصیب ہیں۔“ پھر اس نے درکر سے کہا۔ ”یہ تو
 بتا کہ یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن منظور احمد حج پر جانے

ہیں اٹلی اٹلی جہاز



اڑ ہوئیں آئی اور مجھے کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ گلے کے پرابلم کے باوجود میں یہ حسیں آفریٹھکرانہ لگا۔ اتنے خلوص اور پیار سے تو ایسی نازنین چوہر قد بھی پیش کرتی تو کس کا فکرو جرات انکار تھی۔

چکوال

☆ محرم اور سن الیگزینڈر

تو دستیاب نہیں ہے، البتہ کونیکٹنگ (Conecting) فلائٹ مل سکتی ہے۔

”وہ کیا ہوتی ہے؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا؛

”بجلی کا کنکشن سنا ہے؟“ ناصر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”گیس کا اور ٹیلیفون کا کنکشن سنا ہے؟“

”یار! یہ سب تو سنا ہے مگر ان باتوں کا فلائٹ سے کیا تعلق؟“ میں جھنجھلا کر پوچھا۔

”لفظ کنکشن پر زور دو تو تمہیں سب سمجھ آ جائے گا۔“ ناصر نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا منہ ہٹکنے لگا۔

یہ غالباً 1980ء کے اوائل کی بات ہے۔ میں سندھ میں اوجی ڈی سی میں جاب کر رہا تھا کہ میرے ایک سرن نے ابوظہبی سے میرے لئے ورک پرمٹ (ویزہ) بھیج دیا۔ جاری سروس کو لات مار کر فوری طور پر گھر پہنچ گئی۔ کاغذی کارروائی مکمل کر کے اپنے ایک دوست اور سرن مظہر کہوٹ کو ساتھ لیا اور ابوظہبی کے لئے ٹکٹ حاصل کرنے ایک ٹریپول ایجنٹ کے ہاں جا دھمکے۔ مذکورہ ٹریپول ایجنٹ جس کا نام ناصر ہے، ہمارا ایک نہایت بے تکلف دوست تھا۔

ناصر نے میز پر پڑے کاغذات کو انٹ پلٹ کر دیکھ (اُس وقت کمپیوٹر کا دور نہ تھا)، پروازوں کا شیڈول چیک کیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ابوظہبی کے لئے فوری طور پر ڈائریکٹ فلائٹ

جائے گا۔ ناشتہ جہاز میں ملے گا اور کچھ.....؟“

”یار! ایسا نہیں ہو سکتا..... کہ.....“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے مدھم سے لہجے میں کہا۔ ”کہ ہوٹل والے تین چار دن مزید میری میزبانی کا شرف حاصل کریں؟“

”بالکل نہیں۔“ ناصر شنگ سے لہجے میں بولا۔ ”اب جاؤ، شاباش! مجھے دوسرے کلائنٹس کو بھی اٹینڈ کرنا ہے۔ جیسے کہا ہے دینا ہی کرنا۔“

میں اور مظہر بھائی واپس آ گئے۔ روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مقررہ دن، مقررہ وقت پر مظہر مجھے اسلام آباد انزپورٹ پر ڈراپ کرنے آیا اور وقت رخصت رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

”بورڈنگ کارڈ لیتے دقت کا ڈنٹر دلی گوی سے کہنا۔ پلیز! ونڈر ڈیٹ دے دیں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”بڑا مزہ آئے گا، باہر کے نظارے بھی Enjoy کرنا۔“

مظہر سے الوداعی ملاقات کر کے ڈیپاچر لاؤنج میں داخل ہوا۔ پی آئی اے کے کاؤنٹر پر دفائی ایک چندے آفتاب، چندے ماہتاب حسینہ براجمان تھی۔ مظہر دلی فصیحیت یاد آ گئی مگر ساتھ یہ دھڑکا بھی لگا کہ کہیں محترمہ بُرا نہ مان جائیں، ٹکٹ آگے بڑھایا اور ساتھ ہی جھپکتے ہوئے کہا۔

”پپ..... پلیز ونڈر ڈیٹ دے دیجئے گا۔“

محترمہ نے ایک لطیف سی مسکراہٹ میری طرف اچھالی، منہ سے کچھ نہ بولی۔ بقول ملکہ ترنم نور جہاں۔

”بھانویں بول تے بھانویں نہ بول چٹاں!“

وہ اٹھ کھڑی ہو کر کول چٹاں!“

بورڈنگ کارڈ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے جو کارڈ کوالٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے تو کہیں بھی ونڈر ڈیٹ

”ارے بے وقوف آدمی۔“ ناصر نے تیز نیچے میں کہا۔ ”اسلام آباد سے کراچی اور کراچی میں کچھ قیام کے بعد وہاں سے ابوظہبی کے لئے جو فلائٹ ملے گی اسے کوئی ٹنگ فلائٹ کہتے ہیں۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ”اسی میں سیٹ کنفرم کرا دو..... مگر ذرا جلدی۔“

ناصر نے مختصر سی کارروائی کر کے اسلام آباد، کراچی، ابوظہبی کا ٹکٹ بنا دیا اور کرائے کے پیسے وصول کر کے اپنی میز کی دراز میں محفوظ کر لئے۔

”پرسوں میں تاریخ کو شام پانچ بجے تم نے اسلام آباد انزپورٹ پہنچ جانا ہے۔“ مزید تفصیل بتاتے ہوئے ناصر گویا ہوا۔ ”فلائٹ نمبر PK..... سات بجے کراچی کے لئے روانہ ہو کر تقریباً 9 بجے کراچی انزپورٹ (پرانے) پر لینڈ کرے گی۔ تم جوں ہی ارائیول لاؤنج میں پہنچو گے وہاں پی آئی اے کے ایک کاؤنٹر پر ایک ٹکی ٹیجی ہوگی۔“

”اچھا؟“ میں نے بے حد اشتیاق سے کہا۔

”اے تمہارا اسلام دوں۔“ میری زبان نہ رک سکی۔

”یار! ایک تو تم فضولیات میں وقت بہت ضائع کر دیتے ہو۔“ ناصر تنگ آ کر بولا۔ مزید کہنے لگا۔

”اے صرف یہ ٹکٹ دکھانا وہ تمہیں ایک داد چر بنا کر دے گی۔ جس ہوٹل کا نام بتائے گی اس ہوٹل کی گاڑی باہر کھڑی ہوگی۔ گاڑی میں بیٹھ کر مذکورہ ہوٹل چلے جانا۔ پیرا دوڑا آئے گا اور تمہارا سامان لے کر کاؤنٹر پر جا کر تمہیں کمرہ دلوائے گا۔ کمرے کی چابی لے کر تمہیں مؤذنہ انداز میں کمرے تک چھوڑنے آئے گا۔ کمرے میں داخل ہو کر اسے کچھ ٹپ (TIP) دے دینا۔ رات کا کھانا تمہیں ہوٹل سے بغیر کسی ادائیگی کے مہیا کیا جائے گا۔ صبح تمہیں جگا کر پی آئی اے کے حوالے کر دیا

میں نے جہاز کا اندرونی ایٹ موس فیز (سوری مجھے اس کا اردو متبادل لفظ نہیں مل رہا) بے حد خوشگوار سا محسوس کیا۔ زندگی میں پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی تھی۔

میرے دماغ میں ایک پنجابی نغمے کے بول گونجنے لگے۔

”میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال“

جہاز کے رسم و رواج پورے ہونے کے بعد جہاز نے اڑان بھری۔ مظہر نے صحیح کہا تھا باہر کے مناظر دیکھ کر میں بے حد محفوظ ہوا۔ میری مثال اس دیہاتی کی سی تھی جو پہلی بار شہر میں آیا ہو اور رنگا رنگ روشنیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔

کچھ دیر بعد ایک اور اڑ ہوٹس آئی اور مجھے کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ گلے کے پرابلم کے باوجود میں یہ حسیں آفر ٹھکرا نہ سکا۔ اتنے خلوص اور پیار سے تو ایسی نازنین چو عرقہ بھی پیش کرتی تو کس کافر کو جرأت انکار تھی، لہذا کے پی گیا۔

مذکورہ مشروب کی لذت ابھی منہ سے ذائل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک اور کرینڈ کپور قسم کی شے آگئی۔ لہجے میں دنیا جہان کا شہد گھول کر مخاطب ہوئی۔

”سر! آپ چائے لیں گے یا کافی؟“

”چچ..... چائے ہی..... ٹھیک رہے گی۔“ سر نے شپٹا کر جواب دیا۔ کافی کا نام ہی سنا تھا کبھی پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ سوچ کر چائے کو ترجیح دی کہ پتہ نہیں کافی کیسے پی جاتی ہے۔

کہاں گھر میں پیئم کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے، جسے چائے کی بجائے چرائیہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا اور تیوری پر مل پڑے ہوئے انداز میں چائے کی پیالی وصول کرنا اور کہاں یہ مہمان نوازیوں۔ ایسا محسوس ہوا کہ اعمال کی کوئی نیکی اللہ پاک کو بھاگنی

نظر نہ آیا۔ بُرا سا منہ بنا کر انتظار گاہ میں آکر بیٹھ گیا۔ مذکورہ فلائٹ کی روائی کا اعلان ہوا تو تمام مسافروں نے ہمراہ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے مسافروں کی بھیڑ میں گھس گیا کہ کہیں پائلٹ مجھے یہاں چھوڑ کر جہاز اڑا نہ لے جائے۔ باہر کھڑی بس میں سوار ہو کر جہاز کے قریب جاتے رہے۔

”باپ رے باپ.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اتنا بڑا جہاز..... بندے تو کیا اس کے نیچے سے تو گاڑی بھی گزاری جاسکتی ہے۔“

میں نے جہاز کے نیچے کچھ لوگوں کو ادھر ادھر جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ میں نے جہاز کو اتنے قریب سے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

دیگر مسافروں کے ہمراہ میں بھی لائن میں لگ گیا۔ سیڑھیاں طے کر کے جہاز کے داخلی دروازے پر پہنچا تو ایک حورِ عرب نے ایک دلفریب سی مسکراہٹ کی پھوار برس کر السلام علیکم کہا۔

”وعیکم السلام..... ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....“ میں نے پورے طور پر اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر سلام کا جواب دیا۔

محترمہ کے اس طرزِ استقبال سے میں بے حد متاثر ہوا۔ کرائے کے آدمیے تو یہیں پورے ہو گئے۔ آگے بڑھا تو ایک اور حسینہ عالم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مسکرا کر میرا بورڈنگ کارڈ طلب کیا۔ کارڈ دیکھ کر مجھے میری سیٹ تک پہنچایا اور ایک قتلانہ سی مسکراہٹ نبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

”سر! یہ ہے آپ کی سیٹ۔“

سر نے بڑی عجلت میں اپنی سیٹ سنبھالی جو کہ واقعی جہاز کی کھڑکی سے منسلک تھی۔ محترمہ کا شکریہ ادا کیا۔ کرائے کے باقی پیسے بھی پورے ہو گئے اور بقیہ سفر مفت میں پڑ گیا۔

”کٹ پلینز!“ محترمہ نے ایک ٹکٹ سی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ایسا محسوس ہوا محترمہ سیاجن کے محاذ سے تازہ تازہ وارد ہوئی ہیں۔

”اوہو... اچھا!“ میں نے شپٹا کر کہا۔ کم بخت زبان پھسل گئی۔ ”میں سمجھا آپ نے ہاتھ مانگا ہے۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ اس نے خشمگین نظروں سے گھور کر پوچھا۔

”کٹ... کچھ... کچھ نہیں۔“ میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور جلدی سے کٹ کے ساتھ پاسپورٹ بھی آگے بڑھا دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے پاسپورٹ واپس دکھایا، لہجہ بدستور جارحانہ ہی تھا۔

کٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پاس پڑی ہوئی ایک بک پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ لکھائی مکمل ہوئی تو مبینہ واد چرمیری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

”باہر ہوٹل مڈوے کی گاڑی کھڑی ہے، اس میں بیٹھ کر ہوٹل جائیں اور صبح بروقت ویپار جہ لاؤنج میں پہنچ جائیں۔“ لہجہ میں بدستور مارشل لاء کی مہک رچی بسی تھی۔

میں ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر رہ گیا۔ عادت سے مجبور ہو کر خود ہی جو پنگا لیا تھا۔ میری مثال اُس خچر کی طرح بن گئی جس نے ایک بم کو دہشت گردی جھاڑ دی تھی۔ میں نے اس ہدایت نامے پر حرف بحرف عمل کیا۔ ٹریپول ایجنٹ ناصر نے بھی کچھ اسی قسم کے پند و نصائح کئے تھے۔ مذکورہ ہوٹل پہنچ کر استقبالیہ پر ”رپورٹ“ کی۔ کمرے کی چابی لی، بیرے سے بیگ اٹھوایا اور کمرہ نمبر 302 کے روبرو پہنچے۔

”یا اللہ خیر!“ کمرے کا نمبر دیکھ کر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ بیگ کمرے میں رکھا بیرے کو دس کانٹ پیش

ہے اور بہشت بریں کا یہ ٹریڈ دکھایا جا رہا ہے۔
”بس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“

چائے کے ساتھ ٹرے میں چینی کی پڑیا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ دیکھا۔ پیکٹ کھولا تو سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا ہے یا بکٹ وغیرہ چلو جو بھی ہے قبول ہے۔ اس انداز کی میزبانی میں تو کوارگنڈل بھی چونسہ آم کی پھانک سے بڑھ کر شیریں لگتی ہے۔ ایسے محسوس ہوا محترمہ ابھی کہہ دے گی کہ یہ دل آپ کا ہوا۔ کھاپی کر بڑے خلوص سے پی آئی اسے کو دعائیں دیں اور ان لوگوں کو دل میں کوسا جو اپنی قومی ازمائش میں کینڑے نکالتے ہیں۔

اعلان ہوا کہ ہم کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ ہوا چاہتے ہیں۔ جہاز لینڈ ہوا، دروازے کھلے اور مسافر باہر نکلنے شروع ہو گئے۔

لاؤنج میں پہنچے۔ نگاہوں کو چاروں سمت گھمایا نور کے ایک ہالے پہ نگاہ جم گئی۔ پی آئی اسے کے ایک کاؤنٹر پر ایک قیامت ایسا تھکی۔ سرد قد، آجوشم، قدھاری انارکلی مثل دیکھتے رخسار، مالٹے کی قاشوں جیسے لب۔ میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے۔ علامہ اقبال

بقید حیات ہوتے تو یہی کہتے ”یہ چار عناصر ہوں تو بنتی ہے پی آئی اسے کی گراؤنڈ ہوٹس“۔ میں سحر زدہ انداز میں اس دیکھتے شعلے کی جانب بڑھا۔ قرب پہنچا تو موصوفہ نے کاؤنٹر کی اوٹ سے اپنا دست تھانی نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے بھی جواب آن غزل کے طور پر ایسا ہی کیا۔ محترمہ کے درخشاں چہرے سے مسکراہٹ کی لہریں معدوم ہو گئیں اور قہر و غضب کی بجلیاں لپکنا شروع ہو گئیں۔

”یا اللہ خیر!“ میں نے دل میں کہا۔ ”مجھ سے کیا خطا سرزد ہو گئی؟“

کیا۔

سہ! کھانا ڈانٹنگ بال میں کھائیں گے یا کمرے میں لے کر آؤں؟“ بیرانوٹ جیب میں ٹھونس کر مؤذبانہ انداز میں بولا۔

”بال میں ہی ٹھیک رہے گا۔“ میں نے پروقار انداز میں جواب دیا۔

گراؤنڈ ہوش کے مسموم اثرات زائل کرنے کی کوشش کی اور بیرے کی معیت میں ڈانٹنگ بال میں داخل ہوا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کسی عربی شہزادہ کا دلیمہ ہے۔ انواع و اقسام کے کھانوں سے پُر میزیں سجی ہوئی ہیں۔ مہمان بڑے صبر و تحمل سے اپنی اپنی پسند کے کھانے پلیٹوں میں ڈال کر پروقار انداز میں کھا رہے ہیں۔ میں نے بھی ایک میز سے پلیٹ اٹھائی اور اپنی پسند کا سامن ڈال کر ایک میز پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی کولڈ ڈرنک بھی۔ کھانا کھا کر لمبی لائن لگی سویٹ ڈشز کے پاس جا کر پسندیدہ ڈش کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ صبح بیرے نے دروازہ بجا کر آواز دی۔

”سر! اٹھ جائیں، آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔“

فوری طور تیار ہو کر ہٹل کی گاڑی میں سوار ہو کر ایئر پورٹ سے انٹرنیشنل ڈیپارچر لاونج میں پہنچ گیا۔ کل والا سبق دہرایا گیا۔ بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے، امریکریشن کا دریا عبور کیا اور دیگر مسافروں کے ہمراہ انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد ہماری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا۔ حسب سابق ایک بس میں بیٹھ کر جہاز کے قریب پہنچے۔ یہ تم بخت جہاز تو گزشتہ روز والے سے بھی جسامت میں بڑا تھا۔ انسانی عقل پر دنگ رہ گیا کہ اتنی بڑی بلا کیسے ہوا میں تیرتی ہے۔ پہلے

پی آئی اے

طیارہ حادثہ کی رپورٹ جب اسمبلی میں پیش ہوئی تو انکشاف ہوا کہ پی آئی اے کیسے برباد ہوا۔

کل جہاز 32 اور پائلٹ 856 عدد۔ ان میں 262 پائلٹ میٹرک پاس اور جعلی لائسنس والے۔

256 پائلٹس نے خود امتحان نہیں دیا بلکہ کسی اور نے ان کی جگہ امتحان دیا۔

یہ سب بھوتیاں سابقہ دور میں خورشید شاہ اور مشاہد اللہ خان کی سفارش پر ہوئیں۔ اب وہ کہتے ہیں کسی پائلٹ کو نہ نکالیں بلکہ ان کی تنخواہ آدھی کر دیں۔ واہ تیرے صدقے!

کی طرح مسکراہٹوں کی کل پاشی سے ہوتا ہوا اپنی سیٹ پر جو کہ وینڈو سیٹ تھی، براجمان ہو گیا۔ روانگی کے ضروری مراحل طے ہوئے اور جہاز نے اڑان بھری۔

دور دور ہوتی ہوئی ارض پاک پر نمناک آنکھوں سے آخری نگاہ ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ کیا پتہ یہ پاک سرزمین دوبارہ دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو اور اگر نصیب میں ہو تو اپنے تمام پیاروں کے چہرے دیکھنے کو ملیں یا کچھ خاک کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہوں۔ کل والا چلبلاپن آنکھوں کی نمی میں ڈوب گیا۔ اڑائیں کا بہترین ناشتہ بھی بے مزہ سا محسوس ہوا۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز نے ابوظہبی کے ایئر پورٹ پر لینڈ کیا۔ باہر نکل کر میز صی پر قدم رکھتے ہوئے پہلی بار ایک غیر ملکی فضا میں ایک لمبی سی سانس لی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

”سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے؟“



المیہ

شرافت ضیاء - اسلام آباد

کرپشن نے گرائی نے ہمیں اس طور لوٹا ہے
کوئی جتنا بھی سچ بولے یہی لگتا ہے جھوٹا ہے

بڑا جتنا لئیرا ہے وہ اتنا ہی سیانا ہے
اسے معلوم ہے کہ کس طرح پیسہ بنانا ہے

کلرکوں پادشاہوں کے وہ سارے رنگ سمجھتا ہے
کسی سے کام کروانے کے سارے ڈھنگ سمجھتا ہے

تعلق مقتدر حلقوں سے کچھ ایسے بناتا ہے
انہی کے ساتھ عیدیں اور شہزادیاں مناتا ہے

ٹیپروں کا یہی ماٹو ہے کہ قسمت کھری کر لو
تجوری لوٹ کے اموال سے اسباب سے بھر لو

کہیں چینی کا چکر ہے کہیں بحران آئے گا
انہیں کرنا نہیں آتا ہے سودا کوئی گھائے گا

انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ کورونا سب کو آ لے گا
ہزاروں لوگ یوں بیٹھے بٹھائے مار ڈالے گا

بظاہر سرکشوں کے واسطے اک تازیانہ ہے
مگر اب زد میں اس کی آچکا سارا زمانہ ہے

کسی کو بھی نہیں معلوم کب یہ جان چھوڑے گا
نہ جانے اور کتنوں کی ابھی گردن مروڑے گا

تمنا ہے کہ عصیاں کار نیکو کار بن جائیں
خزانہ لوٹنے والے دیانت دار بن جائیں

تہائیاں

تہائیوں کا مارا ہوا بوڑھا اقبال نہ جانے رات کے س لمحے اپنی شمع کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنی
تہائیاں آباد کرنے، اپنے دکھوں کا مداوا کرنے یا پھر اپنے اللہ سے یہ پوچھنے کہ اے خالق، اے
مالک میری تخلیق میں ایسا کون سا راز تھا، تیری ایسی کون سی رضا شامل تھی کہ میں ساری زندگی
تہائیوں اور محرومیوں کا شکار رہا۔ یہ تہائیاں میرے مقدر کے ساتھ کا جھومر کیوں بنی رہیں؟

جہلم

☆ سیدہ شاہدہ شاہ



وہ

ایک سرد ترین رات تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں نے اس سرد ترین رات کی سیاہی میں خوفناک حد تک اضافہ کر دیا تھا۔ اچانک ایک زوردار گرجا کے ساتھ بجلی چمکی جس نے کائنات پر چھائی ہوئی خاموشی اور تاریکی کا سینہ پل بھر کے لئے چاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ شاید کہیں قریب ہی کسی شجر، کسی حجر پر بجلی گری تھی۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

”شیع لاج“ کے ایک بچے بجائے کمرے میں ستر سالہ اقبال، ماحول کی تمام تر ہولناکی سے بے نیاز اور بے خبر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا جس کے گرد موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ گاہے بگاہے نظریں اٹھا کر دیوار پر لگے ہوئے کلاک کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دیوار گیمہ کلاک کی سوئیوں نے بارہ کے ہندسے کو چھو لیا تو رات کے سنانے میں کلاک کی ٹین ٹن نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ بوڑھے اقبال نے ٹیچف و ناتوان آواز میں ”پپی نیو ایئر، پپی میرج میری اینورسری ٹو“ کو ایک نئے کی صورت میں بڑے سر سے لگایا۔ پھر ایک ایک موسم بتی کو پھونک مار کر بجاتے ہوئے قریب ہی پلیٹ میں رکھی ہوئی چھری سے کیک کاٹن شروع کر دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کٹے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دیوار پر لگی ہوئی ایک قدر آور فریم والی تصویر کی طرف بڑھا۔

”شیع!“ اس نے کیک کا ٹکڑا اس سے منہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ دیکھ لو میں باوجود تنہا رہ جانے کے ابھی تک اس خوبصورت دن کو نہیں بھولا۔ جب تم نے بہار بن کر میری ازدواجی زندگی میں رعنائیاں بھر دی تھیں۔ تمہیں

یاد ہے ناں، آج ہی کے دن ہم نے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کی تھیں۔ برس ہا برس پہلے وہ آئینیں دسمبر ہی کی رات تھی جب جلد عروسی میں ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے عہد و پیاں کئے تھے۔ ایک دوسرے کے سنگ سنگ جینے مرنے کے قول و قرار کئے تھے۔ مگر پھر تم ایک روز مجھ سے اچانک ناطہ توڑ کر دور بہت دور نیلے آسمانوں کے اس پار، اس دیس کو چلی گئیں جہاں سے لوٹ کر کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔ شمع! تنہا رہے بغیر میرا دل نہیں لگتا اس بھری دنیا میں۔ تمہارے بغیر میری زندگی ویران ہو چکی ہے۔ میں زیست کے پتے ہوئے لقا و دلق حیرا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ تم کیوں مجھ سے اتنی دور چلی گئی ہو۔۔۔ کیوں چلی گئی ہو؟“ اتنا کہہ کر وہ واپس صوفے کی طرف مڑا، کیک کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھا اور صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

✽✽✽

مکتبیں تادان مانگتی ہیں، خراج چاہتی ہیں، قربانیاں طلب کرتی ہیں اور اقبال نے بھی اس راہِ محبت میں اپنے عمر بھر کے رشتوں کا بھرپور تادان دیا تھا۔ خراج کے نام پر اپنے گھر کی چار دیواری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ قربانیوں کے نام پر ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب سب کچھ درگاہِ محبت کی بھینٹ چڑھا دینے تھے اور شادی کے تیسرے مہینے ہی شمع کا ہاتھ تھام کر تن کے تین کپڑوں کے ساتھ اپنے والدین کے حکم پر وہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا جس گھر کے چپے چپے سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔ گھر سے باہر نکلتے وقت اس نے مڑ کر اس گھر اور گھر کے مینوں کی طرف آخری بار دیکھا تھا۔ جن کے چہروں پر فحش مندی کی چمک تھی۔ اپنے مقاصد کی کامیابی کی روش

مسکرا بیٹیں تھیں۔ سوائے اس کی بڑی بہن ساجدہ اور ماں کے جن کی ڈبڈبائی آنکھوں اور اداس چہرے پر ایک ہی التجا تھی۔

”نہ جاؤ، اقبال! اس گھر سے یوں نہ منہ موڑو کہ ہم تمہاری شکل کو بھی ترس جائیں۔“ ایک لمحے کے لئے وہ ڈمگا بھی گیا مگر اپنے والد کے تلخ الفاظ اس کے کانوں میں گرم گرم پچھلے ہوئے سیسے کی طرح آگ لگا رہے تھے۔

”دفع ہو جاؤ اس گھر سے اور جب زمانے بھری اور در در کی ٹھوکریں کھنا کر واپس لوٹنے کی کوشش کرو گے تو یہ سوچ لینا کہ اس گھر کے دروازے تم پر آج کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔“ ان الفاظ نے اس کے عزم کو اور بھی پختہ کر دیا اور اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا کہ وہ مرتے مرنے کے لئے اپنی لاش کو بھی اس گھر واپس نہ لانے کی وصیت کر جائے گا اور اس نے تھکے تھکے قدموں سے شمع کے ہمراہ اس گھر کی دلیلیز پار کر لی تھی۔

اقبال کی کہانی بھی عجیب تھی۔ بہن بھائیوں میں وہ تیسرے نمبر پر تھا۔ وہ جب پیدا ہوا تو بتانے والے بتاتے ہیں کہ اس کی ماں دروزہنگی سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی رنگت اپنے بہن بھائی کی نسبت کالی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخی مائل تھیں۔ وہ عام بچوں کی طرح پیدائش کے وقت رویا نہیں تھا بلکہ مکر ٹکر ہر ایک کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کیس زچگی اگرچہ سرکاری ہسپتال میں ہوا تھا، جہاں تجربہ کار اور پڑھی لکھی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں وغیرہ تھیں۔ پڑھے لکھے لوگ عام طور پر تو ہم پرست نہیں ہوتے، وہ عملی لوگ ہوا کرتے ہیں اور ہر بات کی اللہ کے بعد سائنسی توجیہات پیش کیا کرتے ہیں۔ مگر اقبال کی غیر معمولی پیدائش اور حرکات و سکنات کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام میڈیکل سٹاف جو وہاں موجود تھا، اپنی

تمام تر روشن خیالی اور عملی نظریات کو بھولی کر اس بات پر متفق تھا کہ یہ بچہ عادات و اطوار کے لحاظ سے ایک غیر معمولی بچہ ہے۔ کسی نے کہا۔ اس کی ماں اس کو جنم دیتے ہوئے شدت درد زہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ یہ بچہ ساری زندگی پیار و محبت کے لئے ترستا رہے گا۔ بعض نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ یہ بچہ پیدائش کے وقت خلاف معمول رویا نہیں اس لئے یہ تا عمر آرزوہ اور پریشان پریشان رہے گا۔ کچھ نے منفقہ طور پر یہ رائے دے دی کہ یہ بچہ تا عمر عدم توجہ تہائیوں اور محرومی محبت کا شکار رہے گا۔ یوں وہ ننھا مناسا اقبال جسے دنیا میں آئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہ ہوا تھا، اس کے متعلق منفی پروپیگنڈا شروع ہو گیا اور وہ معصوم سا بچہ گرد و پیش سے بے نیاز ارد گرد کے ماحول اور لوگوں کو مکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ وہاں پر موجود لوگوں کی باتوں، ان کی سوچوں، ان کے خیالات میں کس حد تک سچائی تھی، وہ تو مستقبل کے دھندلوں کی دیز تہہ میں پچھی ہوئی تھی۔ مگر میڈیکل کی تاریخ میں ایسی غیر معمولی پیدائش کے ہزار ہا واقعات اور کیس ہوتے ہیں اور بعد میں آنے والے حالات یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان تمام غیر معمولی صورت حال میں جنم لینے والوں نے بھی بالکل نارمل انسانوں کی طرح ہی بھرپور زندگی گزاریں غیر معمولی پیدائش کی ”مخوست“ ان کے مستقبل پر کسی طور پر بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔

اقبال نفرتوں اور محرومیوں کے اس گھنے ہونے جس زندہ ماحول میں کسی خود رو پودے کی طرح پروان چڑھنے لگا۔ شیر خوار کے دور میں ہی اسے نظر انداز کیا جانے لگا۔ وہ سارا سارا دن بستر پر لیٹا اپنے ننھے سنے ہاتھ پاؤں چلا چلا کر کھیلتا رہتا۔ بھوک گنتی تو رو رو کر اپنی بھوک کا اعلان کرتا۔ ماں کے کانوں میں اس کے رونے کی آواز پڑتی تو وہ گھر کے کام کاج میں مصروف

تھیں میں سکول کی کتابیں ڈالے جس میں رومال میں بندھی ہوئی روٹی اور اس پر رکھا ہوا اچار لے کر سکول جاتا ہوا اقبال انہیں بڑی معصوم اور عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتا۔ جب تک اس کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے، ایک ہی باپ باپ کی اولاد کے درمیان ہونے والے اس امتیازی سلوک کو بالکل بھی نہ سمجھ پایا۔ مگر بڑھتی ہوئی عمر اور ہر سال ملے کرتے ہوئے تعلیمی مدارج کے ساتھ ساتھ جب اس کا پختہ ہوتا شعور بھی بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تو اس کو اس امتیازی سکول کا کچھ کچھ اور اک ہونے لگا۔ آٹھویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے اس کے مزید دو بھائی اور دو بہنیں بھی اس دنیا میں آ چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اقبال کے علاوہ اس کے سارے بہن بھائیوں کی رنگت صاف اور نقوش انتہائی جاذب نظر تھے جبکہ اقبال کی رنگت کالی اور نقوش بھی بس واہبی سے تھے۔ گھر میں آنے والا ہر فرد جب اقبال کو نظر انداز کر کے اس کے بہن بھائیوں کو پیار کرتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اگر کبھی فرط محبت سے بے تاب ہو کر چھوٹے بہن بھائیوں کو پیار کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی بڑی بہن، بھائی اور دوسرے چیل کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔

”چھوڑ دے اس کو کہیں اپنی سیاہ رنگت کا داغ اس کو بھی نہ لگا دینا“۔ کہتے ہوئے اسے پرے دھکیل دیتے۔

اس امتیازی اور دہرے سلوک نے اسے بے حد حساس بنا دیا۔ جب تک اس کا شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ نفرتوں کے ان توہین آمیز رویوں کو سمجھ سکتا، وہ یوں ہی ننھا تنہا اور بولایا بولایا ہر اُس رشتے کی طرف لپکتا رہا، دوڑتا رہا، کھینچتا چلا جاتا رہا جہاں سے اسے محبت اور پیار کی ذرا سی بھی امید کی کرن دکھائی دیتی۔

یہاں بھی ہوتی زکریا جاتی اور اسے بڑے پیار سے پتے پتے سے لگا کر اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتا۔ بہت سے بچے اور بچیاں بہن بھائی اس کے رونے سے پریشانیتے رہتے۔ کمرہ مال کہیں دور ہوتی تو وہ روتا رہتا۔ بہت گھر کسی کے کان پر بول تک نہ رکتی۔ بسا اوقات وہ اپنے بھائی کی گند کی تھیں ہوا پڑا رہتا تھا اس پر تنبیہ کرتے مگر پاس سے گزرتی ہوئی بہن یا بھائی اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی کر آگے بڑھ جاتے۔ باپ کی نفرت تو پہلے دن سے ہی عیاں تھی۔ پیدائش سے لے کر اب تک باپ نے اسے ہٹھانا تو درکنار اس کی شفقت اور پیار کی فکر بھی ڈالنا گوارہ نہ کیا تھا۔ کالی رنگت اور واہبی سے نقوش ہی اس بے چارے کے لئے مہلک ثابت ہوئے تھے۔ پورے گھر میں صرف ماں کی محبت بھری ہوئی تھی جو اس کی جائے پناہ تھی۔ باپ، بہن اور بھائی اسے انتہائی متحرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس پر چہیتاں کستے رہتے مگر ماں کے لئے تو اقبال اس کی آنکھوں کا تاراج تھا۔ دنیا جہاں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ ماںیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ اولاد کے لئے ان کے حلقوں کے لئے زمانے بھر سے لڑ بھڑ جایا کرتی ہیں۔ اپنے لہو کے رشتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرتی ہیں۔

نفرت اور محرمیوں کے اس ماحول میں اقبال پروان پڑھتا ہوا زندگی کے مدارج طے کرتا رہا۔ سکول جانے کا وقت آیا تو اسے ایک سرکاری سکول میں داخل کر دیا گیا جبکہ اس کی بہن اور بھائی شہر کے معروف ترین اور مہنگے پرائیویٹ سکول میں پڑھ رہے تھے۔ بہترین یونیفارم میں ملبوس جب وہ بڑھیا قسم کے سکول بیک شاٹوں پر لڑکائے ہاتھوں میں نقوش اور پانی کی بوتلیں لئے ایک شانِ تفاخر سے گھر سے نکلتے تو ملیشیہ کے یونیفارم میں ملبوس، ایک بڑے سے کپڑے کے

اتنی چھوٹی سی عمر میں اور محبتوں اور پیار کی پیاس نے اس کے قلم میں وہ درد سمو دیا تھا کہ جب اس کی کہانیاں ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتیں تو ایک تنہلہ کچ جاتا۔ لوگ اپنے اس محبوب فنکار کو درود دیکھنے چاہتے تھے، اس سے ملنا چاہتے تھے۔ اس کے ہاتھ، اس کا وہ قلم چومنا چاہتے تھے جن سے ایسے ایسے شاہکار تخلیق ہوا کرتے تھے۔ مگر اپنے سگے بہن بھائیوں۔

اپنے باپ کے تمسخرانہ رویوں، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنے، اس پر توہین آمیز جملے اور آوازے کسنے کی بدولت وہ احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ اسے انسانوں سے خوف آنے لگا تھا۔

اس کے دل میں یہ دہم اور ڈر بیٹھ چکا تھا کہ وہ دنیا کا بد صورت ترین انسان ہے۔ جسے دیکھ کر بچے خوف کھا جاتے ہیں۔ بڑے، جوان، بوڑھے سب کے سب اپنی تعفن طبع کے لئے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی فنکار کے پرستاروں، اس کے چاہنے والوں نے اپنے محبوب فنکار کا ایک خیالی پیکر، ایک نخیل بنایا ہوتا ہے جو انتہائی خوبصورت، بے حد حسین ہوا کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں کے پرستاروں نے بھی اس کا ایک خیالی پیکر تراشا ہوگا اور وہ اپنی کہانیوں کے ہیروز کا جو خاکہ پیش کیا کرتا تھا ان کو پڑھ پڑھ کر تو لوگوں نے اسے کسی یونانی سنگتراش کا انتہائی حسین و جمیل مجسمہ سمجھ لیا ہوگا۔

وہ اپنے پڑھنے والوں کا یہ حسین بھرم ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس خوبصورت پیکر کو کراچی کرچی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا جو اس کے مداحوں، اس کے پڑھنے والوں، اس کے پرستاروں نے اس کا تراش رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس دن اس کے مداحوں نے اسے درود دیکھ لیا، ان کے تصورات میں تراشا ہو خوبصورت بت ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس کے مداح،

مگر جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اسے احساس ہو گیا کہ رشتوں اور انسانوں کے بحر بیکراں میں وہ تنہا تنہا اور لاوارث سا انسان ہے جس کے نصیبوں میں تنہائیاں ہی تنہائیاں ہیں، محرومیاں ہی محرومیاں ہیں اور اس کے نصیبوں میں پیار و محبت کا امرت ہے ہی نہیں۔ اسے انسانوں کے سیل رواں میں زندگی کا یہ سفر یوں بھی تشنہ تشنہ اور سب سے کٹ کر گھٹ گھٹ کر غلے کرنا ہو گا۔

اقبال نے اپنی ان تشکیوں، اپنی ان محرومیوں کا مداوا یوں کر کیا کہ اس نے کہانیوں کے اصنام تراشنا شروع کر دیئے۔ حساسیت، درد اور حد سے بڑھی ہوئی محرومیاں انسان کو یا تو مایوسیوں کے ان اندھیروں میں دھکیل دیا کرتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے تمام تر دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مختلف منشیات کے نشے میں یوں غرق کر دیتا ہے کہ سب غم، سب درد سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور یا پھر انتقام کی اندھی راہ پر چلتے چلتے وہ جرائم پیشہ استاد بن جاتا ہے۔ جو اپنی ہر محرومی، اپنے ہر درد کا ازالہ ہندوق اور ریوالور کی گولی کے زور سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر اقبال نے ان دونوں میں سے کوئی بھی راہ نہ چنی بلکہ آٹھویں جماعت سے ہی قلم کا تیشہ سنبھال لیا اور کہانیوں کے اصنام تراشنا شروع کر دیئے۔ بس گھر کے ایک تنہا گوشے میں بنی ہوئی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنے تصورات کی دنیا آباد کر لی۔

اس خیالی دنیا میں وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوبصورت ترین اور طاقتور ترین انسان سمجھتا جو ایک مافوق البشر مخلوق کی طرح ہر کس و کس کے دکھ درد دور کرنے کے لئے ہر شے کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اپنی اس خیالی دنیا میں اپنی ہر محرومی، اپنی ہر تشنہ، اپنے ہر دکھ کا مداوا فرضی اور افسانوی انداز میں سوچتا اور پھر انہیں الفاظ کا پیڑ بہن پہنا کر صفحہ قرطاس پر کھیر دیا کرتا۔

میں چلے جاتے جہاں اخبارات، رسائل اور دیگر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ ٹی وی کے شوقین ٹی وی سے دل بہلاتے مگر اقبال جھٹی والے دن اپنے لکھنے لکھانے کا شوق پورا کرتا رہتا۔

مختل اور پیار انسان میں اعتماد پیدا کیا کرتے ہیں۔ اقبال گھر والوں کی نفرت اور گھٹے ہوئے ماحول کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کے تضحیک اور توہین آمیز رویے نے اس سے اس کا اعتماد چھین لیا تھا۔ مگر آرمی کے ماحول، عسکری ساتھیوں کے پیار و محبت، اساتذہ اور دیگر سینئر آفیسرز کی طرف سے دی جانے والی عزت سے اس کا اپنی ذات پر اعتماد بحال ہونے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب ایک سال کی کڑی اور تھکا دینے والی ٹریننگ سے فارغ ہو کر اپنی مقرر کردہ پونٹ میں پہنچا تو وہ ایک با اعتماد سپاہی، ایک باوقار انسان اور بالکل ہی بدلا ہوا اقبال تھا۔ اس کی بھری ہوئی شخصیت کہیں دور بہت ہی دور گم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک بابرعب شخصیت والا آرمی کا تربیت یافتہ سپاہی تھا۔

ٹریننگ کے دوران وہ ایک دن کے لئے بھی گھر نہیں گیا تھا۔ نہ ہی اس نے تنخواہ کے پیسے گھر بھجوانے تھے۔ اس کا باپ ایک دو دفعہ اس کے ٹریننگ سینٹر میں آیا تھا اور پیسوں کا تقاضا کیا تھا مگر اس نے طریقے سے نال دیا تھا۔ نئی پونٹ میں پوسٹ کرنے سے قبل ٹریننگ سینٹر والوں نے انہیں ایک ایک ماہ کی جھٹی دی تھی۔

دن کے دو بج رہے تھے جب اقبال گھر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنڈ بیگ تھا۔ صاف ستھرے استری شدہ کپڑے پہنے، عسکری ٹریننگ کے مطابق گردن اکڑائے، سینہ تانے وہ بڑی شان سے چل رہا تھا۔ ناف اُسے صحن میں ہی مل گئی۔ اس نے یوں

پیار اور محبت سے معاف کرنے لگا جیسے وہ برسوں کے شناسا ہوں۔ اس کے گروپ میں تقریباً پچاس لڑکے تھے جو پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کے ہاکی تھے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے، غیر شناسا تھے، اس سے پہلے وہ کبھی ملے بھی نہ تھے، مگر ایک ہی دن میں ایک دوسرے سے یوں گھل مل گئے تھے جیسے برسوں کے شناسا ہوں، مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں، برسا ہا پر بس سے ایک ساتھ رہ رہے ہوں۔

دوسرے دن ان کی عسکری ٹریننگ شروع ہو گئی۔ انہیں چار پانچ انسٹرکٹرز مختلف قسم کے حربی ضربی اور عسکری فنون سکھایا کرتے۔ ایک آدھ انہیں چست پھرتیلے اور چاق و چوبند بنانے کے لئے پریپر (بے فوجی زبان میں ڈرل کہا جاتا ہے) اور فزیکل ٹریننگ جسے فوجی زبان میں (پی ٹی) کہا جاتا ہے، کروایا کرتے۔ فارغ وقت میں وہ مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر وہ دن بھر کی محنت مشقت اور بھاگ دوڑ سے تھک کر پچور پچور بدن سے بستر پر لیٹتے اور پھر اگلے دن علی الصبح ہی اٹھ کر تیار ہو جاتے۔ اقبال کو جو چیز سب سے اچھی لگی وہ یہاں کا ڈسپلن اور آپس میں اتفاق اور پیار تھا۔ یہاں ہر کوئی اپنا کام خود کرتا تھا۔ کوئی کسی کو ملازم یا نوکر نہیں سمجھتا تھا۔

کوئی کسی کا مذاق نہیں اڑایا کرتا تھا۔ سب ایک دوسرے سے انتہائی عزت اور پیار سے پیش آتے تھے۔ اقبال کو یوں لگا جیسے وہ گھر کے دوزخ سے نکل کر جنت میں آ گیا ہو۔ جھٹی والے دن تمام لڑکے دو دو، چار چار کے گروپ میں اجازت لے کر قریبی شہر یا باکریٹ چلے جاتے۔ کچھ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتے، بعض لڑکے ٹریننگ سینٹر کی کینٹین پر چلے جاتے اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کے گانے سنتے رہتے۔ مطالعہ کے شوقین لڑکے سینٹر کے ریکریشن روم

اچانک اقبال کو دیکھا تو فرط مسرت سے گنگ ہو گئی۔ ہمیشہ آپ کے ہاتھ پر رکھا کر دوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ ابو "ماں" اس نے بیگ زمین پر رکھا اور آگے بڑھ کر تیزی سے ماں کے نحیف و ناتواں جسم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے بوڑھے رخساروں پر بوسوں کی برسات کر دی۔ ماں نے بھی اپنے کمزور بازو اقبال کے گرد حائل کر دیئے۔

اقبال کی آواز سن کر اس کا باپ اور دیگر بہن بھائی بھی اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ سب رسی طور پر اقبال سے ملے۔ اقبال بھی ان سے سلام دعا کرنے کے بعد ماں کو لے کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"ماں" اس نے ماں کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے جیب سے پرس نکالا اور ماں کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ میری پورے سال کی کمائی ہے۔ میں نے یہاں سے جاتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ میں اپنی کمائی

چلا گیا۔ اس ایک ماہ میں ہی اس کے باپ اور بہن بھائیوں کو احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ پہلے والا اقبال نہیں رہا تھا جو ہمہ وقت ان کا ملازم بن کر ایک شہین ز طرز ان کے حکم کی تعمیل میں جتا رہتا تھا۔ نہ بڑے بہن بھائی اس سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، نہ چھوٹے بہن بھائیوں کی نظروں میں اس کا احترام تھا۔

باپ کی نفرت اور بہن بھائیوں کے برتاؤ نے اس کی خود اعتمادی چھین کر اتنے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر آری نے اسے احساس کمتری کے دباؤ سے نکال کر اعتماد کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اب اقبال

دست و گریبان کے بعد معروف مزاح نگار خادم حسین مجاہد کی

مذہب مزاح پرنٹل دوسری کتاب



قلم آرائی



قیمت 120 روپے

شائع ہو گئی ہے

صفحات 160

پرچہ جات

مضامین، کہانیاں

رازدار حیوانات

چور کی ڈائری

ادبی اجلاس

آنجنابی شاعری

از ادبیات تھسابی

ملنے کا پتہ: حق پبلشرز A-2 سید پلازہ چیمبر جی روڈ اردو بازار لاہور

Ph: 042-7220631, Mob: 0300-9422434

جن لوگوں کو ہم نے اپنی موت کا غم دے کر جانا ہے، کیوں نا ان کو زندگی میں کوئی خوشی دی جائے۔
(داصف علی داصف)
بالو کو بالآخر جینے کا فریضہ آ گیا۔

وقت کا کارواں دھیرے دھیرے ماہ و سال کی طرف رواں دواں رہا اور کئی تبدیلیوں کے سنگ میل عبور کرتا رہا۔ اقبال کی بڑی بہن اور بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اقبال بھی عسکری امتحانات پاس کرتا ہوا اب لانس ٹائیک بن چکا تھا۔ اس کا قلمی سفر بھی جاری و ساری تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پہلے ورد و عالم کا سفیر تھا مگر اب اس کے قلم کا نشتر سماج کی جراحی کرنے لگا تھا۔ وہ ہر اس موضوع پر بڑے اعتماد سے قلم اٹھانے لگا تھا جس پر بہت کم مصنفین اٹھایا کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ اقبال کی بڑی بہن ساجدہ اور بھائی تنویر کی شادی ہو چکی تھی۔ ساجدہ تو بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور تنویر کی بیوی فردوس اس گھر کی بڑی بہو کی حیثیت سے آ چکی تھی۔ جب تک ساجدہ کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ماں کے ساتھ گھریلو کام کاج سنبھالے ہوئے تھی۔ اس سے پہلے یہ سارے گھریلو کام اقبال کے ذمے تھے۔ اقبال آرمی میں چلا گیا اور ساجدہ اپنے گھر چلی گئی تو گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ اقبال کی ماں فاخرہ پر آن پڑا، فردوس تو برائے نام ہی اس گھر کی ذمہ دار کی اٹھائی تھی۔ دن چڑھے دیر سے اٹھنا صرف اپنے شوہر تنویر کا ناشتہ تیار کرنا اور اس کے کام پر جاتے ہی دوبارہ بستر میں گھس جانا۔ یہی اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ بعض اوقات تو تنویر بھوکا پیاسا ہی کام پر چلا جاتا۔ اقبال کے سارے چھوٹے بہن بھائی سکول کالج جانے والے تھے۔ اس لئے ان کے لئے اور اقبال کے والد شہیر کے لئے ناشتہ وغیرہ فاخرہ کو

ایک خود اعتماد انسان بن چکا تھا۔ اسے اپنی بات منوانے اور نہانے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ چھٹیوں میں اقبال کے بہن بھائیوں نے اس پر پہلے کی طرح رعب اور حکم چلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے بڑے اعتماد اور ہر وقار طریقے سے سمجھ دیا تھا کہ وہ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالیں اور بڑے چھوٹے کا احترام لیکھیں۔

باپ تو پہلے ہی ناراض تھا کہ اس نے پیسے اسے دینے کی بجائے ماں کو کیوں دیئے۔ باپ کی ناراضی کا اقبال نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کی کل کائنات تو اس کی ماں تھی۔ ماں جس نے اسے جنم دیا تھا، ماں جو اس وقت بھی اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی جب وہ ابھی شیر خوار تھا اور غلاظت میں لٹھڑا پڑا رہتا رہتا، لکھیاں اس پر بھینھن رہی ہوتیں اور بہن بھائی اس سے نفرت سے گھورتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے۔ ماں تو اس وقت بھی اس سے محبت کرتی تھی جب باپ اور بہن بھائیوں سمیت ہر کوئی اس سے نفرت کرتا تھا اور اب جبکہ وہ معاشرے کا ایک قابل عزت فرد بن چکا تھا، اب بھی ماں اس سے اور وہ ماں سے دنیا جہان سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ ماں کی پستیش کرتا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے بچپن کی طرح اس بار بھی اپنی ساری چھٹیاں وہ اپنی ماں کے کمرے میں ہی سوتا رہا تھا۔ رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی تو ماں کے پاؤں کی طرف چلا جاتا۔ اس کے پاؤں چومتا، آنکھوں سے نکالتا، ماں کی آنکھ کھل جاتی تو وہ بڑے دلار سے کہتی۔ ”پاول! پتھر سو جا۔“ اور وہ دھیرے دھیرے مسکراتا ہوا اپنے بستر پر چلا جاتا۔ گہری نیند میں اگر اسے ماں کی ہلکی سی بھی کھانسی کی آواز سنائی دیتی تو تڑپ کر اٹھتا اور پانی کا گلاس لے کر ماں کے سر ہانے کھڑا ہو جاتا۔ بہن بھائی اور باپ اس کی اس کا یا کلب پر حیران تھے۔ مگر ماں اس کی اس تبدیلی پر بے حد خوش تھی۔ اس کے

لئے موت کے سامنے بھی سینہ سپر ہو جایا کرتا ہے۔ اسے نہ کسی کے عہدوں سے غرض ہوتی ہے، نہ خوبصورتی سے پیار۔ اسے نہ کسی کی بدصورتی کی پروا ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کے حسن و جمال کی ہوس۔ اسے صرف اور صرف غرض اس سے ہوا کرتی ہے جو اس کی حفاظت کے لئے جان پر کھیل جایا کرے۔ اس لئے میرے عزیزو! اپنی رنگت، اپنی نسل، اپنے خدوخال پر کبھی بھی مت اترا نا۔ صرف اور صرف سچا پیار، بے لوث جذبے ہی پائیدار بندھن کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ ورنہ ایک سیاہ قام اور مولے نقوش والے جشی حضرت بلالؓ بھی بارگاہ رسالتؐ اور کائنات عرش معلیٰ کے مالک کی بارگاہ میں اتنے معتبر نہ ہوتے کہ اگر انہوں نے اذان نہیں دی تو مالک ارض و سمانے صبح کو طلوع ہونے سے روک دیا۔“

یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے اقبال کے اعتماد کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا اور وہ جملہ عروسی میں داخل ہو گیا۔ اس عزم، اس عہد کے ساتھ کہ شمع اس سے محبت کرے نہ کرے، اسے چاہے یا نہ چاہے، وہ ہمیشہ اس سے محبت کرتا رہے گا، اس کی عزت کرتا رہے گا، اسے بھرپور تحفظ دیتا رہے گا اور اگر خدا خواستہ اس کی حرمت پر کبھی کوئی حرف آیا تو وہ اس کی حرمت کی خاطر ہر کس و ناکس کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرے گا۔

سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس شمع پلنگ پر گاؤ بٹکے سے ٹیک لگائے شرم و حیا سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اقبال نے ایک نظر اسے دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ تو اس کے خوابوں اس کے خیالوں سے بھی زیادہ حسین تھی۔ معصوم سا چہرہ، پتلے پتلے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ، میدے اور سیندور سے گندھی ہوئی رنگت، ستواں ناک، موٹی موٹی خوابیدہ سی آنکھیں جنہیں وہ حیا کے بوجھ تلے جھکائے بیٹھی

ہی تیار کرنا پڑتا۔ اس کے بعد برتن دھونا، گھر کی صفائی، تھرائی، ہانڈی روٹی سب کچھ فخرہ کو بی کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کے بوجھ سے فخرہ بیمار رہنے لگی چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اقبال کی شادی کر دی جائے۔

یہ 31 دسمبر کا دن تھا جب شمع بہار بن کر اقبال کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اقبال اور شمع نے ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا۔ بس تصویروں کا دونوں گھرانوں نے تبادلہ کیا تھا اور تصویریں تو بس تصویریں ہوا کرتی ہیں۔ بے جان گونگی بہری تصویریں جنہیں فوٹو گرافر اپنے ہنر سے یوں رنگ حسن دے دیا کرتے ہیں کہ چاہیں تو کسی بھوت چڑیل کو بھی یوسف ثانی اور قلو پٹھر بنا دیا کرتے ہیں۔

اقبال اگرچہ بچپن والا عدم اعتماد اور احساس کمتری کا شکار اقبال نہیں تھا۔ عسکری ماحول اور ٹریننگ نے اسے انتہائی پُر اعتماد اور سلجھا ہوا انسان بنا دیا تھا۔ مگر جملہ عروسی میں جانے سے ڈر رہا تھا۔ بچپن کی بھول بھلیوں میں کہیں دیکھا ہوا عدم اعتماد کا خوف اسے اب بھی ایک خوفناک عفریت کی طرح ڈرا رہا تھا۔ ”اگر شمع نے بھی اس کی کافی رنگت، اس کے بھدے نقوش دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا تو؟“ یہ وہ سوال تھا جو اسے جملہ عروسی میں جانے سے روک رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں اس کے اسٹریٹ کے الفاظ گونجے۔

”میرے عزیزو! ٹریننگ کے دوران ایک روز ان کا استاد ان کے گروپ کو کہہ رہا تھا۔ ”عروسی وطن کا پیار۔ اس کی محبت اتنی بے لوث، اتنی بے غرض ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبت کرنے والوں کے صرف جذبات دیکھا کرتی ہے، اس کو کسی کی رنگت، کسی کے نقوش، کسی کے قد و قامت سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ ہر اس شخص کے لئے اپنی ہانہیں، اپنی آغوش وا کر دیا کرتی ہے جو اس کے تحفظ، اس کی عزت، اس کی حرمت کے

تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو، میں تمہیں کبھی بھی مجبور نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ محبتیں خیرات یا بھیک میں نہیں ملا کرتیں۔ یہ محبت کی توہین ہوا کرتی ہے۔ پیار اور محبت تو ایک بے اختیار اور آفاقی جذبہ ہوا کرتا ہے جو رنگ، روپ، نسل، عمر غرضیکہ ہر شے سے بالاتر ہوتا ہے۔ تم اس رشتے کو نہ نبھانا چاہو گی تو مجھ میں تم سے زور زبردستی نہیں کروں گا۔ میں ساری باتیں،

سازی و جوہات اپنے اوپر لے کر تمہیں اس رشتے سے آزاد کروں گا لیکن جب تک ہمارا رشتہ قائم ہے، میں ہر سانس، ہر پل تمہارا ساتھ نبھائوں گا۔ تمہاری عزت کروں گا اور ہر کس و نامکس سے تمہاری عزت کراؤں گا۔ ہم فوجی اپنے وطن کی مٹی سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ اتنا پیار کہ اس کی حفاظت کے لئے ہنستے کھیلتے

جان ہار جایا کرتے ہیں۔ میں بھی تم سے بے حد پیار کرتا ہوں، تمہیں اپنے آپ سے زیادہ چاہتا ہوں، ٹوٹ کر تم سے محبت کرتا ہوں۔ بیشک تم میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور بہت دور بھی چلی جاؤ گی۔ تب بھی میں تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ ناتہ نہ ہونے کے باوجود زندگی کی آخری سالوں تک تمہیں چاہتا رہوں گا اور تمہاری عزت، تمہاری حرمت کے لئے اپنی جان پر کھینا پڑا تو کھیل جاؤں گا۔ یہ ایک فوجی کا تم سے وعدہ ہے سچا اور بے لوث وعدہ۔

شمع نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو نہیں مگر جھجکتے، شام تے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔ ”اقبال! میں نے آپ کا ہاتھ تھام لیا ہے اور اسے اب موت ہی چھڑا پائے گی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے امیر لب اقبال کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔ اس رات وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ایک دوسرے سے حال دل کہتے رہے۔ اقبال نے پیدائش سے لے کر اب تک کی کوئی بات، کوئی راز کچھ

تھی۔ ”سبحان اللہ!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ”شمع! میں اپنے رب کی اس عطا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے تمہاری صورت میں مجھے کسی بہت بڑی نیکی کا اتنا خوبصورت انعام دیا۔ میں اپنے رب کے حضور شکرانے کے دو نفل ادا کر لوں پھر ہم اپنی اس خوبصورت زندگی کا آغاز کریں گے۔“ اتنا کہہ کر اقبال واپس مڑا اور وضو کرنے چلا گیا۔

اس نے حجلہ عروسی میں ہی شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ اپنی خوشگوار اور پرسرست ازدواجی زندگی کے لئے دعا مانگی اور جاے نماز کو تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے کھئی سبائی شمع کے پاس آ بیٹھا جو اس لی آہٹ پا کر سیدی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حیا آلود آنکھیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔

”شمع!“ اقبال نے اس کے نرم و نازک حنائی ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں ایک سیدھا سادہ فوجی ہوں اور فوجی ہمیشہ سیدی، سچی اور کھری بات کیا کرتے ہیں۔ وہ منافق اور دو ٹوٹے نہیں ہوا کرتے، جو بات دل میں ہوتی ہے اس کا برملا اظہار کر دیا کرتے ہیں۔ تم نے شاید میری تصویر دیکھی ہوگی، رو برو ہم پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ تصاویر اکثر جھوٹ بولا کرتی ہیں۔ پروفیشنل فوٹو گرافرز اپنے فن کے زور سے کسی بھی بد صورت سے بد صورت چہرے کو یوسف ثانی اور قوچطرہ بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو کسی بھی مونالیزا اور یونانی دیوتاؤں جیسے شاہکاروں کو بد صورتی کا وہ چلتا پھرتا اشتہار بنا دیں کہ لوگ نفرت سے اس پر تھو تھو کریں۔ آج اگر تم شرم و حیا کی وجہ سے مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھ رہیں تو اتنا ضرور کہوں گا کہ ذرا سی ہمت کر کے مجھے صرف ایک سرسری سی نظر دیکھ لو تو تمہیں احساس ہو جائے گا کہ میں کسی صورت میں تمہارے قابل نہیں تھا۔

پاکستان میں سچے
مانے کے مانی

SA

ESTD. 1936

اپس آئے

اپس آئے: البکشر بکال الدین پرنٹرز

053-3515327, 3535045, 3533478

بھی تو نہیں چھاپا تھا۔ گھر والوں کا نفرت آمیز سلوک، باپ، بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے تنہائیوں کا سفر، ماں کی مجبور محبت اپنی خیالی دنیا میں کھو کر کہانیوں کے اصنام تراشا غرضیکہ اس نے اپنی زندگی کا ہر ہر گوشہ، ہر پہلو اس کے سامنے آشکار کر دیا تھا۔ شمع نے بھی اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اہل کی ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ وہ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے زیر سایہ پلی بڑھی جوان ہوئی۔ باپ اپنی دوسری بیوی بچوں میں یوں گم ہوا کہ اسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ اس کی پہلی بیوی سے اس کی اکلوتی اولاد، اس کی بیٹی شمع نام کے وجود کا کوئی بشر بھی تھا۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں نے اس کے ساتھ اگر سوتیلے پن کا سا سلوک نہ کیا تھا تو اسے محبت اور پیار بھی نہ دیا۔ نتیجتاً وہ تنہائی پسند ہو گئی۔ اسے نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ رسالوں سے بھی دلچسپی ہو گئی۔ اس کے پاس پیسے تو ہوتے نہیں تھے کہ رسالے خرید سکتی، اس کی سہیلی افشاں کے ابو کی سٹیشنری کی ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں ملک بھر سے شائع ہونے والے معیاری رسالے بھی آیا کرتے تھے۔ افشاں وہاں سے پڑھنے کے لئے رسالے لے آیا کرتی، خود بھی پڑھتی اور اسے بھی پڑھنے کے لئے دیتی۔ شمع نے شرماتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے کئی رسالوں میں اقبال کی کہانیاں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسے اقبال کی درو میں ڈوبی ہوئی کہانیاں اچھی لگنے لگیں۔ اتنی اچھی کہ وہ نہ صرف اس کی پرستار بن گئی بلکہ اس سے خاموش محبت بھی کرنے لگی۔ مگر مشرقی لڑکی ہونے کے سبب وہ اپنی ٹیک طرفہ محبت کا اظہار نہ کر سکی۔

شمع نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اقبال کی ڈاک جس دکان کی معرفت آیا کرتی تھی وہ افشاں کے والد

قابلیت

اصل ڈگریوں والے ”کریم“ اور ”اور“ کا چلا رہے ہیں، جعلی ڈگریوں والے جہاز اڑا رہے ہیں اور بغیر ڈگریوں والے اسمبلیاں چلا رہے ہیں۔

بھی ان کا مقدر نہیں بنیں گی۔ ہم ان سے ہمیشہ ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔ اسے گھیرے سائے تلے انہیں ہمیشہ بوں رکھیں گے کہ وہ بھی بھی اپنے آپ کو تنہا اور لا وارث نہیں سمجھیں گے۔

شمع نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے گویا اس کی باتوں پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بسا اوقات اظہار جذبات کے لئے قوت گویائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حرکات و سکنات ہی بزبانِ خاشی سب کچھ کہہ دیا کرتی ہیں۔

اقبال چھٹی کاٹ کر واپس یونٹ چلا گیا۔ اب اس کے قلم، جس سے ورد اور رنج و الم کے سوتے ابلتے تھے، ابھی اسی قلم سے محبت کی خمار آلود اور رومان انگیز شبنم کی پھواریں پڑھنے والوں کے جذبات میں لپچل مچانے لگیں۔ اس کے پرستار، اس کے قارئین اس کا کیا کلب پر بہت حیران تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ اس کی ویران اور تنہا زندگی میں شمع ایک بہار بن کر یوں داخل ہوئی ہے کہ اس کی ویرانیاں شمع کے دم سے آباد ہو چکی ہیں۔ اس کی تنہائیوں کی ساتھی اس کی ہم دم اس کی ساتھی بن چکی ہے۔



اولاد والدین کے لئے وہ مضبوط اور کبھی بھی نہ ٹوٹنے والا بندھن ہوا کرتی ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک ایک دوسرے کو جوڑے رکھتی ہے۔ اولاد والدین کے احسانات بھول کر، ان کی محبتوں، ان کی

کی ڈکان تھی اور ایک روز وہ اپنی سبیلی افشاں کے ساتھ ڈکان میں ہی تھی، جب اقبال وہاں اپنی ڈاک دیکھنے آیا تھا۔ تب افشاں نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ اقبال ہے شہر کا مشہور و معروف رائٹر۔ شمع جو اس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس کی خاموش پرست تھی، اسے زور دیکھ کر ایک انجانے سحر میں گرفتار ہو گئی۔ اس کی سیاہ رنگت اور بھدے سے نفوش ہونے کے باوجود اس کو اپنے من مندر کا دیوتا مان لیا۔ اس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس سے محبت تو وہ پہلے ہی کرتی تھی، اب زور دیکھ کر اپنے دل کے گکھان پر بٹھا لیا۔ یہی تو محبت کا فلسفہ ہوا کرتا ہے۔ یہی تو پیار کے کلیے قانون ہوتے ہیں۔ کوئی حسین اور خوبصورت ترین چہرہ بھی آنکھوں کو نہیں چٹپٹا اور کوئی بدصورت، سیاہ فام اور واجبی سے نین نفوش والی صورت آنکھوں میں یوں سما جی ہے کہ پہلی ہی نظر میں دل اور روح کی گہرائیوں میں یوں اتر جاتی ہے کہ انسان ساری زندگی کے لئے اس سے روح کے بندھن باندھ لیا کرتا ہے۔

باتیں کرتے کرتے، ایک دوسرے کی سنگت میں انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ دیوار گیر گھڑی نے رات بارہ بجنے کا اعلان کیا تو وہ چونکے۔ ”شمع!“ اقبال نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”آج سال کا اختتام ہو چکا ہے اور نئے سال نے اپنا آغاز کر دیا ہے اور آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہوئی ہے۔ ہمارا دونوں کا ماضی ایک دکھ بھرا اور محرومیوں سے لتھڑا ہوا دور تھا۔ آؤ آج ماضی کے ہر دکھ، ہر آسیب کو ذہن سے جھٹک دیں اور اپنی خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کریں۔ اس عہد کے ساتھ کہ جو بحر میاں جو حسرتیں جو دکھ ہم نے جھیلے ہم اپنی اولاد پر ان کا سایہ تک پڑنے نہیں دیں گے۔ ہم انہیں اتنی محبتیں، اتنی شفقتیں، اتنا پیار دیں گے کہ ہماری طرح تنہائیاں کبھی

بہن بھائیوں کے ناروا سلوک کا شکوہ تو درکنار اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ مگر وہ شمع کے کملائے ہوئے چہرے اور دن بدن گرتی ہوئی صحت کی بدولت سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس نے شمع کو کریدنے کی بڑی کوشش کی مگر شمع ہنس کر نال دیتی۔

ایک روز وہ ویک اینڈ آیا تو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے باپ کی گرجا دار آواز سنائی دی۔ وہ کسی بات پر شمع پر بڑی طرح برن رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دیگر بہن بھائی بھی شمع پر چیخ چلا رہے تھے۔ اقبال تڑپ اٹھا۔ اس نے بیک زمین پر رکھ کر معاملہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی تو باپ نے بغیر سوچے سمجھے کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے کھڑا ہے، پوری قوت سے اس کے منہ پر پتھر دے مارا۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔ شمع نے تڑپ کر آگے بڑھنا چاہا تو اقبال کے بہن بھائی درمیان میں کود پڑے۔ یوں معاملہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ اس کے باپ نے اسی وقت اسے اور شمع کو گھر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ زندگی میں پہلی بار ماں اپنے شوہر کے سامنے سراپا احتجاج بن گئی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ اتفاق سے اس کی بڑی شادی شدہ بہن راشدہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ اقبال کی ضدی اور بیٹی طبیعت سے واقف تھی۔ اس نے باپ سے بڑے قیمتی لہجے میں کہا۔

”ابا! اقبال کو روک بیچے، آپ اس کی بیٹی طبیعت سے واقف ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر اس نے ایک دفعہ گھر چھوڑ دیا تو پھر وہ کبھی بھی واپس نہیں آئے گا۔“ تب باپ نے بڑی رعوت سے ساجدہ کی بات سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اقبال! دفع ہو جاؤ اس گھر سے کہ جب زمانے بھریں اور در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس لوٹنے کی کوشش کرو گے تو یہ سوچ لینا کہ اس گھر کے دروازے آج

شفقتوں کو تار عنکبوت کی طرح توڑ کر اپنی اپنی دنیا میں تو آباد کر لیا کرتی ہے۔ مگر ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں کی خاطر اپنی خوشیاں، اپنی امنگیں، اپنی خواہشات حتیٰ کہ بسا اوقات اپنی جان بھی ہار جایا کرتے ہیں۔ مگر اقبال وہ بد نصیب انسان تھا جو ساری زندگی باپ کے پیار اور بہن بھائیوں کی محبت سے محروم تنہا تنہا اور اکیلا اکیلا ہی زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ ایک ماں ہی وہ سرمایہ زیست تھی جس کے سہارے وہ زندگی کی تمام تر تکلیفائیاں جھیل رہا تھا۔ پھر شمع اس کی زندگی میں برابر بن کر داخل ہوئی تو اس کی تنہائیوں میں مراسم کی خوشبو کھڑ گئی۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اس کے کشن میں بھی خزاں نہیں آئے گی۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ اصلی امتحان تو اب شروع ہوا ہے۔ اقبال کے جانتے ہی اقبال کا باپ اور بہن بھائی اپنی اصلی جون میں آ گئے۔ ہمارے سانج میں ساس بہو کا پیر (دشمنی) ایک ضرب اشل بن چکی ہے۔ مگر یہاں کا یہ سوتیلے پن والا کردار اقبال کا باپ اور اس کے بہن بھائی بخوبی سمجھا رہے تھے۔

اقبال کی یونٹ ان دنوں منگلا تعینات تھی جہاں سے وہ ہر ہفتے ”ویک اینڈ“ آ جایا کرتا تھا۔ اگر کسی ہفتے وہ سرکاری ڈیوٹی کی وجہ سے ویک اینڈ نہ آ سکتا تو اقرار کی صبح وہ اجازت نامہ (جسے فوجی زبان میں آڈٹ پاس کہا جاتا ہے) لے کر گھر آ جاتا۔ شمع اگرچہ عام بیویوں کی طرح کوئی بھی گھریلو شہوہ شکایت اس سے نہیں کرتی تھی اور نہ ہی وہ ان بیویوں میں سے تھی جو شادی کے دوسرے دن ہی شوہر کو لے کر الگ ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جو ان بیٹوں کے علاحدہ ہو جانے سے وہ والدین بالکل بے سہارا اور لا وارث رہ جائیں گے۔ جنہیں اس بڑھاپے میں جوان بیٹوں کے سہاروں کی ضرورت تھی۔

شمع نے اقبال سے کبھی بھی اس کے باپ اور

ایک ماہ کا فری راشن بھی دے دیا۔ ساتھ ہی اس پر خصوصی عنایت کی گئی کہ اس کی چھٹی بھال رکھی گئی۔ اقبال اسی روز اپنے سرال جا کر شمع کو لے آیا۔ یوں زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔

اقبال کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے عطا کئے۔ اس نے اور شمع نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ جو جو محرومیاں اور تشکیاں ان کو ملی تھیں انہوں نے اس کا محسوس سایہ ان پر نہ پڑنے دیا۔ انہیں بھرپور محبت دی۔ دونوں بچے حیرت انگیز طور پر انتہائی خوبصورت اور شفاف رنگت کے حامل تھے جو ماں کی طرف سے ان کے حصے میں آئی تھی۔ عسکری قوانین کے مطابق اقبال کی ٹرانسفر جہاں بھی ہوتی تو اس کے یونٹ کمانڈر کو اقبال کے لئے رہائش کا لکھ دیا جاتا۔ اگر سرکاری طور پر کووارٹر کا حصول ممکن نہ ہوتا تو اس کو خصوصی طور پر یہ اجازت دی جاتی کہ وہ یونٹ کے نزدیک ترین کسی بھی جگہ پرائیویٹ رہائش گاہ حاصل کر سکتا ہے (فوجی زبان میں اس کو آؤٹ لیوگ (Out Living) کہا جاتا ہے)۔ جس کا کرایہ الاؤنس کی صورت میں اسے سرکاری طور پر ادا کیا جاتا۔

وقت گزرتا رہا، اقبال کی سروس اور ٹرانسفر کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال اب ترقی پا کر حوالدار بن چکا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اب ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ اسی دوران اقبال کی ریٹائرمنٹ کے آرڈر آ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت اقبال کو واجبات اور سرکاری پنشن کی مد میں ایک اچھی خاصی رقم ملی جس سے اس نے ایک مناسب سا کٹھاد گھر خرید لیا۔ کیونکہ جب تک وہ آرمی میں تھا اسے رہائش کا کوئی خاص مسئلہ نہ تھا مگر ریٹائرمنٹ کے بعد اصل مسئلہ رہائش کا بننا تھا۔ چنانچہ وہ گھر خرید کر اس نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ بقایا پیسوں سے اس نے بچت سکیم میں سیونگ سرٹیفکیٹس

کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔“

اور اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ وہ مرتے مر جائے گا۔ مگر اپنی لاش کو بھی اس گھر واپس نہ آنے کی وصیت کر جائے گا۔ اس نے شمع کا ہاتھ تھاما۔

ایک نظر سب سمجھ بھائیوں اور ماں کے چہرے پر۔ وہاں پہنچے۔ پھر وہیں پر فتح، محمدی کی منسکراہٹ تھی جبکہ بہن ساجدہ اور ماں کی ہر دم آنکھوں میں خاموش التجائیں تھیں۔ ”نہ جاؤ باقی اس گھر سے یوں منہ موڑ کر نہ جاؤ کہ تمہاری شکل کو ہم دیکھنے کے لئے ترس جائیں۔“ ایک لمبے کے لئے وہ ڈنگا بھی گیا۔ مگر باپ کے تلخ الفاظ اس کے کانوں میں گچھے ہوئے سیسے کی طرح آگ لگا رہے تھے۔ چنانچہ اس نے شمع کا ہاتھ تھاما اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

گھر سے نکل کر ان دونوں نے رات کہاں گزاری، کس طرح اپنی زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لئے جدوجہد کی۔ اس سے قطع نظر اقبال نے شمع کو اس کے میکے چھوڑا اور دوسرے روز واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ یونٹ کمانڈر سے مل کر اسے ساری کہانی سنائی۔ آرمی کا ادارہ اپنے عسکریوں کو کبھی بھی تنہا اور لاوارث نہیں چھوڑا کرتا۔ حاضر سروس ہو تو اس کے حقوق کا مکمل تحفظ کرتا ہے۔ وقت پر کھانا، وقت پر تنخواہ، وقت پر دیگر مراعات اور جب ریٹائر ہو جائے تو معقول اور بروقت واجبات کی ادائیگی ہر ماہ پنشن۔ بیمار ہو تو فیملی سمیت فری علاج معالجے کی سہولت۔ فوت ہو جائے تو بیوہ کی کفالت کے لئے عسکری کی پنشن و واجبات بیوہ کے نام۔ غرضیکہ یہ باوقار ادارہ اپنے عسکریوں کو کبھی بھی تنہا اور لاوارث نہیں چھوڑتا۔ یونٹ کمانڈر نے جب اقبال کی داستان سنی تو فوری طور پر اس کے لئے نہ صرف سرکاری کووارٹر کا بندوبست کر دیا بلکہ اسے یونٹ سے

ماں کی وفات سے، راشدہ کے گھر کبھی نہ آنے کا سن کر تودہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔



انسان پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے پھلتا پھولتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو کر پیوند خاک ہو جایا کرتا ہے۔ ایسا روڈ آؤٹ سے ہوتا چلا آیا ہے اور تاقیامت ہوتا رہے گا۔ ہر جانے والا اپنے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرتا چلا جاتا ہے اور آنے والے اپنے وقت پورا کر کے اپنے نئے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ اقبال اور شع بھی بڑھاپے کے خشک سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ ان کے بیٹے بلال اور جمال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں، وہ خود بھی بال بچے دار ہو چکے تھے۔ یہ گھربا چھوٹا بڑا رہا تھا۔ ایک دو دفعہ دے دے لفظوں میں انہوں نے یہ گھر بیچ کر کوئی بڑا گھر خریدنے کی بات بھی کی تھی۔ اقبال اور شع جہاندیدہ تھے۔ وہ اپنے گھر سے ہجرت کے اغراض و مقاصد اور نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ اصل مسئلہ گھر چھوٹے ہونے کا نہیں بلکہ اصلی وجہ بہوؤں کی علیحدہ آزادانہ زندگی گزارنے کی خواہش ہے نئے دور کی نئی بہویں جو گھر سے پہلا سبق پڑھ کر اور مقصد نے کرا آتی ہیں کہ جاتے ہی اپنے شوہروں کو لے کر ساس سر کو اللہ کے آسرے پر چھوڑ دیتے ہوئے اپنی اپنی دنیا میں آباد کر لیں۔ جو ذرا دنیا دار قسم کی بہویں ہوتی ہیں وہ اپنے ساس سر کے آبائی گھر بکوا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ جہاں ساس کا کام پوتیاں پوتے سنبھالنا، گھریلو کام کاج کرنا اور ہانڈی رولی کرنا رہ جاتا ہے جبکہ سر بیچارہ بڑھاپے کی حالت میں کھائے کھاتے سوا سلف لانا، پانی بھرنا، بچوں کو سکول لانا لے جانا اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ یوں ان کو گھریلو

فرید لئے۔ ساتھ ہی اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی۔ یوں پانچن، سیونگ سرٹیفکیٹس سے ہر ماہ ہونے والے منافع اور فرم کی تنخواہ سے گھر کا نظام بہ احسن و خوبی چل نکلا۔ اسے اپنا آبائی گھر چھوڑے طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے اس کی خبر خبر لی تھی۔ اقبال زندگی کی مصروفیات میں اپنے آپ کو یوں گم کر چکا تھا کہ اپنے آبائی گھر، اپنے بہن بھائیوں اپنا باپ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اگر نہیں بھولا تھا تو اپنی ماں اور بہن راشدہ کو نہیں بھولا تھا۔ آخری بار جب وہ گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے آخری نظر ان کے سنے ہوئے چہروں پر ڈالی تھی۔ ان کی اشکبار آنکھیں ہمہ وقت اس کے ذہن کی سکرین پر تھر تھراتی رہتی تھیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ ان آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو نہ بھولی پایا تھا۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز اپنے گھر اور گھر والوں کا پتہ کرایا تو پتہ چلا کہ ماں تو اس کے گھر چھوڑ کر جانے کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی فوت ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اسے یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو ہمہ وقت پوچھتی رہتی۔ انہیں سینے سے لگاتی اور ہر ملنے والے سے جنتی۔ ”میرے ہالو کو بلا دو، میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ نہ جانے میرا ہالو کس حال میں ہوگا۔“

بڑی بہن راشدہ بھی اس کے گھر سے چلے جانے کے بعد اگلے ہی دن واپس اپنے سرسراں چلی گئی تھی اور پھر دوبارہ واپس اپنے مکان نہیں آئی۔ ماں کے مرنے پر وہ آئی تھی اور قفل کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ دیگر بہن بھائی بھی شادی شدہ ہو چکے تھے اور باپ کی زندگی میں ہی مکان کے ہمارے کر لئے تھے۔ باپ کو انہوں نے کسی ”اولڈ ایج ہوم“ میں داخل کروا دیا تھا۔ اسے گھر کے حالات سن کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ خاص کر

دکال سکی۔ اس کی اولاد اس کی پوتیوں پوتے ہی تو اس کی کل کا سنات تھی۔ چنانچہ تیسرے ہی ماہ وہ ایک رات چپ چاپ اقبال کو باجھ تھامے روتی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند کر ابدی نیند سو گئی۔ مرتے وقت اس کی چھم چھم آنسو بہاتی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا کہ اس کے بیٹوں، اس کے پوتے پوتیوں کو ایک نظر اسے دکھا دیا جائے مگر سنگدل بیٹے، بھویں تو اپنے اپنے بچوں کے ساتھ ناران، کاغان، سوات، ایوبیہ اور نہ جانے کون کون سے تفریحی مقامات پر ایک لمبے نور (Tour) پر نکلے ہوئے تھے۔ ماں باپ کے آشیانے سے نکل کر وہ آزاد پنچھیوں کی طرح پاکستان کے تفریحی مقامات کی سیاحت سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اقبال ایک بار پھر اس بھری بڑی دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ شمع جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی، جس کے دم سے اس کی ویران زندگی میں بہار رقصاں برپا تھی جس کی محبت میں اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب باپ، بہن، بھائی عزیز و اقارب سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکیلا اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا۔ جب اس کے دونوں بیٹے، اس کی متاعِ زیست بچے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لے کر اسے تنہا کر گئے تھے۔ مگر آج شمع بھی جب دیرانی سے کوچ کر گئی تو وہ اپنے آپ کو شدت سے تنہا محسوس کرنے لگا۔ قرطاس و قلم سے ناطہ تو وہ پہلے ہی توڑ چکا تھا کہ اب لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تنہائیاں شمع کے تصور سے آباد کر لیں۔ وہ ہر روز شمع کی قبر پر جاتا۔ اس کی صفائی سھرائی کرتا۔ قبر پر بیٹھ کر فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کرتا رہتا اور رات کو شمع کی تصویر سے باتیں کرتا رہتا۔ لوگ اسے پاگل، مجنوں، سوداگی

کام کاج اور بازار کے کام سنبھالنے کے لئے مفت کی ملازمہ اور ملازم مل جاتے ہیں جو صرف دو وقت کی روٹی کے عوض چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے رہتے ہیں۔

شمع اور اقبال کو اپنے پوتے پوتیوں سے بے حد محبت تھی، وہ انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ معصوم بچے بھی اپنے دادا دادی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ہمہ وقت اُن کے پاس ہی گھسے رہتے۔ وہ اپنی بہوؤں کے عزائم سن کر بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ ابھی وہ اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی رہے تھے کہ ایک دن بال اور جمال نے یہ گھر چھوڑ دیا کہ اگر وہ یہ گھر نہیں بچنا چاہتے تو نہ بچیں۔ تاہم وہ یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں کیونکہ اس گھر میں اُن کا گزرا مشکل ہیں

بوڑھا اقبال اور شمع انہیں روک بھی نہ سکے۔ روکا تو انہیں جاتا ہے جو رکنا چاہیں۔ جو فیصلہ ہی علیحدہ ہونے کا کر لیں انہیں روکا جا ہی نہیں سکتا۔ یوں وہ روتے بلکتے اپنے پوتے پوتیوں جو ان کے لئے جیتے جاگتے پیارے سے کھلونے تھے۔ جن کے ساتھ وہ پہروں کھیلا کرتے تھے۔ اب ان سے جدا ہو رہے تھے۔ اگرچہ دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے انہیں تسلیاں دی تھیں کہ وہ انہیں ملنے آتے رہیں گے۔ مگر وہ ان کے چہروں سے چھلکتی ہوئی سنگین سفاکی سے جان چکے تھے کہ جو بچے والدین کو بڑھاپے میں بے آسرا اور لا وارث چھوڑ کر اپنی دنیا میں آباد کر لیں وہ کبھی پلٹ کر واپس نہیں آیا کرتے اور اگر کبھی آ بھی جائیں تو اتنی مختصر مدت کے لئے کہ جیسے کوئی راہ چتا مسافر تھک ہار کر کہیں سستے کے لئے بیٹھ جائے اور دم لے کر پھر اٹھ کر چل دے۔

اقبال کی ماں اقبال کی جدائی میں صرف چھ ماہ ہی زندہ رہ سکی تھی۔ شاید اپنے باقی بچوں کی بدولت تھوڑی بہت بھل گئی ہوگی مگر شمع تو تین ماہ ہی بمشکل

خوف سے گھبرا کر ان کے پاس رہنے کے لئے نہ چلا آئے۔



یہ اسی طوفانی رات کا ذکر ہے جس رات کا ذکر اس کہانی کے شروع میں ہوا ہے۔ ایک کاٹ کر واپس صوفے پر بیٹھے ہوئے وہ شیخ کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آج شدت سے اسے اپنی تنہائیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ ٹپک گئی اور وہ صوفے پر ہی لیٹ کر سو گیا۔ اگلی صبح سہارت بجے جب کام والی آئی تو اس نے کال بیل بجائی۔ کالی دیر کے بعد بھی جب کوئی نہ آیا تو اس نے دوسری دفعہ پھر تیسری دفعہ بیل بجائی کوئی جواب نہ پا کر اس نے ڈبلی کیٹ چابی جو اسے اقبال نے خود ہی دی ہوئی تھی کہ اگر کسی وجہ سے دروازہ نہ کھل پائے تو وہ اس چابی سے گھر داخل ہو سکے۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی تو اقبال کے کمرے میں گئی جہاں اقبال صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ موم بتیاں کبھی کی پکھل پکھل کر ختم ہو چکی تھیں۔ ملازمہ کو اقبال کا یہ انداز غیر فطری سا لگا اس نے قریب جا کر اقبال کو چھوا تو اس کے سر و جسم نے اس کے مُردہ ہونے کی گواہی دے دی۔ تنہائیوں کا مارا ہوا بوڑھا اقبال نہ جانے رات کے کس لمحے اپنی شیخ کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنی تنہائیاں آباد کرنے، اپنے دکھوں کا مداوا کرنے یا پھر اپنے اللہ سے یہ پوچھنے کے اسے خالق، اسے مالک میری تخلیق میں ایسا کون سا راز تھا، تیری ایسی کون سی رضا شامل تھی کہ میں ساری زندگی تنہائیوں اور محرومیوں کا شکار رہا۔ یہ تنہائیاں میرے مقدر کے ماتھے کا جھومر کیوں بنی رہیں۔

ملازمہ نے روتے ہوئے اقبال کی ادھ کھلی آنکھیں بند کیں اور پڑوسیوں کو اطلاع کرنے چلی گئی۔



اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ شیخ کے بغیر اس کا دل ویسے ہی دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

البتہ 31 دسمبر کو وہ گویا ہوش میں آ جاتا۔ علی الصبح اٹھ کر شیخ کی قبر پر جاتا، پھولوں اور اگر بتیوں سے قبر کو سجاتا مہکاتا، قرآن خوانی کرتا، فاتحہ پڑھتا، سہ پہر کو حج و حج کرتا رہتا، مارکیٹ سے کیک اور موم بتیوں کا پیکٹ لاتا اور اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ بارہ بجتے سے کچھ دیر پہلے وہ کیک میز پر رکھتا۔ موم بتیاں روشن کرتا اور جیسے ہی کلاک بارہ بجاتا وہ رندھی ہوئی آواز میں پی پی نیو ایئر، پی پی میرج انورسری ٹومی کہتے ہوئے کیک کاٹا اور کیک کا ایک ٹکڑا لے کر دیوار پر لگی ہوئی قد آدم تصویر کی جانب چل پڑتا اور کیک کا ٹکڑا تصویر کے ہونٹوں کو مس کرتا اور پھر کیک منہ میں ڈال لیتا۔ بالکل اسی طرح جیسے برس ہا برس پہلے جب جملہ عروسی میں کئی سہائی شیخ کے ساتھ رات بارہ بجے نئے سال اور شادی کے پہلے دن کو منایا تھا۔ وہ ہر سال اسی طرح اس یادگار دن کو منایا کرتا تھا۔ شیخ کی زندگی میں بھی اور شیخ کے مرنے کے بعد بھی فرق صرف یہ تھا کہ شیخ زندگی میں وہ کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر جواباً دوسرا ٹکڑا اقبال کے منہ میں ڈال دیا کرتی تھی۔ مگر اب اقبال اکیلا ہی یہ سب کچھ کر لیتا تھا۔ شیخ کی تصویر کے ہونٹوں سے کیک کا ٹکڑا مس کر کے باقی کیک وہ خود کھالیا کرتا تھا۔

شیخ کے مرنے کے بعد جمال اور جلال نے پلٹ کر بوڑھے اور تنہا رہ جانے والے باپ کی خبر بھی نہ لی تھی۔ وہ جب اپنے طویل سیاحتی دورے سے واپس لوٹے تھے تو اس وقت تک شیخ کا چہلم بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے غیر دل کی طرح رکی طور پر باپ سے تعزیت کی تھی پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی سے نکل گئے تھے۔ مبادا تنہا رہ جانے والا باپ کہیں تنہائیوں کے

ایک تاثر ایک کہانی

میری التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو ان ”پیشہ ور ضرورت مندوں“ سے بچ کر رہیں اور ان سفید پوش لوگوں کو خود ڈھونڈ کر رات کے اندھیرے میں امداد ان کے گھروں تک پہنچائیں تاکہ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔



ٹیکسی پروبانس

راولپنڈی

راوی: حاجی علی حبیب

☆ محمد رمضان قیوم

سیاستدانوں کو ان حالات میں سائب سوگھ جاتا ہے۔ ان ارب پتی لوگوں کو توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے خزانوں سے ضرورت مندوں کے لئے حصہ نکال سکیں۔ ان کو بس حکومت کرنے کا شوق اور نشہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں اللہ کے نیک بندے حرکت میں آتے ہیں اور بغیر کسی نام و نمود کی خواہش کے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے ضرورت مند لوگوں کا حصہ نکالتے ہیں۔ حالیہ بحران میں بھی ایسا ہی ہوا اور بیرون ممالک میں مقیم پاکستانیوں نے دکھول کر اپنے غریب بھائیوں کی مدد کی۔

میرے ایک دوست حاجی علی حبیب ہیں۔ انہوں نے مجھے ایسے ہی درو دل رکھنے والے برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی کے بارے میں بتایا۔ وہ مالدار ہونے کے ساتھ ہی بھی ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

کورونا وائرس نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر میں اپنے ناویدہ پنبے گاڑ لئے اور ہر طرف موت کا بازار گرم کر دیا۔ ہر طرف خوف اور وحشت کا راج ہو گیا۔ انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کو تپٹ کر کے رکھ دیا۔ خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک نے تو اپنی رعایا کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور ان کو مالی مسائل اور خوراک کی کمی کا مسئلہ نہ ہونے دیا لیکن ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے عوام کی شامت آگنی اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگ کورونا کی بجائے بھوکے مرنے لگے۔ پاکستان بھی انہی ممالک میں شامل ہے جو ہر مشکل وقت میں بڑے ممالک سے امداد کے لئے مجبور ہوتے ہیں حالانکہ پاکستان کا حکمران طبقہ بادشاہوں جیسی زندگی گزارتا ہے اور عوام کے دیئے ہوئے ٹیکسوں پر عیش کرتا ہے لیکن عوام کی خدمت کے دعوے کرنے والے سب لیڈروں اور

طویل فہرست تھادی۔ میں اتنے لوگوں کے نام دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ میرے پاس اتارا شن اور نقد رقم نہیں تھی کہ ہر بندے کی مدد کر سکتا۔ میرے پاس صرف سچاس بندوں کے لئے راشن اور نقد رقم تھی۔ میں نے اس لسٹ میں سے بہت سارے نام حذف کر دیئے۔ یہ میری مجبوری تھی۔ میں نے وہ لسٹ فائل کر کے مستری رزاق سے کہا کہ وہ میرے گھر سے راشن کے ڈبے، آٹے کے ٹوڑے اور نقد رقم کے لفافے لے کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔

”میں تم سے کچھ دور موجود رہوں گا رزاق!“ میں نے اس سے کہا۔ ”تم میرے سامنے ضرورت مندوں کو راشن اور نقد رقم دینا۔ اس طرح میری تسلی ہو جائے گی کہ مستحق افراد تک راشن اور رقم پہنچ گئی ہے۔“ رزاق نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے کہا۔ ”ایسا ہی ہو گا حاجی صاحب!“

اگلے دن میں مقررہ جگہ پہنچ گیا جہاں راشن تقسیم کرنے کے لئے لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گیا کہ وہاں سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا لسٹ میں نام شامل نہیں تھا۔ بالکل اس طرح کا ماحول بن گیا تھا جیسے وہاں کسی سیاستدان نے تقریر کرنی ہو اور بعد میں راشن تقسیم کرنا ہو۔ صرف میڈیا کے نمائندوں کی کمی تھی۔

ایک ایک کر لے نام پکار کر راشن تقسیم ہونے لگا مگر پھر اچانک ہی وہاں افراتفری مچ گئی۔ لوگ رزاق سے اس طرح چپ گئے جیسے کھیاں گڑ کی ڈلی پر چٹ جاتی ہیں۔ ایسے رہا تھا کہ اسے شہد لگا ہوا ہے اور سینکڑوں چیونٹیاں اسے چوسنے کو بے تاب ہیں۔

پھر وہاں پھینا جھپٹی اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ لوگوں نے آنے کے تھیلے اور راشن کے کارڈ لینے کے

آئے کی بات حاجی علی حبیب کی زبان سنیں۔

نئی برہانگہ لازم والا محاورہ سب نے سنا اور پڑھا ہو گا۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ مالدار پاکستانی ہر سال مجھے ایک مخصوص رقم غریبوں کی مالی اعانت کے لئے بھیجتے ہیں۔ اس مرتبہ انہوں نے معمول سے زیادہ رقم بھیجی اور فون پر مجھے تاکید کی کہ اس رقم سے راشن کے بڑے کارڈ بنوا لیتا اور اسے ہی آٹے کے 20 کلو والے ٹوڑے سے لینا اور کوشش کر کے سفید پوش لوگوں تک پہنچا دینا۔

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق راشن کے تقریباً 50 کارڈ تیار کرائے۔ ان میں چینی، پتی، دالیں، چاول اور گھی وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی تو میں نے فی کس ایک ہزار روپے کے لفافے بھی نقد امداد کے لئے تیار کر لئے۔

میں جہاں رہتا ہوں وہاں ایک چوک میں ۱۰ بیہڑی دار مزدوروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان میں ہر طرح کا کام کرنے والے کاریگر شامل ہوتے ہیں۔ میں نے شکل و صورت سے شریف نظر آنے والے ایک مستری کو اعتماد میں لے کر اس سے کہا کہ وہ مجھے ان مزدوروں کاریگروں میں سے ایسے لوگوں کی فہرست بنا دے جو واقعی ضرورت مند اور امداد کے مستحق ہیں۔ سفید پوش لوگوں کا خاص خیال رکھے۔

اس مستری کا نام رزاق تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس ٹیک کام میں بھرپور حصہ لے گا اور جلد ہی مجھے ہتھکڑیوں کی فہرست بنا دے گا۔ میں نے اس سے قسم لی کہ وہ کسی بھی ضرورت مند کو میرا گھر نہیں دکھائے گا ورنہ میرا نام بتائے گا۔

”ٹھیک ہے حاجی صاحب!“ رزاق نے کہا۔ ”جیسا آپ کا حکم ہے ویسے ہی ہو گا۔“ دو دن بعد اس نے مجھے مستحق لوگوں کی ایک

انتخاب

دوسروں کو خوشی دے کر خود دکھ رکھ لو۔ کیونکہ خوشی میں تم رب کو بھول جاتے ہو اور غم اور تکلیف میں تم ہمیشہ اپنے رب کو یاد رکھو گے اور رب کو ہمیشہ اپنے پاس پاؤ گے۔

متعلق پوچھا تو اس بوڑھے نے بتایا کہ رزاق تو پکا فراڈیا ہے۔

”آپ نے اس فراڈیے کے ذمہ یہ کام کیوں لگایا چناب؟“ اس نے کہا۔ ”آپ نے اس کو غریب اور حق لوگوں کے انتخاب کے لئے کہا تھا وہ بذاتِ خود دھوکے باز اور بے ایمان شخص ہے۔ کرنا کی دبا کی وجہ سے جس علاقے میں بھی غریبوں کو راشن ملتا ہے تو یہ لوگ دھونس دھاندلی سے کئی کئی بار راشن وصول کر لیتے ہیں جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ رزاق ایسے لوگوں سے اونے پونے داموں یہ راشن خرید لیتا ہے اور کرپانے کی ڈکانوں پر فروخت کر دیتا ہے۔ اس فراڈیے کے دو ذاتی مکان ہیں جو اس نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔“

بوڑھے نے اور بھی بہت کچھ بتایا جسے سن کر میرا دماغ گھومنے لگا کہ لوگوں کا کوئی کردار ہی نہیں رہا۔ لوگ مصیبت اور دبا کے اس دور میں بھی دھوکا بازی اور فراڈ سے باز نہیں آتے۔ اگر عذاب بھی آ جائے تو یہ لوگ تائب نہیں ہوتے۔

میری التجا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو ان ”پیشہ در ضرورت مندوں“ سے بچ کر رہیں اور ان سفید پوش لوگوں کو خود ڈھونڈ کر رات کے اندھیرے میں امداد ان کے گھروں تک پہنچائیں تاکہ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ یہی اللہ کو پسند ہے۔



لئے دھکم پیل شروع کر دی۔ ایک دوسرے سے شکم گھتا لوگ، ایک دوسرے کے پٹے بھاڑنے لگے، جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے بھاگا۔ گھبرا کے رزاق وہاں سے بھاگ نکلا۔ نہ جانے ہجوم کس کس نے یہ بات بتا دی کہ میں ان لوگوں کی مدد کر رہا ہوں، رزاق نے ہی یہ بات پھیلا دی ہوگی۔

لوگوں نے میری طرف دیکھا اور ہجوم کی صورت آگے آنے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی وہاں سے دوڑ لگا دی۔ ہجوم بھی میرے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ میرا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ نام نہاد مستحق اور ضرورت مندوں کا ہجوم میرے گھر تک پیچھے آیا اور میں اپنے ہی گھر میں کسی مفروضہ طرح پناہ گزین ہو گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ان غریبوں کو راشن تقسیم کرنے کی ذمہ داری لے کر کوئی جرم کیا تھا۔

ہجوم نے میرے گھر کا داخلی دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا اور ”باہر نکلو“ کے نعرے لگانے لگے۔ ایک دو آوازیں تو بہت شرمناک تھیں جو کہہ رہے تھے۔ ”ہمارے حصے کی امداد ہضم نہیں ہوگی۔“ پھر وہ لوگ داخلی گیٹ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ تو شکر ہے کہ گیٹ مضبوط تھا۔ پھر ان لوگوں نے طیش کے عالم میں میرے گھر کی دیواروں پر میرے خلاف مختلف نعرے اور گالیاں لکھ دیں۔

میری عجیب پوزیشن ہو گئی تھی۔ مجھے کے لوگ بھی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ کس کس کو وضاحت کرتا کہ نیکی میرے گلے پڑ گئی ہے۔ گھر کی دیواروں کو دھونوا یا اور چند دن گھر میں ہی محصور رہا۔ چند روز بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہوا تو میں منہ چھپا کر اس چوک میں پہنچا جہاں مجھے رزاق مستری ملا تھا، وہ وہاں نہیں تھا۔

میں نے ایک بوڑھے سے مزدور سے اس کے

برادرِ عارف صاحب! ”قلمی دوستی“ کے عنوان سے ایک پرانے زمانے کی کہانی بھجوا رہا ہوں۔ یہی دوستی آج کل ”فیس بک فرینڈز“ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس دوستی کی آڑ میں مقدس رشتوں کی تذلیل و تضحیک کی جاتی ہے۔ نئی نسل اسلام کا سیدھا اور روشن راستہ چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چل نکلی ہے اور تباہی سے دوچار ہے۔ یہ اس دور کا المیہ ہے۔ آپ نے معاشرے کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا ہے، میں بھی اس میں اپنا کردار ادا کرتا رہوں گا۔

راہوالی، گوجرانوالہ

0302-5962009

پروفیسر عزیز الرحمن ایک سماجی

پلمب ایج

قلمی دوستی



لاریاں سے نکلا تو مجھے باغبانپورہ کی چند سواریاں مل گئیں۔ وہاں سے واپسی پر ریلوے سٹیشن چند سواریاں اور سٹیشن سے سمن آباد کی۔ سمن آباد سے واپسی پر میں چوبرجی کے قریب ایک موٹر رہا تھا کہ ٹیکسی کے سامنے مجھے ایک چہرہ نظر آیا، نسواں کی چہرہ۔ وہ ایک دم سے میری گاڑی کی زد میں آ گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ ٹائر زور سے چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔ بریک لگ جانے سے وہ موت کے منہ سے بچ گئی تھی۔ وہ توجہ گئی مگر میں سوچنے لگا کہ اگر وہ میری گاڑی کے نیچے آ کر چلی جاتی تو میرا کیا بنتا۔ میں غصے کے عالم میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں اسے کوئی موٹی سی گال دینا چاہتا تھا۔ دُور جذبات سے میرے ہونٹ پکپکا رہے تھے اور..... اب وہ فٹ پاتھ پر یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”مجھے راوی روڈ جانا ہے۔ اس نے میرے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ جلیں، میں نے کرخت لہجے میں کہا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تو میں نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ آن بیٹھا۔ ”اگر مجھ سے تھوڑی سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو کتنا ہولناک ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔“ میں نے سٹیئرنگ گھماتے ہوئے اس کو مخاطب کیا مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا تو وہ میرے سوال سے بے نیاز اپنے خیالوں میں غم تھی۔ میں کئی لمبے گردن گھما کر اس کو گھورتا رہا مگر وہ جیسے کہیں دور خیالوں کے بھنور میں غم تھی اور..... ”پاگل!“ میں نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے خود سے کہا۔

”جی کیا کہا، کچھ مجھ سے کہا آپ نے؟“
 ”خوشی کا ارادہ ہو تو راوی میں کود کر مر جانا چاہئے۔ کسی غریب ٹیکسی ڈرائیور کو بھانسی لگوانے سے آخر کیا حاصل؟“

لاہور شہر کو دہشتوں میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر میں راہواری چلا آیا۔ یہ 14 اگست 1977ء کی شام تھی۔ پاکستان کی تیسویں سالگرہ تھی اور یوم آزادی کی شام۔ میں یہ شام منانے لاہور گیا تھا۔ رات کے دس بجے تک رشید مجھے اپنی ٹیکسی میں لاہور کی مختلف جگہوں اور پارکوں میں گھماتا رہا۔ رات کے دس بجے میں لاہور کو بجلی کے جھگڑات تقفوں میں ڈھن بننا چھوڑ کر راہ پنڈی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جو رانوالہ سے چھ سات میل آگے جی ٹی روڈ پر واقع چھوٹا سا قصبہ میرا شہر ہے۔ ٹھیک ساڑھے گینہ بجے بس نے مجھے میرے گھر کے سامنے اتار دیا۔ چونکہ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ یوم آزادی کے چنگاموں میں گھوم پھر کر مڈھال ہو چکا تھا لہذا بستر پر گرتے ہی مجھے انتہائی گہری نیند آ گئی۔

دروازے پر بے تحاشا پیٹے جانے کا شور اور شور میں ابھرتی ہوئی اپنے نام کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بجے چکے تھے۔ ابھی رات کا کافی حصہ باقی تھا مگر نہ جانے کس کو اس وقت میری ضرورت پڑ گئی تھی۔ بستر سے اٹھ کر میں آنکھیں مٹا ہوا باہر کے دروازے تک گیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے رشید کو کھڑے پا کر میں حیران رہ گیا۔ رشید تم اور اس وقت؟ میں اپنی حیرت اور تجسس کو غیر ارادی طور پر ہونٹوں پہ لے آیا۔

”ہاں مرزایا۔ یہ میں ہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ بے وقت تمہیں تکلیف دی۔ دراصل.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور ساتھ ہی اس کی نظریں جی ٹی روڈ پر کھڑی اس ٹیکسی پر جا کر رک گئیں۔ اس کی نظروں کے تعقب خود میری نظریں بھی۔ ہم دونوں ٹیکسی کی طرف پل دے تو رشید کہنے لگا۔

دس بجے تمہیں بس میں سوار کر کے جب میں اڈہ

بھی لیکن شاید وہ مجھے نہ دیکھ سکی تھی۔ پھر اس کے قدم تیز تیز پانی کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ کوئی ساٹھ ستر قدم وہ دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھتی رہی اور پھر گہرے پانی میں داخل ہو گئی۔ میں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے پہنچا تھا۔

”ٹھہرو!“ پیشتر اس کے وہ گہرے پانی میں کود جاتی میں نے زور سے پکارا اور وہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”کون ہو تم اور کیوں مر رہی ہو؟“

”انسان ہوں اور مر اس لئے رہی ہوں کہ جی نہیں سکتی“ وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔

”مرنے کے لئے یہ جواز کافی نہیں“ میں نے جواباً کہا۔

”آپ نے دوسری مرتبہ مجھے موت کے منہ میں کودنے سے روکا ہے۔ کون ہوتے ہیں آپ میرے معاملے میں دخل دینے والے؟ خدارا، مجھے مر جانے دیجئے۔“ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ابلد آیا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔ اگر میں آپ کو بچنے کا حق نہ دلا سکا تو مرنے کے لئے اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔“ میں نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ میرے اس ایک جملے پر وہ میرے پیچھے کنارے پر نکل آئی۔ پھر ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے مختصر اس نے مجھے اپنی پٹا سنا دی۔ دکھ اور درد میں ڈوبی ہوئی پٹا۔ وہ مظالم کا شکار ہوتی رہی ہے مرزا بھائی! میں اس کی داستان سن کر زار زار رویا ہوں۔ مرزا صاحب! اگر میں جوان بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ نہ ہوتا تو خدا کی قسم، اسے ضرور اپنا لیتا مگر اب تو میں اسے اپنے گھر بھی نہیں لے جا سکا۔ اس لئے کہ وہ بیس بائیس سال کی خوبصورت لڑکی ہے اور اس کو

”اوہ!“ اس نے مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مسکراہٹ افسردگی میں بد گئی۔ ”آپ نے بجا فرمایا مگر یقین کریں کہ میں اراداً آپ کی گاڑی کے سامنے نہیں آئی تھی۔“

”تاہم آپ کا ارادہ ضرور مرنے کا تھا۔“ میری بات کا اس نے بُرا نہیں مانا تھا بلکہ خاموش ہو گئی۔ وہ خاموش تھی اور ٹیکسی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم راوی روڈ پر آ گئے۔ راوی روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار قصداً کم کر دی اور اس کی طرف دیکھا۔ میرے کان پیچھے کی طرف گئے، ہوئے تھے تاکہ اس کی حسبِ خواہش جگہ پر میں جلدی بریک لگا لوں۔

گاڑی تصور پورہ سے کافی بڑھ آئی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ آخر میں نے گردن جھما کر سوائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی، اس نے مجھے ٹیکسی روک لینے کو کہا۔ ٹیکسی رک گئی اور وہ نیچے اتر گئی۔ اس نے سامنے نظر ڈالی تو سامنے بند روڈ تھا اور بند روڈ کے پار دریائے راوی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا پرس کھولا اور پانچ سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے میسر دیکھا اور اس کو بٹھا دینے کے لئے پتلون میں ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔ گویا وہ بتایا نہیں لینا چاہتی تھی۔ میں نے گاڑی کو ریورس لگایا اور راوی روڈ پر واپس ہولیا۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے گردن جھما کر اس کے تعاقب میں دیکھا تو... وہ بند روڈ عبور کر کے بند پر چڑھ رہی تھی۔ باغیچہ سوچ کی ایک لہر میرے ذہن کے مدد جزر کو چھو گئی۔ میں نے گاڑی کی بتیاں بجھا کر گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑا کیا اور اس ٹری کے پیچھے ہولیا۔ میں درختوں کی ادا میں ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے دریائے سنارے کھڑے ہو کر ایک نظر ادھر اُدھر دیکھا

وہ کہنے لگی۔

یہ تین سال پہلے کی کہانی ہے۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی۔ چونکہ نتیجے کا انتظار تھا لہذا زندگی بڑی بے کیف سی گزر رہی تھی۔ وہ تھی اور اس کی نوجوانی کی سوچیں۔ عجیب عجیب سوچیں۔ مستقبل کے سہانے سپنے۔ کسی آن دیکھے شہزادے کی ہاتھوں میں سمٹ جانے کا تصور۔ معصوم تہنہوں کی گونج۔ مستقبل کی خیالی جنت کے خاکے یا پھر شب و روز مختلف اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ۔ یہ تھی ایک بھولی بھالی اور معصوم نالکہ کی دنیا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کا پیار بھی تھا اور پیاری پیاری سہیلیوں کا خلوص بھی۔

کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود بھی اسے ہوں محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی میں کوئی خلا ہے۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے کوئی کام وغیرہ تو تھا نہیں اس لئے اس کا اکثر وقت رسائل کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔

اس دور میں موبائل نہیں آیا تھا۔ ایک روز ایک رسالے میں ”قلمی دوستی“ کے کالم میں قلمی دوستی کے خواہشمند بہن بھائیوں کا تعارف پڑھتے پڑھتے وہ چونک سی گئی۔ یہ کسی لڑکی کا تعارف تھا۔ لکھا تھا۔ ”میرا عقیدہ ہے کہ اولاد آدم کو اس دنیا میں محض اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ دیکھے اور اُن دیکھے لوگوں کے لئے پہچان دفا بن کر زندہ رہے۔ میرے پاس سہیلیوں کی کمی نہیں ہے پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایک ایسی سہیلی کی تلاش ہے جو میرے لئے صحیح معنوں میں بہن ثابت ہو اور جسے میں خلوص دل سے پیار کروں۔“ غزالہ کراچی۔

غزالہ کے تعارف نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دو دن اور دو راتیں وہ متاثر غزالہ کے خیالی پیکر کو ایک بے لوث سہیلی کے روپ میں دیکھتی رہی اور پھر میں

گھر لے جانے پر مہری بیوی میرے متعلق کوئی غلط رائے بھی قائم کر سکتی ہے۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ میں سے دارالامان تک پہنچا دوں مگر نہ ہی اس پہ وہ راضی ہے اور نہ میں مطمئن ہوں کیونکہ اخبار میں جب اس کی داستان منظر عام پہ آئے گی تو اس کے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ میں نے بہت سوچا آخر اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ اس کے بارے میں تم سوچو۔ دروازے سے چند قدم ہٹ کر رشید نے مجھ سے یہ سب کچھ کہہ دیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تو کیا تم اسے اپنے ہمراہ لے آئے ہو؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ہاں میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔“

گھبراؤ نہیں دوست کہ تم اسے صحیح جگہ پہ لے آئے ہو۔ میرے گھر میں وہ بیٹی اور بہن بن کر رہے گی۔ میں نے رشید کے ہمراہ ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

رشید نے اس سے میرا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے بعد میں اسے ٹیکسی سے نکال کر اپنے گھر لے آیا۔ گھر والوں سے میں نے اس کے بارے میں مختصر اس کا ذکر کیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب امی نے اسے یہ خوشی اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ صبح ناشتہ کر کے رشید ٹیکسی لے کر لاہور چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ معاشرے نے جس لڑکی سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے اس معاشرے کو اس لڑکی کے بارے سوچنے پر مجبور کرنا اور لوگوں سے اس کے لئے عزت کی زندگی گزارنے کا حق مانگنا یقیناً میرے فرائض میں داخل ہو چکا ہے۔ میں نے نالکہ کی کہانی سننے ہی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں اس کی خوشیاں واپس لانے کے لئے پوری کوشش کروں گا۔ لیکن نالکہ کی کہانی اس کی رہائی سننے۔

نے غزالہ کو خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی زندگی کا منحوس ترین فیصلہ۔ ایک ایسا فیصلہ جس نے اس کی زندگی کو جیتے جی جہنم زار بنا دیا۔ اس نے غزالہ کو خط لکھ دیا۔ چند روز بعد اس کے خط کا جواب آ گیا۔ خلوص، چاہت اور اپنائیت میں ڈوبی ہوئی تحریر۔ غزالہ کے خط سے سب ہی متاثر ہوئے تھے۔ نغمہ، نصرت اور عندلیب اس کی سب سہیلیوں نے غزالہ کے لئے اچھے جذبات کا اظہار کیا تھا اور ان سہیلیوں نے حسرت سے سوچا تھا کہ کاش وہ بھی غزالہ کو خط لکھ سکتیں لیکن وہ غزالہ کو خط نہیں لکھ سکتی تھیں کیونکہ ان کو اجازت نہیں تھی۔ اس کی ان سہیلیوں کے خاندانوں میں لڑکی کا کسی بھی انجان لڑکی کو خط لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

نامکہ نے غزالہ کے اس خط کا جواب دے دیا اور پھر ان دونوں میں بڑی تیزی کے ساتھ خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی ہوں۔

ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھیں۔ اُن دیکھی تھیں مگر ایک دوسرے کو سننے اور دیکھنے کے لئے بے تاب۔ غزالہ نے اس کو اپنے گھر بلایا مگر اس نے پہلے غزالہ کو آنے کے لئے کہا اور پھر ایک روز غزالہ سچ سچ اس کے گھر آ گئی۔ غزالہ کو دیکھ کر تو نامکہ نے خود کو آسمان پر اڑتے ہوئے محسوس کیا۔ نامکہ بہت خوش تھی جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ غزالہ بیس بائیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جب نامکہ کے گھر آ کر اس نے اپنا قدرف کرایا تو نامکہ غزالہ باجی کہہ کر اس سے پٹ گئی۔ غزالہ نے اسے یوں سینے سے لگا لیا جیسے سچ سچ وہ اس کی سنگی بہن ہو۔ غزالہ شام تک نامکہ کے گھر رہی اور پھر چلی گئی۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں وہ دونوں یوں گھل مل گئیں جیسے برسوں کی شناسا ہوں۔ جیسے وہ ایک ہی گھر اور ایک ہی ماحول کی پروردہ ہوں۔

الریاض

20- اے سال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225, Fax: 053-3535224

دیا۔ پردیز اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر نائلہ کے تن بدن میں دوڑ گئی، وہ بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے پردیز سے احتجاج کرنا چاہا مگر اس کو اپنے حلق میں سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پردیز کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور لبوں پر شیطانی مسکراہٹ لئے وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تم کتنی سندر ہو نائلہ! پردیز نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور نائلہ کا ہاتھ طمانچہ بن کر پردیز کے گال پہ پڑا اور ساتھ ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ پردیز نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ نائلہ نے دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ غزالہ باجی! اس نے چیخ کر پکارا مگر اس کی آواز اتنی دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے کسی کنوئیں کے اندر سے آ رہی ہو۔

”اپنے طمانچے کا مزہ چکھے بغیر تم یہاں سے نہیں جا سکتیں میری جان!“ پردیز نے اس کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔ نائلہ نے چیخنا چاہا مگر پردیز کے مضبوط ہاتھوں نے اس کی آواز کو اس کے حلق ہی میں دبا دیا۔ بے بس نائلہ ہوس کی سولی چڑھا دی گئی۔ دفعۃً دروازہ کھلا اور غزالہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں فلیش کیمرا تھا۔ نائلہ نے خدا اور رسول کے نام پر غزالہ سے التجا کی۔ اپنی عزت کے لئے، اپنے خاندانی دُکار اور ناموس کے لئے مگر غزالہ تو عورت کے روپ میں ذائقہ ثابت ہوئی۔

کمرے میں بجلی کوندتی رہی اور نائلہ کے جسم کی مختلف زاویوں سے تصویریں لی جاتی رہیں۔ نائلہ لٹ گئی، اس کا مستقبل تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اس اچانک سانحہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی اور جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں سنا تھا۔ پردیز اور غزالہ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ اس نے اپنی بے بسی کا یہ عالم

غزالہ کے تعارف کے مطابق وہ سیکنڈ ایئر کی حاملہ تھی اس کے ابا فوت ہو چکے تھے اور وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے بھیا نوٹوگرانی کا کام کرتے تھے اور امی سلائی وغیرہ کر کے گھریلو اخراجات پورے کر رہی تھی۔ غزالہ کے تعارف کا یہ رخ نائلہ کے گھر انتہائی قدر و منزلت سے دیکھا گیا۔ اس دن واپسی پہ نائلہ بس سٹاپ تک اس کو رخصت کرنے گئی اور اس نے نائلہ سے اپنے گھر آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ نائلہ کے مان جانے کے بعد غزالہ نے نائلہ کو جو محل لکھا اس میں اس نے بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ نائلہ کو اس کے وعدے کی یاد دہانی بھی کروادی تھی۔ دن گزرتے رہے، پھر ایک دن نائلہ اپنی والدہ سے اجازت لے کر غزالہ کے ہاں چلی گئی۔

غزالہ اس روز اپنے گھر میں پہنچی تھی۔ اس کی بی بی نہیں تھی ہوئی تھی اور اس کے بھیا اپنے کمرے میں موجود تھے۔ غزالہ نے اس کا تعارف اپنے بھیا پردیز سے کرایا۔ وہ نائلہ کو پردیز کے کمرے ہی میں لے گئی تھی۔ مکان کے اندر سب سے آخری کمرہ جس میں چاروں طرف چابجا دیواروں پر عورتوں کی نیم عریاں تصاویر آویزاں تھیں، بیجان انگیز تصویریں جس سے نائلہ کو خوف سا آنے لگا۔ نائلہ نے غزالہ سے اس کے بھیا کے اس ذوق کے بارے میں پوچھا۔ غزالہ نے مسکرا کر اس کو نال دیا۔ اب وہ دونوں وہیں تھیں کہ پردیز نوک کی دو بوتلیں لے آیا۔ جب وہ دونوں بوتلیں پنی چھیں تو پردیز نے غزالہ کو پردیسیوں کے ہاں سے امی کو بٹانے کے لئے بھیج دیا۔ میں ذرا امی کو بلا لاؤں۔ غزالہ نے مسکرا کر کہا اور نائلہ کو پردیز کے ساتھ تبا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ نائلہ کو غزالہ کا یہ طرز عمل کچھ پسند نہ آیا مگر وہ بے بس ہو کر بیٹھی رہی۔ دفعۃً دروازے کے پٹ بند ہونے کی آواز نے نائلہ کو چونکا

گی۔“ پرویز نے دھمکی دی اور پھر نائلہ کو ٹیکسی میں بٹھا کر چلا گیا۔

نائلہ اپنے گھر پہنچ کر چپ چاپ اپنی بے بسی پہ آنسو بہاتی رہی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ تیسرے روز وہ پھر غزالہ کے ہاں چلی گئی۔ غزالہ اور پرویز سے انسانیت کے نام پہ التجا کرنے مگر پرویز نے اس کی التجا کی قیمت پانچ ہزار روپے لکھ دی۔ پانچ ہزار روپے اس کی ان تصویروں کی قیمت جن کے منظر عام پر آنے سے ان کا خاندانی وقار ملیا میٹ ہو سکتا تھا مگر وہ پانچ ہزار کہاں سے لاتی۔ اس کے والدین اتنے امیر کہاں تھے اور پھر وہ یہ روپے کس طرح مانتی۔

”میں یہ رقم کہاں سے لاؤں؟“ اس نے پرویز سے التجا کی۔

”یہ رقم اکٹھی کرنا تمہارے لئے چنداں مشکل نہیں ہے۔“ پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور یوں وہ درپردہ پرویز کے اشاروں پہ ناپٹنے لگی۔ وہ ایسا کرنے پہ مجبور تھی۔

ایک عرصہ تک وہ گناہ کی اس دلدل میں ڈوبی رہی۔ آخر اس کے والدین کو اس کے معمولات پہ شک ہونے لگا اور یوں اسے گھر کی چار دیواری میں محصور کر دیا گیا۔ یوں والدین کے شبہات کافی حد تک اور پختہ ہو گئے۔ نیز اس عرصہ میں اسے غزالہ کے چند خطوط ملے جن میں اسے ملنے کی تاکید کی گئی تھی۔ آخری خط تو خاصا دھمکی آمیز تھا۔ اس دوران غزالہ اور پرویز نے اپنا مکان بھی بدل لیا تھا۔ بہر حال وہ پھر مجبوراً ان سے ٹی اور پھر سے پرویز کے ہاتھوں میں کھ پتی بن گئی۔

پرویز نے رفتہ رفتہ اسے عورت سے طوائف بنا دیا تھا۔ وہ اس کی عصمت نیلام کر کے پورے کئی ہزار کا چکا تھا مگر ابھی تک اس کے پانچ ہزار روپے نہیں ہوئے تھے۔ پھر ایک روز ایک عجیب حادثہ پیش آ گیا۔ نائلہ کا

دیکھا تو دھائیں مار مار کر روئی۔ اس نے اپنے کپڑے درست کئے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ اب بھی باہر سے بند تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ غزالہ اتنی مکار ثابت ہوگی۔ اتنی کم ظرف اور منچ بھی ہوگی۔ اس کو خلوص نے ڈس لیا تھا۔ قلمی دوستی نے اس کو برباد کر دیا تھا۔ آہ کتنا بڑا فریب کھایا تھا اس نے دوستی کے نام پر۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور غزالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نائلہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”نائلہ!“ اس نے نائلہ کو مخاطب کیا۔

”ذلیل عورت تو انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہے۔“ نائلہ نے نفرت سے غزالہ کے منہ پر تھوک دیا۔

”پیدا کئی طور پر کوئی بھی برا نہیں ہوتا نائلہ! حالات اور مجبوریوں ہی انسان کو برا بنا دیتی ہیں۔ میں بھی کبھی تمہاری طرح ایک پاکباز لڑکی تھی مگر... آہ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ پرویز کا قلمی دوستی کے لئے تعارف شائع ہوا تھا۔ اسے بہن کی ترنا تھی۔ میں نے اس کو خط لکھ دیا اور پھر ایک دن یہی دھوکہ میرے ساتھ بھی ہوا۔ پرویز نے میری عصمت لوٹی تو میں نے گھر واپس جانے کی بجائے زمانے سے اپنی لٹی ہوئی عصمت کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں پرویز کی ساتھی بن گئی اور اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی۔ اب تم بتاؤ کیا ارادہ ہے؟“

”غزالہ! میرا ضمیر زندہ ہے اور بے داغ بھی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔“

”تم گھر جاسکتی ہو مگر کبھی کبھار یہاں آتے رہنے کے لئے۔“ پرویز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ نائلہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ”دیکھو اگر تم نے ہمارے کہنے پہ عمل نہ کیا تو تمہاری تصویریں تمہارے رشتہ داروں اور اہل محلہ تک پہنچ دی جائیں

دلدل میں دھکیل دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کے ضمیر میں نیکی کی چنگاری سلگتی رہتی تھی۔ وہ تنہائیوں میں اکثر جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتی تو اس کے اندر کی نالکہ پھر سے بیدار ہو جاتی۔ وہ نالکہ جو زمانے کے ظلم و ستم کے ہاتھوں اپنی آرزوؤں کا قبرستان بن چکی تھی۔

اب جو نبی اسے موقع ملا تو آرزوؤں کے قبرستان میں زندہ درگور اس کے ضمیر کی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھی تھی۔ وہ گزشتہ تین سال سے گناہوں کی آگ میں جل رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کی عورت زندہ تھی۔ لہذا جو نبی اسے موقع ملا بھاگ نکلی مگر اس نے زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دینے کا عزم کر لیا۔ وہ مرنے جا رہی تھی لیکن قدرت نے اسے رشید سے ملا دیا۔ رشید انسان تھا۔ اس نے انسانیت کا فرض ادا کیا اور اسے موت کے منہ سے چھین کر لے آیا۔

نالکہ سسکیاں بھرتی ہوئی خاموش ہو گئی۔ میری آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ رشید رو رہا تھا۔ میری والدہ آنسو بہا رہی تھی۔ عجیب طرح کی سوگواریت طاری تھی ماحول پر۔ میرے اندر کی دنیا تہہ بالا ہو رہی تھی لیکن میں قہر درویش بر جان درویش کے مصداق کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے کئی ایک معززین سے یہ مشورہ کیا لیکن ایک خوبصورت عورت کے لئے کسی کے دل میں وہ جذبہ نہیں تھا جسے انسانیت کہا جاتا ہے۔ پھر بھی میں اس کی ڈھارس بندھاتا رہا۔ والدہ اس کو دلا سے دیتیں، اسے صبر کی تلقین کرتیں اور نالکہ فرط جذبات سے میری امی کے گلے نگ کر رونے لگتی۔ کہتے ہیں کہ نیت نیک ہو تو اللہ کوئی نہ کوئی سبیل

پیدا کر دیتا ہے۔ میں نالکہ کے لئے بہت پریشان تھا کہ اگلی صبح اچانک ایک زوردار دستک کی آواز برپا ہو۔ دروازہ کھولنے گیا تو سامنے حارث کو کھڑے دیکھ کر

خالہ زاد بھائی سہیل جو کہ اس کا مگنیتر بھی تھا ایک روز پرویز کے اڈے پر اس کا گاہک بن کر آ گیا۔ سہیل نے جب نالکہ کو اس روپ میں دیکھا تو نفرت سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ سہیل تو چلا گیا تھا مگر نالکہ فرط غم سے بے ہوش ہو گئی۔ وہ ماں باپ کی جس عزت کے لئے پرویز کے مظالم سہہ رہی تھی آج اس عزت کا بھرم کھل گیا تھا۔ اس نے روتے روتے پرویز سے کہہ دیا اور پرویز نے چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ مکان بھی بدل لیا۔ اب نالکہ نے بھی گھر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر وہ کیا منہ لے کر والدین کے گھر جاتی۔ غزالہ اور نالکہ کے علاوہ بھی چند ایک لڑکیاں پرویز کی سیاہ کاریوں کا نشانہ بن کر اس کے ظلم کے چال میں الجھی ہوئی تھیں۔ چند ہی روز بعد وہ ان سب کو لے کر کراچی سے لاہور آ گیا۔ لاہور آ کر اس نے غزالہ کے علاوہ باقی سب کو کوٹھے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ نالکہ سب سے آخر میں فروخت ہوئی۔ نالکہ کوٹھے پہ پہنچ کر دن رات بکتی رہی۔ ڈیڑھ سال تک وہ کراچی میں پرویز کے ظلم کا نشانہ بنتی رہی اور ڈیڑھ سال سے ہی وہ یہاں مختلف کوٹھوں پر فروخت ہوتی رہی۔

جس رات وہ میرے دوست ٹیکسی ڈرائیور رشید کو ملی تھی اس رات وہ ایک بڑے نیڈر کے لئے بیک ہو کر کوٹھے سے کوٹھی میں لے جانی گئی تھی۔ اس روز یوم آزادی تھا نا اور اس یوم آزادی کی یاد میں اس ایڈز نے ایک دھواں دھار تقریر کی تھی اور اب شام آزادی منانے کے لئے اسے عورت کی ضرورت تھی اور وہ عورت نالکہ تھی مگر نالکہ موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ وہ گناہوں کی اس زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔

اس زندگی سے اسے مر جانا زیادہ عزیز تھا مگر کوٹھے پہ اسے مرنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ ایک شریف خاندان کی بیٹی تھی۔ حالات نے اگرچہ اس کو گناہوں کی

عدالت میں پیش کر دیا گیا اور تیسری ہی پیشی میں انہیں دس دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ پرویز کا ان کے خلاف کیس بنیادی طور پر اس قدر مضبوط تھا کہ قید کے آخری دن تک اس میں ضمانت کی گنجائش نہیں تھی۔ نالکہ کے علاوہ سب لڑکیوں کو دارالامان بھجوا دیا گیا۔ پھر اس فرشتہ سیرت تھانیدار نے ایک ایک کر کے بچیوں کے لواحقین سے رابطے کئے۔ کسی کو اپنے پاس بلایا تو کسی کے پاس خود چلے گئے۔ یوں مہینے ڈیڑھ کے اندر اندر سب لڑکیاں اپنے اپنے والدین کے گھر پہنچ گئیں۔

نالکہ کے والدین سب سے آخر میں آئے۔ سہیل (نالکہ کا مگتیر) بھی ساتھ ہی تھا۔ نالکہ سے مل کر سب ہی جی بھر کے روئے۔ رات کے کھانے کے بعد خالد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ رمی سی خیر خیریت کے بعد وہ ان لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ سارے حالات سننے کے بعد وہ سہیل سے کہنے لگے۔

”سہیل بیٹے! اس دھرتی پہ رشتے نہیں انسان بستے ہیں اور غلطی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ سہیل! اگر تم اپنی سفلی خواہشات کے قدموں پر چل کر کسی کے جسم سے کھیلنے پرویز کے اڈے تک جاسکتے ہو تو تمہاری مگتیر کا کردار تمہاری نسبت انتہائی اجالا اور شفاف ہے کیونکہ اس بے چاری کو تو قدم قدم پر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف لٹنا پڑا تھا۔ نالکہ نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ بلاشبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے کہ حالات کی شکست و ریخت میں انسان کے مقدر کا بڑا غلغلہ ہوتا ہے۔ کسی بھی حادثے کو جب رونا ہونا ہوتا ہے تو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان لاکھ سہیل کی کوشش کرے لیکن یہ وہ ہوتی ہے جو ہو کر رہے گی ہر بہانے سے۔“

حیران رہ گیا۔ حادثہ تم اور بغیر اطلاع کے۔
”جی ہاں مرزا جی اسے کہتے ہیں سر پرانز۔ ابا کی تبدیلی گوجرانوالہ ہو گئی ہے۔ وہ دو ایک روز میں چارج لے لیں گے۔ میں صرف آپ کو یہ خوشخبری دینے آیا ہوں۔“

”حادثہ میرے بھائی!“ میں نے فرط جذبات سے حادثہ کو ہانپوں میں بھر لیا۔ حادثہ میرے جگر کی دوستوں میں سے تھا اور پرویز بھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر طرح کی مشاورت اسی سے کیا کرتا تھا۔ اس کے والد گوجرانوالہ پولیس میں بڑے آفیسر تھے اور ان کی دیانت اور فرض شناسی کے بڑے چرچے تھے۔ کوئی راہ نہ پا کر میں نے یہ سب کچھ حادثہ سے کہہ دیا۔ رات نو بجے کے قریب حادثہ اپنے والد کے ہمراہ ہمارے گھر آ گیا۔ نالکہ سے پوری داستان سننے کے بعد اور غزالہ اور پرویز کی کارگزاریاں جان کر غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نالکہ سے مخاطب ہوئے۔

”بیٹی! میں تمہاری لٹی ہوئی عزت تو واپس نہیں سکوں گا تاہم ان ہاتھوں کو ضرر توڑ دوں گا جو تم پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ میں پرویز اور غزالہ کو زمین کی تہوں سے کھینچ لوں گا۔ نشانِ عبرت بنا دوں گا دنیا والوں کے لئے۔ یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو، سکون سے رہو اور دعا کرو کہ اللہ مجھے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ہمت دے۔“ وہ رومال سے آنکھیں پونچھنے اٹھ کر گھر چلے گئے۔

اور پھر وعدے کے مطابق اس نیک نفس پولیس آفسر نے بہت جلد پرویز اور اس کے پورے گینگ کو محکوم کر لیا۔ مظلومان کی نشاندہی پُر ہیرا منڈی سے پانچ چھ لڑکیاں بھی برآمد کر لیں۔ بہت جلد جرائم کی لمبی چوڑی فہرست کے ساتھ مجرموں کا چالان کر کے

ہیں منسلک کر دیا گیا۔ خالد صاحب کے علاوہ میں نے
 ابھی بطور گواہ نکاح نامے پر دستخط کئے۔ پھر خالد مجھ
 سے کہنے لگے شہر بیٹے! اب ہفتہ دس دن مہمانوں کی
 خدمت کرو۔ دولہا بہن کی دعوتیں کرو اور یہ کل میرے
 گھر سے شروع کرو۔ انہیں لاہور دکھاؤ، گوجرانوالہ کے
 چڑے کھلاؤ۔ اس ضمن میں حادث آپ کی ہر ممکن مدد
 کرنے کا ہے۔

خالد صاحب بنانے لگے تو نانکھ کے والدین ان
 کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ ”خالد بھائی! یقین نہیں آتا
 کہ انسان دوسروں کے لئے اتنا ہمدرد بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”بزرگوار! مجھے گنہگار نہ کرو کہ میں نے آپ
 لوگوں کے لئے کچھ نہیں کیا۔“ وہ نانکھ کے والدین کو
 اوپر اٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں نے جو کچھ بھی کیا
 اس ذات پاک کی خوشنودی کے لئے کیا ہے جس کے
 سامنے ہم سب کو جو ابد ہونا ہے۔ اللہ کا شکر کرو کہ اس
 نے، آپ لوگوں کو کسی لمبی آزمائش میں نہیں ڈال دیا۔“
 وہ باہر نکل گئے اور ہم دیر تک دروازے کی بلتی ہوئی
 زنجیر کو دیکھتے رہے۔

کوئی دس بارہ روز بعد خالد صاحب نے انہیں
 کراچی کے ٹکٹ اور دیگر ڈھیروں تحائف وے کر
 گوجرانوالہ سٹیشن سے رخصت کیا۔ گاڑی تیز ہوتے
 ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں بہ چشم نم دیر تک
 فضا میں گزرے حالات کی فنی بگڑتی تصویریں دیکھتا رہا
 کہ اچانک حادث نے میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے
 کہا۔

”رو نہیں دوست کہ تم نے بہت بڑی نیکی کی ہے
 اور پھر اللہ نے اس نیکی کو قبول بھی کر لیا ہے۔“ میں
 شدت جذبات سے حادث کے گلے لگ گیا۔



کے مصداق وہ کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ کو منظور ہو۔
 سہیل بیٹے! تقدیر تمہاری بہن کو ابھی اس مقام
 تک لے جا سکتی تھی۔ ”میں نے دیکھا کہ یہ سن کر سہیل
 پورے جسم سے کانپ گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت
 یکدم تبدیل ہو گئی اور وہ حقی کے بل چیخا۔

”بس کرین انکل خدارا بس کرین ورنہ میں پاگل
 ہو جاؤں گا۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ انکل! اور میں
 آپ سب لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ اپنے کئے پر
 شرمندہ ہوں۔ میں اللہ سے اپنے کئے معافی مانگتا
 ہوں۔“ وہ سر محفل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ محفل پر
 سناٹا چھ گیا تھا۔ جب اچھی طرح سہیل کے دل کا غبار
 نکل گیا تو خالد صاحب نے اٹھ کر اس کا کندھا
 تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”شباباش بیٹے! تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنے
 گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ اٹھو! اور اپنی عزت کی
 دھجیاں سمیٹ لو کہ یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ بھی
 ہے اور اللہ کی رضا بھی۔ اٹھو اور صدق دل سے ایک نئی
 اور خوبصورت زندگی کا آغاز کرو۔“ سہیل نے نانکھ کے
 پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

”خدا کے لئے مجھے معاف کر دو کہ میں زندگی بھر
 تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہوں گا۔“

”نہیں میرے آقا! یہ آپ کیا کہہ رہے
 ہیں۔“ نانکھ نے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب میرا
 مقدر تھا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ان شاء اللہ
 زندگی بھر آپ کی دل و جان سے خدمت کرتی رہوں
 گی۔ آپ کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرتی
 رہوں گی۔“ بخت جذبات سے دونوں ایک
 دوسرے کے گلے لگ گئے۔

اگلے روز جمعہ المبارک تھا۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد
 ایک سادہ سی تقریب میں نانکھ اور سہیل کو رخصتہ ازدواج

سلسلہ رازنامہ

قسط: 2

لاڈورانی

دعا نے بھی محمود کے چہرے پر خفگی دیکھ لی تھی، مگر وہ ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خفا ہونا صرف اس کا حق بنتا تھا اور آج تک وہ اس حق کا بے دریغ استعمال کرتی آرہی تھی۔

(aqibkohlar@gmail.com)

☆ ریاض عاقب کوہلار



محبت کئی رنگ بدلتی ہے، لیکن جب شفقت و عقیدت، محبت کے روپ میں ڈھنکی ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں

محمود سرعت سے بولا۔ ”مجھ سے گر گیا تھا چچا جان!“

”یقیناً سچ کہہ رہے ہو، بہت بے پروا اور نکلے ہو تم۔“ رخسانہ نے اس انداز میں کہا کہ رضوان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”آپ نے تو ہنسنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جوان بیٹی کی حرکتوں کے بارے نہ سوچنا۔“ رخسانہ جملے کئے انداز میں بولی۔

”دیکھو بیگم، ہوا کچھ یوں ہے کہ میں نے محمود میاں کو کسی کام سے دفتر بھیجا اور ہماری بیٹی بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ محمود میاں کا کوئی ضروری کام تھا اس نے ہلکی سی معذرت کی۔ اس کے بعد جگ گلاس کیسے ٹوٹا یہ مجھے کوئی خاص معلوم نہیں، بس چھناکے کی آواز میں نے سنی تھی۔ اس کے بعد محمود

میاں کو باروچی خانے میں نیا جگ گلاس اٹھا کر وہاں رکھتے بھی میں نے گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے یہ ہے کل کہانی۔ اب آپ خود انصاف کریں۔ کیا محمود میاں کو اتنی بڑی زیادتی کرنا روا تھا۔“ رضوان نے دونوں ہاتھ پھیلا کر گویا اس زیادتی کا حجم بھی بتا دیا تھا۔

”چچ..... چچ..... اتنی بڑی زیادتی۔“ رخسانہ نے بھی افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ”اس بات پر تو

بھوک ہڑتال بنتی ہے نالاؤ کی۔“

”چچا جان!..... وہ سوئی ہوئی تھی۔ کیا اسے کھانے کے لیے جگایا بھی تھا یا ویسے ہی آپ دونوں ہمارا مذاق اڑائے جا رہے ہیں۔“

رخسانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”محترم! ملازمہ تین بار بلانے لگی تھی۔ اس کا بدترین جواب ہم نے تو کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے سن لیا تھا آپ بتا نہیں کن خیالوں میں کھوئے تھے۔“

”اچھا میں اسے کھلا دیتا ہوں۔“ پریشانی بھرے

”محمود بیٹا!..... کھانا لگ گیا ہے۔“ شاہینہ ماسی کی آواز اسے ماضی کی یادوں سے واپس کھینچ لائی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے ماسی، میں تھوڑی دیر آرام کروں گا۔“ اس نے کبل میں منہ چھپا لیا۔

شاہینہ ماسی نے پوچھا۔ ”بہیں لے آؤں بیٹا۔“

”نہیں، بھوک لگی تو بعد میں کھا لوں گا۔“

اور وہ ”ٹھیک ہے بیٹا!“ کہہ کر خواب گاہ سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد رضوان اور رخسانہ وہاں پہنچ گئے۔ ”کیا ہوا بیٹا۔“ رضوان نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”چچا جان!..... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سر میں ذرا سادورد تھا۔“

”دوائی لے لی۔“ رخسانہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نپر پر دیکھا۔

وہ پھینکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ایسی بھی کوئی بات نہیں چچی جان!..... لپکا پھلکا درو تو چلتا رہتا ہے۔“

”ویسے ہلکے پھلکے درد کی وجہ سے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔“ رضوان معنی خیز لہجے میں بولا۔ رخسانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”اب تک ناراض ہے۔“ محمود نے لہجے میں مصنوعی حیرانی پیدا کی۔

رضوان ہنسا۔ ”یہ بھی خوب کہی۔“

”آپ نے لڑائی کی وجہ نہیں بتلائی؟“ رخسانہ، شوہر سے پوچھنے لگی۔

”پہلے بھی کبھی مناسب وجہ پر لاؤدروانی خفا ہوئی ہے۔“ رضوان نے منہ بنایا۔

”ملازمہ، جگ گلاس کے ٹوٹنے کا کچھ کہہ رہی تھی۔“ رخسانہ نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔
 ”جی جناب!... اسے کھانا ہے یا نہیں، خود کھا لو۔“ رخسانہ چچی شفقت بھرے انداز میں اسے جھڑکتے ہوئے باہر نکل گئی۔ رضوان چچا بھی آنکھ مار کر مسکراتا ہوا نکل گیا تھا۔

دعا کی خواب گاہ تک جانا اتنا مشکل لگ رہا تھا گویا اسے آگ میں گھسا پڑ رہا ہے۔ پہلے تو گھر میں اس کی پسندیدہ جگہ دعا کی خواب گاہ ہوتی تھی۔ وہ بہت الابالی طبیعت کی مالک تھی۔ اس کے سامان کو ترتیب سے رکھنا۔ ملازمہ سے کپڑے استری کروا کر الماری میں لٹکانا، شام کو دودھ کا گلاس اپنی نگرانی میں پلانا، اس کی پڑھائی پر دھیان دینا، سردیوں گرمیوں میں اس کے لباس اور کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ گویا وہ سارے کام جو رخسانہ چچی کے کرنے کے تھے اس نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ اس عمر تک پہنچتے ہوئے اکثر لڑکیاں گھر کے سارے کام سنبھال لیتی ہیں مگر محمود کے بے جالاؤ نے دعا کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے نہ منانے کی صورت میں دعا نے رات بھر بھوکا رہنا تھا۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ وہ خفگی ظاہر کر رہی تھی۔ یہ تو آئے روز کا معمول تھا۔ ذرا سی بات کیا ہوئی، اس کی ناراضی شروع۔ چچا چچی اور بھائی تو اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھے۔ بلکہ تمام محمود کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے، لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی موجودی میں دعا بھوکی سو جائے یہ کسی طور بھی ممکن نہیں تھا۔ پر آج اسے دعا کے قریب جانے کے خیال ہی سے وحشت ہو رہی تھی۔ اور یہ تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دعا نے اس کے علاوہ کسی کی بات نہیں سننا تھی۔ اور جتنی بھی دیر ہوتی جاتی اس کی خفگی نے گہرا ہوتے جانا تھا۔

طبیعت پر جبر کرتے ہوئے وہ طوعن و کرہن اٹھا اور اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ دھڑکتے دل سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے اوندھے منہ لیٹ کر تکیے میں منہ گھسیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اس کے خفا ہونے کا یہی انداز تھا۔ بے ترتیب ہوتے لباس نے بدن کے کچھ ایسے زاویے نمایاں کر دیے تھے کہ محمود کو نظریں چرانا پڑیں۔ نامعلوم آج کیوں وہ مکمل اور نامحرم عورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ عورت ذات میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی وجہ سے تو چچا چچی کے زور پر بھی اس نے ایک بار رشتا ٹوٹنے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس سے چھوٹا فیضان تو شادی کے بعد بیرون ملک سیٹل ہو گیا تھا۔ افغان بھی شادی کر کے ان سے علیحدہ رہ رہا تھا۔ جبکہ اس نے چچا چچی کو کہا تھا کہ وہ دعا کی شادی کے بعد ہی شادی کرے گا۔ اور اب اسے لگ رہا تھا کہ دعا کی شادی جتنا جلدی ہو جاتی اتنا ہی بہتر تھا۔

چادر اٹھا کر لباس نے دعا کے وجود پر ڈالی اور بیڈ پر بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ریشمی زلفوں کے لمس نے ایک دم دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔ اس کی سمجھ سے یہ ناکفہ بہ حالت باہر تھی۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور تھوک نلگتے ہوئے منمنایا۔

”گڑیا!..... اٹھو کھانا کھا لو۔“ اس کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ وہ تو پتا نہیں کیسے کیسے پچکارتے ہوئے اس کے لاڈ اٹھاتا۔ اسے کھانا کھانے پر راضی کرتا اور اپنے ناکردہ قصور کی معافیاں مانگا کرتا۔

”آگئی میری یاد، پتا چل گیا کہ اس گھر میں کوئی بھوکا بھی موجود ہے۔“ خلاف توقع تکیے سے سر اٹھا کر وہ فوراً اٹھ بیٹھی تھی۔ ”جائیں آرام کریں۔ یا ان دوستوں کے پاس تشریف لے جائیں جن سے ملنا مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تمام ضروری کام بنائیں

مجھے بھوک لگے گی تو کھانوں گی۔“

”زیرا!..... میرے سر میں درد ہے پلیز ٹک نہ کرد اور چلو کھانا کھاؤ“ دعا کے لال بھبکا چہرے سے نظریں چراتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ پہلے وہ اس کی ایسی باتوں پر مسکرا دیا کرتا۔ ساتھ لپٹا کر گدگدی کرتا، کسی چیز کا لالچ دے کر فوراً راضی کر لیا کرتا، مگر آج اسے سارے طور طریقے بھول گئے تھے۔ جانے دعا میں کیا تبدیلی آگئی تھی۔ لیکن یہ تبدیلی اچانک تو نہیں آ سکتی تھی، پھر اسے آج ایک دم کیسے محسوس ہو گئی تھی۔ پچھلے ہی ہفتے خفا ہونے پر، پیٹ میں مسلسل گدگدی کرتے ہوئے وہ اسے مجبور کر کے کھانے کی میز پر لے آیا تھا۔ شاید وہ آج سہ پہر ہی کو چھوٹی بچی سے جوان لڑکی بن گئی تھی۔

”سر میں درد ہے تو آرام کریں، کس نے منت کر کے بلایا ہے۔“ دعا کا لہجہ بونھی بدتمیزانہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محمود کی نظر میں اس کی کتنی اہمیت ہے۔ گو یہ بدتمیزی اس کے لہجے تک ہی محدود رہتی تھی ورنہ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ وہ بھی اسے دل گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ کیونکہ دو تین بار محمود کے بیمار ہونے پر وہ رات بھر جاگ کر اس کا سر دبانے کے ساتھ اسے دوائیاں وغیرہ دیتی رہی تھی۔ محمود اور ماں باپ کی لاکھ منتوں کے باوجود وہ سونے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اگلے دن اس نے اسکول سے بھی چھٹی کر لی تھی۔

”ضد نہیں کرتے گڑیا۔“ جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

”بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔“ اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پر بھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چٹ

ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

”بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔“ اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پر بھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چٹ

ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

”بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔“ اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پر بھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چٹ

ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

”بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔“ اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پر بھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چٹ

ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولا۔

”بھیا، آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔“ اس کا معمول سے ہٹا ہوا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ دعا کو پتا نہ چلتا۔ اپنی خفگی پر بھینکتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار جانچنے لگی۔ اس حالت میں وہ قریباً اس سے چٹ

بعد وہ ایک چچ بھی منہ میں نہیں ڈال سکی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں گھستے ہی اس نے دروازہ اندر سے کھڑی کر دیا۔ ایسا وہ زندگی میں پہلی بار کر رہا تھا۔ دعا سے کوئی بعید نہیں تھا کہ منع کرنے کے باوجود اس کا سر دبانے بھاگ آئی وہ حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بستر پر لیٹ کر اس نے چادر اوڑھ لی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی سمجھ میں اپنی بے قابو ہوتی حالت نہیں آ رہی تھی۔ ایسا کیا ہوا تھا جو ایک دم دعا کے بارے اس کے خیالات تبدیل ہو گئے تھے۔ دعا کے ساتھ گزارے ماہ و سال اس کی یادداشت میں یوں محفوظ تھے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ کار والے دافعے پر رخسانہ چچی اتنی برہم ہو گئی تھی کہ اسے گھر سے نکلنے پر تیار ہو گئی تھی۔ اور پھر دعا ہی تھی کہ جس کی وجہ سے اس کی سزا پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔

عمران بچانے اگلے ہی دن آٹھ لاکھ روپے لاکر اس کے حوالے کر دیے تھے۔ کچھ پیسے ان کے پاس پہنچنے سے موجود تھے کچھ انھوں نے چند موسیقی اور اجناس وغیرہ بیچ کر پیدا کر لیے تھے۔

چچا عمران کے رخصت ہوتے ہی اس نے شوروم کا رخ کیا تھا۔ سرخ رنگ کی سوز کی مہران اس نے دعا کی خواہش پر پسند کی تھی۔ کار کو دیکھ کر دعا خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ اسے ہنستے اور قلقاریاں مارتے دیکھ کر محمود خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ لیکن جو بھی کار کے بارے رخسانہ چچی کو معلوم ہوا وہ اتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

”کیا مطلب زمین اور گھر چاچوں کے نام کر دیا ہے۔“ رخسانہ نے ہاتھ میں پکڑا لوالا منہ کی طرف لے جانے کے بجائے واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ”چچی جان

ہی جڑ کر بیٹھ گئی۔ ان کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی کہ جب وہ کمرے میں چاول کھاتے تو ٹرے میں کھانے تھے۔ علاحدہ علاحدہ پلیٹ میں چاول ڈالنے کی زحمت انھوں نے کبھی نہیں کی تھی۔

غیر محسوس انداز میں اس سے فاصلہ پیدا کرتے ہوئے وہ چاول کھانے لگا۔ اس نے دعا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

دو تین چچ زبردستی چبا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے گڑیا! ... تم کھاؤ میں ذرا آرام کر لوں۔“

”یہ بھلا کیا بات ہوئی بھیا!“ دعا نے منہ بسور۔ ”یہ کوئی بات بھی نہیں ہے۔“ اس کے سر پر پیار بھری تھکی دیتے ہوئے محمود نے زبردستی کی مسکراہٹ بنوٹوں پر بکھیری۔ ”میں دوائی لے کے لیٹ رہا ہوں تم بھی کھانا کھا کر آرام کر دو۔“

وہ جدی سے بولی۔ ”کھانا کھا کر آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“

محمود نے بہانہ گھڑا۔ ”چائے پی لی تو نیند نہیں آئے گی اور مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“

”اچھا میں تھوڑی دیر سر دبانے آؤں گی، آپ کو نیند آنے پر واپس آ جاؤں گی۔“ دعا معمول کے مطابق بات کر رہی تھی، جبکہ محمود کو دھشت چھپانے کے لیے عجیب و غریب بہانے گھڑنے پڑ رہے تھے۔

”جب تم سر دباؤ گی تو نیند کیسے آئے گی؟“ اس نے پھکی مسکراہٹ سے گویا دعا کی بے دہانی اجاگر کی تھی۔

دعا نے منہ بنایا۔ ”پہلے تو آ جایا کرتی تھی۔“

”جی نہیں پہلے میں جھوٹ بولا کرتا تھا۔“ لہجے میں زبردستی کی شوخی پیدا کرتا وہ اس کے کمرے سے نکل آیا اور دعا عجیب انداز میں اس کی پشت گھورتی رہ گئی۔ وہ گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔ محمود کے جانے کے

”ٹھیک ہے چچی جان، کل تک کی مہلت دیں۔ میں کرائے کا مکان تلاش کر لیتا ہوں۔“ چچی کی باتیں سن کر اس سے کھانے کا نوالہ نہیں لیا گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دعا بھی نم آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے میز سے اٹھتے ہی وہ بھی پیچھے بھاگ پڑی۔

”کہاں جا رہی ہو، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔“ رخسانہ نے غصے بھرے لہجے میں دعا کو آواز دی لیکن وہ سنی اُن سنی کرتے ہوئے محمود کے کمرے میں گھس گئی۔ رضوان بھی کھانا درمیان میں چھوڑ کر خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ رخسانہ کے ساتھ دونوں بیٹے ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔

”میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ بیڈ پر یہ مشکل بیٹھا ہی تھا کہ دعا اس کے پیچھے کمرے میں پہنچ گئی۔

”گڑیا!..... یہ میرا گھر تو نہیں ہے نا۔ اور تم فکر نہ کرو میں روزانہ اپنی گڑیا کو کار پر سکول چھوڑنے اور واپس لینے آیا کروں گا۔ اب تو میرے پاس کار موجود ہے نا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کائنات اور سدرہ جہنمی چیزیں کیسے میری گڑیا کا مذاق اڑاتی ہیں۔“ وہ یہ ظاہر تو دعا کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کے اپنے دل کی جو حالت تھی یہ وہ خود جانتا تھا یا اس کا خدا۔ اسے غم تھا تو صرف اس بات کا کہ چلے جانے کی صورت میں دعا اس سے دور ہو جاتی۔ لیکن اس کے ساتھ رخسانہ چچی نے جس طرح اس کی توہین و تذلیل کی تھی وہ بھی بھلائے جانے کے قابل نہیں تھی۔

”مجھے کار نہیں چاہیے۔“ وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ”آپ کار واپس کر دیں میں بائیک پر ہی چلی جاؤں گی لیکن آپ گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔“

”میں گھر چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں گڑیا!..... میں

!..... میں نے زمین کو کیا کرنا تھا اور پھر گاؤں میں جا کر میں نے تھوڑی رہنا ہے۔“

”تو کہاں رہو گے، کیا ساری زندگی پرائے دروازے پر پڑے رہو گے؟“ رخسانہ چچی نے زہریلے لہجے میں حقیقت اگلی۔ ”یہ گھر تو فیضان اور افغان کا ہے۔“

محمود نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ اس سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا تھا۔

”اس طرح نہیں کہتے نیک بخت!“ رضوان نے دبے لہجے میں محمود کی طرف داری کی۔

”تو کیا کہوں۔ اور آپ تو اس کی شادی کروانے کے چکر میں ہیں۔ کیا بریرہ لی بی بھی نہیں آکر ڈیرے جمائے گی۔ یہ یتیم خانہ یا بے گھروں کی پناہ گاہ نہیں میرا گھر ہے۔“

”میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لوں گا چچی جان!“

”بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ ہم سے جتنا ہوسکا تمھارے لیے کیا، اب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے لیے کرائے کا کوئی گھر تلاش کر لو تا کہ تمھاری خالہ کے پاس جا کر میں بریرہ کے رشتے کی بات کر سکوں۔ یا پھر انھی سے کہو کہ تمھیں گھر بنا کر دیں۔ تمھاری زمین پر بھی تو انھی نے قبضہ کر لیا ہے نا۔“

”قبضہ کہاں کیا ہے اللہ کی بندی!“ رضوان نے دوبارہ مداخلت کی۔

”آپ چپ رہیں جی!..... یہ چھوٹا تھا تو آپ نے من مانی کی ہے۔ اسے پڑھایا لکھایا ہے اچھی نوکری تلاش کر کے دی ہے۔ اب اس کا یہاں کیا کام؟“ رخسانہ چچی کو اس کا زمین دینے کا فیصلہ بالکل ہی پسند نہیں آیا تھا۔

”ٹھیک ہے نہ کھاؤ میری جان!“ وہ اسے چھاتی

سے لگائے باہر جانے لگا۔

”بھاڑ میں جاؤ..... نہ کھاؤ۔“ رخسانہ غصے سے

بڑبڑاتی اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ رضوان، فیضان اور افنان بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔ رضوان بیوی سے دعا کے زونے کی وجہ دریافت کرنے لگا۔ جبکہ محمود اسے لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

”کچھ نہیں، ہلکا سا ڈانٹا ہے اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کا بھیا بھی یوں رو رہا ہے گویا میں نے اسے گولی ہی تو مار دی ہے۔“ افسوس بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ خواب گاہ میں گھس گئی۔

”رخسانہ بیگم!..... تمہیں محمود سے یوں گفتگو نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ رضوان افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہی تو کہا ہے، بھلا کیا بات ہوئی ایک کار خریدنے کے لیے اپنی زمین کوڑیوں کے مول بیچ دی، کہ اس کی لاڈلی کی تشریف ہی بایک کی گدی پر نہیں نکلتی۔“ رخسانہ نے جل بھن کر جواب دیا۔ ”میں نے بھی جان بوجھ کر ایسی باتیں کی ہیں کم از کم بھیا کی لاڈلی کو بھی احساس ہوگا کہ ہمیشہ ضد کرنا اچھا نہیں ہوتا۔“

”یعنی وہ باتیں دعا کو تنگ کرنے کے لیے تھیں۔“ رضوان نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں، اس کے بھیا صاحب کو بھی تو احساس دلانا تھا کہ بچوں کی ہر ضد کو پورا نہیں کیا جاتا۔ یہ تو نہیں کہ اس نے جو منہ سے نکالا محترم اسے پورا کرنے کے لیے بھاگ پڑا۔“

”نیک بخت وہ اسے بہت زیادہ پیاری ہے، کوئی سگا بہن بھائی تو ہے نہیں اپنی ساری محبتیں اس نے دعا بیٹی پر نچھاور کر دی ہیں اور اب وہ دل کے ہاتھوں مجبور

روزانہ تمہیں ملنے آؤں گا۔“

”میں خود پاپا سے بات کرتی ہوں۔“ دعا نے وہاں سے اٹھنا چاہا۔

”نہیں۔“ محمود نے اسے پکڑ کر وہیں بٹھا لیا۔ ”بڑوں کو تنگ نہیں کرتے گریبا، چچی جان نے صحیح کہا ہے۔ مجھے چلے جانا چاہیے کب تک پرانے گھر میں پڑا رہوں گا۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرائی تھی۔

”جانتی ہوں آپ یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ آپ بھی مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔“ وہ بچل کر اس کی گرفت سے نکلی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ محمود جانتا تھا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اور جب تک وہ محمود سے یہ نہ منوالیتی کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گا اس نے کھانا نہیں کھانا تھا۔ لیکن محمود کی بد قسمتی کہ یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ دل پر بھاری بوجھ لیے وہ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے دعا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ رخسانہ چچی کی آواز بھی آ رہی تھی وہ اسے زبردستی کھانا کھانے کی کوشش میں تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا اسی لمحے اس کے کانوں میں چٹاخ کی آواز گونجی۔ یقیناً دعا کو ماں نے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، اس سے صبر نہ ہوا اور وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ دعا زور زور سے رونے لگی۔

”چچی جان!..... یوں تو نہ کریں نا۔“ اس کی آواز میں غم، غصہ، بے بسی اور نہ جانے کیا کیا شامل تھا۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے تھے۔ روتی ہوئی دعا کو اٹھا کر اس نے چھاتی سے لگا لیا۔

”نہیں کھاؤں گی کھانا..... نہیں کھاؤں گی نہیں نہیں نہیں.....“ دعا رو رو کر چیختے ہوئے مسلسل کہے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ہے۔“

محمود روتی چلتی دعا کو گھر سے باہر لے آیا۔
 ”اچھا اب بس کرو نا، اچھے بچے روتے نہیں
 ہیں۔“ سڑک پر چڑھتے ہی اس نے دعا کو پچکارا۔
 ”آپ نہیں نہیں جائیں گے ٹھیک ہے نا۔“ اس
 نے منہ بسورا۔

”اچھا میں ایک چھوٹا سا خوب صورت سا
 گھر خرید لیتا ہوں اور اس میں، میں تم اور تمھاری بریرہ
 آپلی رہیں گے، بریرہ آپلی تمھیں اچھی لگتی ہے نا۔“
 ”وہ کیوں ہمارے ساتھ رہے گی۔“ رونا بھلا کر
 وہ محمود کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں اس سے شادی کروں گا نا؟..... جیسے
 تمھاری امی جان، تمھارے ابو جان کی بیوی ہے تا تو
 ایسے ہی تمھاری بریرہ آپلی میری بیوی بنے گی۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں، آپ کی بیوی میں خود بنوں
 گی۔“ اس نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔ اور محمود
 قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”نہیں نا، میں تو تمھارا بھیا ہوں اور بہنوں سے
 شادی نہیں ہو سکتی۔“

اس نے ننھے منے ذہن پر زور دے کر کچھ سوچا
 اور بولی۔ ”ٹھیک ہے لیکن بریرہ آپلی سے بھی شادی نہ
 کرو۔ بس سننے گھر میں ہم دونوں رہیں گے اور وہاں
 امی جان کو بالکل نہیں آنے دیں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ محمود نے اثبات میں سر ہلاتے
 ہوئے کارایک بوتل کی پارلنگ میں موڑ دی۔
 ”اب بتاؤ میری گڑیا کیا کھائے گی۔“
 ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر
 ہلایا۔

”بری بات۔“ محمود نے فحشی بھرے لہجے میں
 کہا۔ ”کائنات اور سدرہ جیسی گندی بچیاں بڑوں کا کہنا

رخسانہ نے منہ بنایا۔ ”تو کیا وہ ہمیں نہیں ہے
 پیاری۔ ابھی اس کے رونے کی وجہ سے میرے دل کی
 کیا حالت ہوئی ہے، میں بتا نہیں سکتی لیکن اس کی ضد
 کی وجہ سے مجھے غصہ بھی تو آیا ہوا تھا۔ گھر میں ایک کار
 موجود ہے ان پیسوں سے شادی کے لیے ضروری
 خریداری بھی تو کی جاسکتی تھی۔ آپ کی محترم بھابیاں تو
 یہ سمجھتی ہیں تا کہ میں نے محمود صاحب کی ساری تنخواہ
 سنبھالی ہوئی ہے۔“

”اس نے تو ساری تنخواہ میرے حوالے ہی کرنا
 چاہی تھی میں نے خود منع کر دیا۔ اب بھی گھر کا سارا
 خرچ، اسی کی تنخواہ سے چل رہا ہے۔ میری تنخواہ تو
 سیدھے سیدھے اکاؤنٹ میں چلی جاتی ہے۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے زیادہ طرف داری کی
 ضرورت نہیں، جانتی ہوں سب۔“ رخسانہ نے بے
 زاری سے کہا۔

”تو اب اس کے رشتے کی بابت کیا سوچا
 ہے؟“ رضوان نے موضوع تبدیل کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا
 کہ رخسانہ کو محمود کی تعریف پسند نہیں تھی۔

”اتوار کو چلیں گے۔ یوں بھی اس کی بیوی نے
 اسے کمرے ہی میں رہنا ہے۔ تو اس میں ہمیں کوئی
 مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب تک ہم دونوں موجود ہیں وہ یہیں
 رہ سکتا ہے۔ دعا کی شادی کے بعد اپنے گھر میں شفٹ
 ہو جائے گا۔ بلکہ ابھی سے اس کے کانوں میں ڈال لو
 کہ بچت کر کے پلاٹ وغیرہ خرید لے تا کہ کل کلاں کو
 آسانی سے گھر بنا سکے، ساری تنخواہ اپنی لاڈلی کے ناز
 خروں پر نہ لٹاتا رہے۔“

”صحیح ہے۔“ اس سے اتفاق کرتے ہوئے
 رضوان نے اثبات میں سر ہلادیا۔ رخسانہ کی بات رد
 کرنے کے قابل نہیں تھی۔

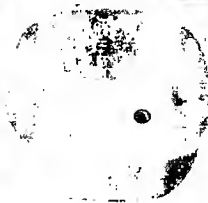
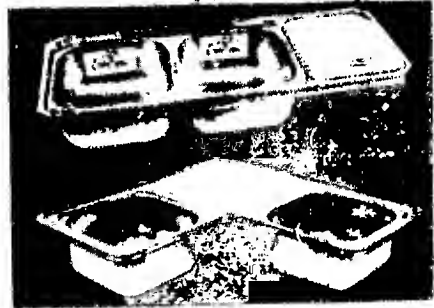


جوڑ سے بے نیاز تعمیراتی سے زیادہ مضبوط

اٹلس

100% سٹیل
سینکس سٹیل

پاکستان میں سب سے پہلے بنائے گئے



اٹلس وائیگی برانڈ

پکچن سینک

واش بیسن

لیبارٹری باؤل

سٹیل سینک

مین ہول کور



HUSSAIN STEEL INDUSTRIES

Office:

Bazar Kharaden, Gujranwala, Pakistan.

Ph: 0092-55-4218965, 4222947. Fax: 0092-55-210945

E-mail: info@atlassinks.com Web: www.atlassinks.com

Factory:

Opp. Global Village Hotel;

G.T. Road, Gujranwala Cantt, Pakistan.

Ph: 0092-55-3882462, 3861174-75, Fax: 0092-55-381176

کمرے میں بھی نہ آیا کریں۔“
 ”ارے میری کتنی پری خفا ہے۔“ ساتھ بیٹھے ہوئے رخسانہ اسے چومنے لگی۔

”محمود بھائی نیا گھر لے رہے ہیں اور وہاں ہم آپ کو بالکل بھی نہیں آنے دیں گے، نئے گھر میں میں اور محمود بھیا اکیلے رہیں گے۔ اور وہ شادی بھی نہیں کریں گے۔“

رخسانہ رونی صورت بنا کر بولی۔ ”یہ تو زیادتی ہے نامما کے ساتھ۔ آپ دونوں بھی تو اتنا عرصہ میرے گھر میں رہے ہو۔“

”آپ کے گھر تو نہیں رہے۔ ہم تو اپنے اپنے کمرے میں رہتے تھے۔“ دعا جھگڑے کے لیے تیار تھی۔

”اچھا صلہ نہیں ہو سکتی۔“
 ”بالکل بھی نہیں۔“ دعا نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”اگر میں تمہارے محمود بھیا کو یہاں سے نہ نکالوں تو کیا پھر بھی صلہ نہیں کرو گی۔“

وہ ایک دم لپٹ کر اس کے گال چومنے لگی۔
 ”چاپلوس کہیں کی۔“ رخسانہ نے ہنستے ہوئے اسے چھائی سے لگا لیا۔

”ممما!... میں بھیا کو کہوں گی وہ کار بھی واپس کر دیں گے بس آپ انھیں گھر سے نہ نکالیں۔“

وہ متا بھرے لہجے میں بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے اب سو جاؤ میں تمہارے بھیا کو گھر سے نہیں نکالوں گی۔ اور اسے کار واپس کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

”ظہرو میں بھیا کو بتا دوں یہ نہ ہو وہ نیا گھر خرید لیں۔“ بیڈ سے چھلانگ لگا کر وہ محمود کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ رخسانہ بھی ہنستے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

نہیں مانتیں۔ میری گڑیا تو بڑوں کا کہنا مانتی ہے۔“
 ”امی کا کہنا بالکل نہیں مانوں گی۔“ دعا نے منہ بسورا۔

”یہ تو اور بھی بری بات ہے۔ تمہیں بھی لوگ کائنات کی طرح گندری پچی سمجھیں گے۔“ محمود ہمیشہ اس کی کلاس فیلو کائنات کی مثال دے کر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور کائنات کی طرح نہ بننے کے خیال میں وہ کافی باتیں مان جایا کرتی تھی۔
 ”مجھے لوگوں کی پردا نہیں ہے۔“ بے پردائی سے کہتے ہوئے وہ کار سے اتر گئی۔ اس کے انداز پر محمود کو ہنسی آگئی تھی۔

دعا کی وجہ سے اس نے خود بھی تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ کھانے کے بعد وہ اسے آئس کریم کھلانے لے گیا۔ وہاں سے اس نے ایک شاپنگ پازہ کا رخ کیا جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔ تبدیل ہوتے موسم کو مد نظر رکھ کر اس نے دعا کے لیے سرخ رنگ کا ایک خوب صورت کوٹ اور اسی رنگ کی گرم ٹوپی خریدی۔ حالانکہ اس کی الماری ایسے سامان سے بھری پڑی تھی پھر بھی محمود اس کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتا رہتا تھا۔ گھٹنا ڈیڑھ گھر سے باہر رہنے کے بعد وہ اسے واپس لے آیا۔

”اب میری گڑیا سوئے گی۔“ بیڈ پر لٹاتے ہوئے محمود نے اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور شب بخیر کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

رخسانہ انھی کی منتظر تھی۔ جب وہ دعا کی خواب گاہ کے قریب پہنچی اس وقت محمود وہاں سے نکل رہا تھا۔

”اتنا خوبصورت کوٹ کس کا ہے۔“ ٹیبل پر رکھے نئے کوٹ کو اٹھا کر رخسانہ نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

”میرے کوٹ کو ہاتھ نہ لگائیں اور میرے

تمھارا جواب نفی میں ہوگا۔ اور میں بھی تمھاری توجہ اسی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ گو میرے طریقے سے تمھیں اختلاف سہی پر میری نیت غلط نہیں ہے۔ سوچو اپنی زمین اور گھر کا حصہ چاچوں کے حوالے کرنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم یتیم ہو انھیں چاہیے تمھاری مدد کریں نہ کہ تمھاری زمین اُونے پُونے داموں ہتھیانے کی کوشش کریں۔“ وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رک کی اور پھر اس کی بات جاری رہی۔

”تم نے دعا کے لیے کار خریدنے کے لیے اپنی ساری زمین کوڑیوں کے مول فروخت کر دی۔ وہ تو بچی ہے تم تو بچے نہیں ہو۔ اسے ورغلا سکتے تھے۔ تمھاری کسی بھی بات سے وہ انکار نہ کرتی۔ اب بھی تمھارے جانے کا سن کرو وہ کار واپس کرنے پر رضامند ہو گئی ہے کہ نہیں۔ کیا اس کی ہر خواہش پوری کرنا تمھارا فرض ہے۔ جانتی ہوں تمھیں بہت پیاری ہے۔ تو کیا ہمیں نہیں ہے پیاری۔ وہ میری بیٹی ہے، میں اس کی بہتری کے لیے سختی روا رکھتی ہوں ورنہ میرا بھی دل کرتا ہے اس کی کسی بات کو رد نہ کروں۔ کل کو اس نے پرانے گھر جانا ہے۔ وہاں وہ اپنا محمود بھیا کہاں سے لائے گی؟ یقیناً چند دن بھی سسرال میں نہیں گزار پائے گی اور اس کا رشتا ٹوٹنے کا دکھ ہم سے کئی گن زیادہ تمھیں ہوگا۔ بیٹا!..... یاد رکھنا مبالغہ کسی بھی چیز میں اچھا نہیں ہوتا۔ نہ محبت و شفقت میں اور نہ نفرت و دشمنی میں۔“ رخسانہ نے زندگی میں شاید پہلی بار اسے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ محمود نے عجیب سی نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ”اور اب آرام کرو میں اس اتوار کو جاؤں گی تمھاری خالہ کے پاس۔ فکر مت کرو تمھاری بریرہ کے لیے بھی اس گھر میں گنجائش موجود ہے۔ مجھے بس وقتی طور پر غصہ آ گیا تھا کہ تمھیں اس طرح جھاڑ دیا۔ باقی یہ تو تمھاری گڑیاں بتا ہی دیا ہوگا

”بھیا!..... بھیا!“ وہ بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اسے جوش بھرے انداز میں اندر داخل ہوتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

پاس جاتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی۔ ”بھیا!..... نیا گھر نہ خریدنا۔ ممانے بتا دیا ہے کہ وہ آپ کو یہاں سے نہیں نکالیں گی۔“ خوشی سے اس سے صحیح طور پر بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

”اچھا نہیں لیتا اب جاؤ آرام کرو۔“ اسے پیار کرتے ہوئے وہ پھکیے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ اس گھر میں رکن محمود کے لیے کتنا مشکل تھا۔ اس کی انا اور خود داری پر جو تازیانے رخسانہ چچی نے چلائے تھے اس کے بعد بے روزگار بھی ہوتا تو وہاں نہ کتنا۔ اب تو وہ ٹھیک ٹھاک نوکری کر رہا تھا۔

وہ جس طرح بھاگتے ہوئے وہاں آئی تھی اسی تیز رفتاری سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

رخسانہ چچی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”بھینھو!“ اسے کہہ کر وہ بھی صوفے پر ٹپک گئی۔ محمود خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ”یقیناً تمھیں مہری گفتگو بہت بری لگی ہوگی۔ اور لگنا بھی چاہیے کہ میں نے الفاظ ہی اتنے تلخ استعمال کیے تھے۔ لیکن یاد رکھو کہ میں جتنی بھی معذرت کر لوں اور تمھیں ان الفاظ نے اتنی ہی اذیت کیوں نہ پہنچائی ہو۔ اس سے انکار نہ تم کر سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا تیسرا کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ گھر کا سارا انتظام تقریباً تمھاری تنخواہ سے چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی تم نے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن کیا اس وجہ سے فیضان اور افنان تمھیں گھر میں حصہ دینے پر تیار ہو جائیں گے؟ یقیناً

میں کہتے ہوئے اس نے موبائل فون ہتھ کے نیچے رکھا اور بیڈ سائیڈ کے کونے پر لگا ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کر دیا۔

”معذرت خواہ ہوں بھیا، آپ کو اس وقت زحمت دی۔“ فیضان کے چہرے پر چھائے عجیب سے تاثرات اسے مزید حیران کر گئے تھے۔
”زحمت کیسی بیٹھو۔“ محمود نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھنے کے بجائے اس نے صوفے کے ساتھ رکھی فوم والی کرسی اٹھائی اور بیڈ کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا۔
”خیر تو ہے۔“ اس کے بیٹھے ہی محمود نے نرم لہجے میں پوچھا۔
”بھیا!.....“ کہہ کر فیضان اضطراری انداز میں ہاتھ مروڑنے لگا۔

”فیضان! تم کافی پریشان لگ رہے۔ کیا بات ہے، بتاؤ تو سہی۔“ محمود نے آگے ہو کر اس کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”بھیا!..... آپ خفا ہو جائیں گے۔“ فیضان کے لہجے میں گہرے دکھ کی آمیزش تھی۔
”یار!..... کچھ پتا تو چلے۔“ محمود نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھالیا۔

”بھیا!.....“ فیضان نے سسکنے کے انداز میں کہا اور اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئیں۔

”پاگل تو نہیں ہو فیضان!..... میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ اگر سگا نہیں بھی ہوں تو یقین مانو میں نے تمہیں کبھی بھی گئے بھائی سے کم نہیں سمجھا۔“

”اسی سوچ نے تو ہمت دی ہے بھیا!“
”اب مجھ سے تھپڑ کھاؤ گے۔“ محمود نے اسے پیار سے ڈالنا۔

اس مرتبہ فیضان نے جھپکتے ہوئے اپنا موبائل

کہ نیا گھر خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس بے چاری کو بھاگ کر تمہیں یہ بتانے آنا پڑا۔ اور تمہاری ہی وجہ سے اس نے مجھے اتنی جلدی معاف بھی کر دیا۔“ آخری فقرے رخسانہ نے ہنستے ہوئے کہے تھے۔

محمود کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔ رخسانہ کی باتوں سے ذرا سا بھی اختلاف نہ رکھنے کے باوجود وہ وہاں نہ ٹھہرتا مگر کیا کرتا کہ دعا کے بغیر رہنا بھی تو اسے کا دربار دنگ رہا تھا۔

چچی کے جانے کے بعد اس نے نائیت بلب آن کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ صبح پہلے دن دعا نے کاریں اسکول جانا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلوز کے سامنے خوب باتیں بنائے گی۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی مچنے لگی۔ دعا کو ہر جگہ سر بلند کرنا ہی تو اسے مقصد زندگی نظر آتا تھا۔ اچانک اس کے دماغ میں چچی کی رشتہ مانگنے والی بات آئی اور بریرہ کی دلکش صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ تپائی پر پڑا موبائل فون اٹھا کر اس نے تصویروں کا فولدر نکالا اس میں ایک جگہ بریرہ نے دعا کو گود میں اٹھا کر تصویر کھینچوائی تھی۔ دعا کی وجہ سے اب تک وہ تصویر اس کے موبائل میں موجود تھی۔ تصویر کھول کر وہ بریرہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھنے لگا۔ بلاشبہ وہ اس قابل تھی کہ اسے شریک حیات بنایا جاتا۔ یوں بھی وہ اس کی چچا زاد کے ساتھ خالہ زاد بھی تھی۔ اور شکلیہ خالہ نے بغیر کسی تردد کے اس رشتے کے لیے ہاں کر دینا تھی۔

وہ انہی خیالات میں کھویا تھا کہ دروازہ ہلکے سے بجا۔ اور اس کے کانوں میں فیضان کی مدہم سی آواز پڑی۔

”محمود بھائی!..... میں اندر آ سکتا ہوں؟“
”آ جاؤ دروازہ کھلا ہے۔“ حیرانی بھرے انداز

”جی بھیا!..... جب سے اسے پتا چلا مسلسل روئے جا رہی ہے۔“

”جاؤ اسے چپ کراؤ۔ اگر وہ مجھے بھائی سمجھتی ہے تو میں بھی اسے اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔ اور اس کے بارے پچا جان نے کہا تھا ورنہ میرے تو گمان میں بھی شادی وغیرہ نہیں تھی۔“

”شکریہ بھیا! فیضان خوشی سے اچھلتا ہوا اس کی خواب گاہ سے نکل گیا۔ وہ سول انجینئرنگ کر رہا تھا۔ چند ماہ تک اس نے تعلیم سے فارغ ہو جانا تھا۔

فیضان کے جاتے ہی اس نے یوب لابیٹ آف کی اور سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے خیالوں کو رونق بخشنے والی بریرہ ایک دم اس کی سوچوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ وہ شروع دن سے اس کے ساتھ کافی بے تکلف تھی لیکن فیضان کے ساتھ اس کے چلنے والے چکر سے وہ بالکل ناواقف تھا۔

☆☆☆

فیضان اور بریرہ کا رشتا رخسانہ چچی کو بالکل قبول نہیں تھا۔ وہ فیضان کے لیے کسی بڑے گھر کی لڑکی کو بہو بنانے کا سوچے بیٹھے تھی۔ محمود کی بات سنتے ہی وہ ہتھے سے اکھر گئی تھی۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر بڑا ہونے کے ناتے پہلے تمھارا شادی کرنا بنتا ہے، سارے خاندان والے کیا سوچیں گے کہ بڑے کو چھوڑ کر چھوٹے کے بیاہ کی فکر اس لیے پڑ گئی کہ بڑا میرا اپنا بیٹا نہیں ہے۔“

محمود نے جلدی سے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے چچی جان!..... فیضان اور بریرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کی پسند کو یوں نظر انداز کر دینا عقل مندانہ فیصلہ نہیں ہوگا۔“

”محمود ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رضوان نے فوراً محمود

فون نکالا اور ایک میسج سامنے لا کر موبائل فون اس کی جانب بڑھا دیا۔

محمود نے حیرانی بھرے انداز میں اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے کر سکرین پر نظریں دوڑائیں۔ کسی چاند کی طرف سے میسج تھا۔ وہ میسج پڑھنے لگا۔

”فیضی!..... پلیز تم پچا جان سے بات کرو نا یا محمود بھائی کو بتا دو۔ یقین مانو میں نے انھیں ہمیشہ بھائی کی نظر سے دیکھا ہے یہ نپا رشتا کیسے نبھا پاؤں گی۔ اور تمھاری بھائی بننا تو مجھے زندگی سے بیزار کر دے گا۔ میں تمھارے بغیر مر جاؤں گی فیضی۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔“

”یہ بریرہ کا میسج ہے؟“ موبائل واپس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے محمود نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

”جی بھیا!..... فیضان نے سر جھکاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟“

”جب وہ آٹھویں میں پڑھتی تھی۔“ فیضان کی آواز میں کئی قسم کے اندیشے نرزاں تھے۔

”ہا..... ہا..... ہا.....“ محمود کے ہونٹوں سے قہقہہ برآمد ہوا۔ ”مطلب چار پانچ سال ہو گئے ہیں میرے چھوٹے بھائی کو جوان ہوئے۔ اور میں اسے اب تک نابالغ سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے شفقت بھرے انداز میں فیضان کا کان پکڑا۔

”بھیا! وہ اس سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔

”پانگل!..... یہ اتنی بڑی بات تو نہیں ہے کہ تم

رات کے اس وقت پریشانی بھرے انداز میں دوڑے چنے آئے۔ بے وقوف مجھے تو پریشان ہی کر دیا تھا۔“

”شکریہ محمود بھیا!..... یقین مانو میری زندگی کا سوال تھا۔“

”وہ بھی جاگ رہی ہوگی۔“

پاس دوڑا چلا آیا تھا۔

”محمود بھائی!..... بات ہوئی امی جان ہے؟“
 ”وہ نہیں مان رہیں یار، البتہ میں نے اپنے لیے
 بریرہ کا رشتا مانگنے سے منع کر دیا ہے۔“
 ”انھیں مسئلہ کیا ہے؟“ فیضان نے غصے بھرے

لہجے میں پوچھا۔

”یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔“ محمود نے بے
 پروائی سے کندھے اچکائے۔ ”جتنا ہو سکتا تھا میں نے
 منتیں کی ہیں مگر میری بات کو انھوں نے درخور اعتناء
 نہیں جانا۔ چچا جان کا ووٹ بھی تمھاری طرف
 ہے۔ چچی جان ان کی بات بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔“
 ”شکریہ محمود بھائی!..... اب آپ فکر نہ کریں باقی
 میں سنبھال لوں گا۔“

رات کو فیضان کھانے کی میز پر حاضر نہیں
 تھا۔ کھانے کے بعد رخسانہ بیٹے کے کمرے کی طرف
 بڑھ گئی۔ جوخی ماں بیٹے کی تکرار شروع ہوئی محمود دعا کو
 ساتھ لے کر کار میں آ بیٹھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رخسانہ
 اور فیضان کے جھگڑے کو دیکھ کر دعا پریشان ہو جائے۔
 وہ ایک حساس بچی تھی اس کی پریشانی محمود کو کسی بھی
 طرح گوارا نہیں تھی۔ وہ اسے گھر سے سیدھا آکس کریم
 شاپ پر لے گیا وہاں سے لمبی ڈرائیو پر نکل گیا۔ دعا
 اپنی کلاس فیلڈ کی حیرانی کے بارے بتا رہی تھی کہ اس
 کے بھیا کی نئی کار دیکھ کر کائنات اور سدا وغیرہ کتنی
 شرمندہ ہوئی تھیں۔ محمود اس کی معصومانہ بات سن کر
 خوش ہوتا رہا۔ گھٹنا ڈیزہ بعد وہ گھر میں داخل ہوئے تو
 خاموش چھائی ہوئی۔

رات گئے فیضان نے کمرے میں آ کر خوش خبری
 سنائی کہ رخسانہ چچی طوعن و کرہن مان گئی تھی لیکن اس
 نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر شکلیہ نے ڈراسی بھی
 آئیں بائیں کی تو وہ اس رشتے پر تھوک کر داہیں آ

کی تائید کی تھی۔

”ہاں تمھیں تو اپنے غریب بھائیوں کا غم کھائے
 جا رہا ہے۔“ رخسانہ جلتے کٹے لہجے میں بولی۔
 ”نیک بخت!..... میرے کون سے کارخانے چل
 رہے ہیں۔“

”فیضان کے لیے میری نظر میں ایک رشتا موجود
 ہے۔“ رخسانہ حتیٰ لہجے میں بولی۔ ”یوں بھی شکلیہ بیگم
 مشکل ہی سے فیضان کے لیے ہاں کرے گی۔ وہ تو
 اپنے بھانجے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ اور مجھ
 سے اس کے ترے نہیں ہونے والے۔“
 محمود جھٹ بولا۔ ”خالہ کو منانا میری ذمہ داری
 ہے۔“

”تم کیوں اس شادی پر اتنا زور دے رہے ہو؟“
 رخسانہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
 محمود نے کہا۔ ”فیضان میرا چھوٹا بھائی ہے اور
 اس کی طرف داری کرنا میرا فرض بنتا ہے۔“
 رخسانہ چچی نے منہ بنا تے ہوئے کہا۔ ”یہ فرض
 اور واجبات میرے لیے چھوڑ دو، میں جانوں اور
 فیضان۔“

”ٹھیک ہے چچی جان، جو آپ کی مرضی آئے
 کریں لیکن میرے لیے بریرہ کے رشتے کی بات نہ
 چلانا۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔“
 ”تو تمھارے رشتے کی بات کہاں چلاؤ؟“
 رخسانہ نے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔
 ”فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ جب
 تک اپنے لیے ذاتی گھر نہیں بنا لیتا میں شادی نہیں
 کروں گا۔“ وہ چچی کی خواب گاہ سے نکل آیا۔

چچی کے ساتھ بات چیت اس نے سہ پہر کو دفتر
 سے لوٹنے کے بعد کی تھی۔ فیضان اور افتان گھر سے
 باہر تھے۔ شام کو گھر داخل ہوتے ہی فیضان اس کے

کہا۔ ”تو پھر تم اپنے بھیا کی بہو کیسے بنو گی گڑیا۔“ باقی تمام بھی اس انکشاف پر ہنسنے لگے تھے۔ بریرہ کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ یوں بھی اسے فیضان پہلے سے محمود کی آمد کا مقصد بتا چکا تھا۔

تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد محمود نے شکیلہ کو کہا۔ ”خالہ جان، ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کہو نا بیٹا!“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ بچہ پارٹی یہاں سے غائب ہو جائے۔“ زیادہ تر لڑکے، لڑکیاں تو یوں بھی وہاں سے دائیں بائیں ہو گئے تھے۔ جو دو تین وہاں بیٹھے تھے وہ بھی محمود کی بات سن کر اٹھ گئے۔

”خالہ جان!..... میں بریرہ اور فیضان کے رشتے کی بات کرنے آیا ہوں۔“ محمود بغیر تمہید باندھے مطلب کی بات پر آ گیا۔

”کک..... کیا بات کر رہے ہو بیٹا!“ شکیلہ نے ہلکا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بے نیازی چھائی تھی۔

”جانتا ہوں خالہ جان، آپ کی خواہش کیا ہے، یقین جلدیہ بریرہ کو میں نے ہمیشہ چھوٹی بہن ہی سمجھا ہے۔ سب سے بڑھ کر فیضان اسے بہت پسند کرتا ہے۔ رضوان چچا کی بھی یہی خواہش تھی کہ میری اور بریرہ کی شادی ہو جائے، یہ بات جو بھی فیضان کو پتا چلی اس نے بھوک ہڑتال کر دی ہے۔ ہمارا آپس کا تعلق ہمیشہ سنگے بھائیوں جیسا رہا ہے۔ اب میں چھوٹے بھائی کا دل نہیں توڑ سکتا۔“

”اور خالہ کا دل توڑ دو گے۔“ شکیلہ نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا کسی کی خوشیوں کا قاتل بن کر مجھے سکون مل جائے گا خالہ جان۔“

جائے گی۔

”بھیا!..... اب سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ شکیلہ چچی آپ کی بات نہیں ٹائٹیں۔“ فیضان نے لجاجت سے کہا۔

محمود نے اسے تسلی دی۔ ”فکر نہ کرو، میں کل دفتر سے واپس آتے ہی خالہ کی طرف چکر لگا آؤں گا۔“

”آئی لو یو بھیا!“ فیضان اس کے گال پر بوسا دیا۔

”اب تو محبت آئے گی بھائی پر۔“ محمود نے اس کا کان کھینچا۔ فیضان تہمتہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆☆

”ارے آج میرا بیٹا کہاں آ نکلا۔“ شکیلہ خالہ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئی تھیں۔“

”آپ کی یاد آئی اور میں آ گیا۔“ وہ خالہ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

”اللہ کرے میری یاد تمہیں روزانہ آیا کرے۔“ شکیلہ خالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ زنگس چچی بھی اس کی بات پر ہنس دی تھیں۔

”میری بہو آئی ہے۔“ زنگس چچی نے حسبِ عادت محمود کے ساتھ بیٹھی دعا کو چھیڑا۔

”میں بھیا کی بہو بنوں گی۔“ دعا نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ وہاں موجود تمام لوگ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

”پہلے بھیا کی شادی تو کرادو۔“ شکیلہ خالہ نے دعا کو اٹھا کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔

”بھیا شادی نہیں کریں گے۔“ دعا نے معصومیت بھرے لہجے میں انکشاف کیا۔ ”بھیا نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ بریرہ آپنی سے شادی نہیں کریں گے۔“

شکیلہ نے اسے چھاتی کے ساتھ بھینپتے ہوئے

”جی بھائی جان!“ بریرہ کا مختصر جواب آیا۔ اور وہ مسترا کر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دعا سیٹ سے ٹیک اگائے اٹکھ رہی تھی۔ محمود نے کار روک کر اسے عقیقی نشست پر لٹایا اور اپنی چادر اوڑھا کر آگے بڑھ گیا۔ فیضان بڑی شدت سے اس کا منظر تھا۔ یوں تو اسے بریرہ کی زبانی پتا چل گیا تھا اس کے باوجود وہ سب کچھ محمود سے سننا چاہتا تھا۔ رخسانہ چچی اور رضوان کو بھی محمود کے گاؤں جانے کی غایت معلوم تھی۔ کار کا ہارن سن کر گھر کا دروازہ فیضان بنی نے کھولا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ چھوٹے بھائی کو خوش دیکھ کر محمود کو سکون کا احساس ہوا تھا۔ یقیناً اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دے کر جو سکون ملتا ہے اس کا مقابلہ کوئی اور ٹیک نہیں کر سکتی۔

جَنِّ مَنِّ مَنِّ

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی فیضان کو دو تین ماہ کے اندر غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ جاب کے حصول کے ساتھ ہی اس نے ماں باپ پر شادی کے لیے زور دیا اور بریرہ اس کی دلہن بن کر گھر میں آ گئی۔ لیکن وہ زیادہ دن گھر میں نہیں رہی کہ فیضان اسے بھی اپنے ساتھ دئی لے گیا تھا۔ رخسانہ چچی کو اس کا یوں ملک سے باہر منتقل ہونا نہایت کھرا مگر وہ فیضان کو منع بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔ فیضان کی شادی سے بعد رضوان چچی نے محمود کو بھی شادی کے لیے زور دیا مگر وہ خوب صورتی سے ٹال گیا۔ اسی دوران اس کی پھوپھو کی بیٹی عمارہ، کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی میں داخل ہوئی۔ چونکہ روزانہ آنا جانا ممکن نہیں تھا اس لیے شہر میں اس کی رہائش کے لیے ہوٹل میں داخل کرانے کا فیصلہ ہوا۔ رضوان چچا کو معلوم ہوا تو اس نے ہوٹل میں داخلے کی سختی سے ممانعت کرتے ہوئے کہا۔

”کسی ایک کے چاہنے سے تو فیصلے نہیں ہوتے نا بیٹا!“ خالہ خود کو قائل نہیں کر پا رہی تھی۔

”خالہ جان، آپ جانتی ہیں کہ بریرہ مجھ سے سنی بے تکلف ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی مرضی جانے بغیر میں آپ سے بات کروں۔“

”محمود ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بریرہ اور فیضان ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ نرگس چچی نے سر ہلاتے ہوئے محمود کی تائید کی۔

”کیا گھر میں بڑے تم ہی تھے جو رشتہ مانگنے بھاگے چلے آئے۔“ شکیلہ خالہ نے نرگس کی بات پر ہتھیار پھینک دیے تھے۔

”میں رشتہ مانگنے نہیں، اپنی پیاری خالہ کو راضی کرنے آیا تھا۔“ خالہ کی بات سن کر محمود نے سکون بھرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اسی لیے تمھاری لاڈلو رانی نے پہلے سے انکشاف کر دیا تھا کہ اس کا بھیا جان، بریرہ سے شادی نہیں کرے گا۔“ شکیلہ خالہ کے چہرے پر پھپکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اس معصوم کو شادیوں کا کیا پتا خالہ جان!“ محمود نے ساتھ بیٹھی دعا کو اپنے ساتھ لپیٹ لیا تھا۔

”شہر کی آذان سب کی ہو چکی ہے نماز قضا ہو جائے گی۔“ سمان چچا نے انھیں یاد دہانی کرائی اور وہ اٹھ گئے۔

رات کا کھانا کھا کر محمود نے واپسی کی راہ لی تھی۔ گاؤں سے نکلتے ہی اسے بریرہ کا مہیج ملا۔

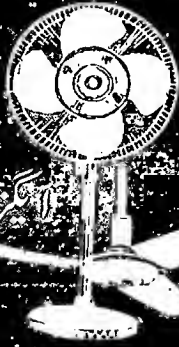
”بہت بہت شکریہ، مجھے اپنے پیارے بھائی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔“

دونوں کہنیاں اسٹیئرنگ ویبل پر ٹیک کر جواب لکھنے لگا۔ ”ہاں بہنا، ایک اور بندہ بھی میرا بہت زیادہ شکر گزار ہوگا۔“

RTM 234574

یولو سین

سیلنگ فین
پیدسٹل فین
ایگزاسٹ فین



ایسے، جیسے

سیلنگ فین
پیدسٹل فین
ایگزاسٹ فین

ایسے الیکٹرک اندسری

محلہ نور پور شرعی کھراں

053-3521165 3601318

”جب اپنا گھر موجود ہے تو ہوٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔“

یوں عمارہ ان کے گھر منتقل ہو گئی۔ فیضان کا کمرہ خالی تھا وہ اسی میں رہنے لگی۔ اسے یونیورسٹی چھوڑنے کی ذمہ داری بھی محمود کے سر آئی تھی۔ یونیورسٹی ان کے گھر سے اتنی دور نہیں تھی اس لیے وہ آسانی سے عمارہ کو یونیورسٹی میں اتار کر وہاں سے دعا کے اسکول جاسکتا تھا۔ دعا اب چھٹی کلاس میں تھی۔ پہلے ہی دن عمارہ تیار ہو کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دعا اب تک تیار ہو کر کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ محمود اسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کار کے نزدیک پہنچتے ہی دعا نے عمارہ کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھ دیکھ کر تیوری چڑھائی تھی۔

”عمارہ آپ!..... آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔“ الفاظ کے ساتھ اس کا لہجہ بالکل میل نہیں کھا رہا تھا۔ عمارہ کو سخت توہین کا احساس ہوا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے محمود کی طرف دیکھا۔

”گڑباز، بری بات بڑوں سے یوں بات نہیں کرتے۔“

اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایسا کیا کہہ دیا بھیا، آپ! کو پیچھے بیٹھنے ہی کا کہا ہے۔“

”جانے دو عمارہ!..... آپ ہی پیچھے بیٹھ جاؤ، یہ جبری اپنی منوا کر ہی رہے گی۔“ محمود کے لہجے میں بے بسی تھی۔ عمارہ قہر آلود نگاہیں دعا پر ڈال کر باہر نکلی اس کا دل تو نہیں کر رہا تھا کار میں بیٹھنے لیکن ایک چھوٹی سی کمرے کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی اسے نہیں بچتا تھا۔ وہ عجبیشت پر بیٹھ گئی۔ دعا اطمینان سے آگے بیٹھ کر ملی نغمہ گنگنائے گئی۔

”چھو چھو جان کو کیسے منا لیا۔ ہمارے خاندان کے لڑکے بھی پڑھنے سے زیادہ کھیتی باڑی میں دلچسپی لیتے ہیں اور آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود یونیورسٹی میں

داغے کی اجازت مل گئی۔“ کار آگے بڑھاتے ہی وہ ایک مزمرین عمارہ ٹھیک لائن بھٹکا پھرے کا جائزہ لیتا ہوا پوچھنے لگا۔ دعا کی بدھیزی کا ذکر اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا کہ ایک تو اس سے دعا نے ناراض ہو جانا تھا اور دوسرا یہ کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس بات کو خاطر میں لاتا۔ یہ تو دعا کی پختہ عادت تھی۔ فرنٹ سیٹ پر محمود کے ساتھ بیٹھے کا حق صرف اسے حاصل تھا۔ کار کوئی دوسرا ڈرائیو کر رہا ہوتا اور محمود بھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوتا تو وہ اس کی گود میں بیٹھ جاتی۔ البتہ اس کے عقبی نشست پر بیٹھے ہونے کی صورت میں وہ فرنٹ سیٹ کی جان چھوڑ دیتی تھی۔ گویا اس کا مسئلہ فرنٹ سیٹ نہیں محمود کا ساتھ تھا۔

”اجازت ملی نہیں میں نے زبردستی لی ہے۔“ اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے عمارہ نے بھی بیک مرر ہی کا سہارا لیا تھا۔

”چھو پھو جان اور طفیل تو آپ کی قابلیت کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔“

”دہ ہنسی۔“ اس میں شک ہی کیا ہے۔
”یہ تو پہلے سمیستر کے اختتام پر ہی پتا چل جائے گا۔“

”بالکل۔“ اعتماد سے کہہ کر وہ پوچھنے لگی۔ ”آپ کے مضامین بھی یہی تھے نا؟“

”مجھے آپ کے مضامین کا کیا.....“

”بھیا!..... آپ اس دن بتا رہے تھے کہ گینٹر بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دنیا کے سب سے اونچے گدھے کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ ہے۔“ دعا نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

”ہاں، مگر یہ کون سا موقع ہے گڑیا اور پھر کتنی بار منع کیا ہے کہ درمیان میں نہیں بولتے۔“

”آئندہ خیال رکھوں گی۔ لیکن آپ نے یہ نہیں

بتایا کہ دنیا کی سب سے اونچی گدھی کا قد کتنا ہے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا، اس کے لہجے سے بالکل بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس نصیحت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ محمود کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی تھی۔ ”ابلی باتیں نہ کیا کرو سمجھیں یہ نہ ہو کوئی گدھے کی پی کے قد کے بارے پوچھنا شروع کر دے۔“ محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں پوچھا ہے۔ چند دن پہلے ہی محمود نے اسے کہا تھا کہ جو شخص اپنی تعریف کرتا ہے اس سے بڑا گدھا کوئی نہیں ہوتا۔ اور دوسرا وہ اپنی موجودگی میں یہ بالکل برداشت نہیں کرتی تھی کہ محمود کسی اور کے ساتھ گپ شپ کرے۔

”بھیا!..... آپ بھی نا۔“ اس نے لاڈ بھرے انداز میں محمود کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

عمارہ کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ گدھی کی بابت پوچھتے ہوئے دعا کا اشارہ اس کی طرف تھا۔ لیکن اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا کہ وہ بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔ اور پھر یونیورسٹی آنے تک دعا نے محمود کی جان ہی نہیں چھوڑی تھی کہ وہ محمود سے کوئی بات کر سکتی۔

”واپسی پر آپ کا انتظار کروں یا بس کو ہاتھ کھڑا کرنا پڑے گا۔“ یونیورسٹی گیٹ کے سامنے اتر کر عمارہ مستفسر ہوئی۔

”دو بجے دعا کو لینے آتا ہوں اڑھائی تین بجے تک پہنچ سکتا ہوں تمھارے پاس۔“

”تو ڈیڑھ بجے آ جانا مجھے اٹھا کر دعا کے سکول چلے جائیں گے۔“ اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

”کوشش کروں گا۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

”بھیا، اگر آپ نے آئندہ مجھے عمارہ آپنی کے سامنے ڈانٹا تو کبکی کئی کروں گی۔“

”مگر میں نے تمھیں کب ڈانٹا ہے۔“ اس نے

”مطلب؟“

”مطلب واضح ہے بھیا!..... اگزوہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو مجھے وہی کچھ کہنا پڑے گا جو صبح کہا تھا۔ اور چونکہ آپ کو منع کر چکی ہوں کہ مجھے کسی کے سامنے نہ ڈانٹا کریں تو یقیناً آپ نے مجھے کمرے میں جا کر ڈانٹنا ہے۔ اس لیے.....“ اس نے شرارتی انداز میں کندھے اچکائے اور اسکول کے گیٹ کی طرف چل دی۔ محمود کے چہرے پر کھپائی ہیسی نمودار ہوئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

واپسی پر غمارہ کو یونیورسٹی سے اٹھاتے ہوئے وہ دعا کی بابت بتا رہا تھا۔

”دیکھو عمارہ!..... دعا گھر بھر کی لاڈلی ہے۔ خاص کر میرے لیے تو اس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں ہے۔ اور میرے قریب وہ مشکل ہی سے کسی کو برداشت کرتی ہے۔ وہ میرے لیے جھوٹی بہن سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں صبح اس نے کافی بدتمیزی کی تھی۔ اب بھی یہی درخواست کروں گا کہ جب اسکول پہنچیں تو آپ نے عقبی نشست پر منتقل ہو جانا ہے۔“

”آپ میری تو چن کر رہے ہیں۔“ عمارہ کو محمود کی باتیں کافی بری لگی تھیں۔

”بالکل بھی نہیں۔“ محمود نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ معصوم بچی ہے جبکہ آپ سمجھ دار خاتون ہیں۔“

عمارہ نے منہ بنایا۔ ”اب خاتون جیسے ثقیل لفظ سے تو مخاطب نہ کریں، لڑکی ہی کہہ دیں۔“

محمود ہنسا۔ ”مطلب ایک ہی بنتا ہے۔“

عمارہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”وہی ایک جوان لڑکی اور لڑکا، لڑکے کی بہن کو موضوع گفتگو بنانے کے

علاوہ بھی کئی باتیں کر سکتے ہیں۔“

جیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”دو دفعہ ڈانٹا ہے سمجھے آپ۔“ وہ غصے میں تھی۔ ”گھر سے نکلے وقت کہا کہ، بڑوں سے یوں بات نہیں کرتے اور رستے میں کہا، بات کے درمیان میں نہیں بولتے۔“

”تو کیا غلط کہا ہے۔“

اس نے منہ بنایا۔ ”نہیں، آپ کی ہر بات ٹھیک ہوتی ہے لیکن کسی کے سامنے ڈانٹ کھانا مجھے بالکل پسند نہیں۔“

محمود جیرانی بھرے انداز میں اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ وہ یہ مشکل گپ رہ بارہ سال کی بچی اور اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے، لیکن تم بھی خیال کیا کرو۔ آج عمارہ کے ساتھ تم کتنی بدتمیزی سے پیش آئیں۔ جانے کیا سوچ رہی ہو گی۔“

اسکول کے سامنے اترتے ہوئے اس نے تہقیر رگاتے ہوئے کہا۔ ”بھیا!..... اگر کسی کو مجھ سے مسئلہ ہے، نا تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔“

محمود بھی بے ساختہ مسکرا پڑا تھا۔ یہ بات اسے خود محمود نے بھی کہی تھی۔ جب ایک دن وہ اپنی کسی کلاس فیلو کا بتا رہی تھی کہ وہ دعا سے حسد کرتی ہے۔ تبھی محمود نے اسے یہی نصیحت کی تھی۔ اور آج حرف بہ حرف وہی بات دہرا کر اس نے محمود کو ایک بار پھر یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ باتوں کو بھولتی نہیں تھی۔

”نور ہاں بھیا!..... کوشش کرنا کہ دفتر سے سیدھا میرے سکول آ جانا، اگر آپ کی پہلے اٹھنا ضروری سمجھیں تو اسے، بیٹھنے کی جگہ کے بارے واضح طور پر بتا دینا۔ یہ نہ ہو گھر واپسی پر مجھے آپ کی کڑوی کیلی باتیں سننا پڑیں۔“

محمود نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔ ”کیا

”مثلاً“

عمارہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”مثلاً یہ کہ ایک دوسرے کی پسند کے بارے پوچھ سکتے ہیں، مستقل کے ایرادوں کے بارے بات ہو سکتی ہے اور شادی کے بارے رائے کی جا سکتی ہے۔“

اس کے معنی خیز لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے محمود نے جواب دیا۔ ”پسند تو کوئی خاص ہے نہیں، شادی کا فی الحال ارادہ نہیں اور مستقبل کس نے دیکھا ہے۔“

”سنا ہے بریرہ کا رشتا پہلے آپ سے ہو رہا تھا، بغداد میں فیضان اور بریرہ کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔“

”صحیح سنا ہے۔“ محمود نے اثبات میں سر ہلایا۔
”آپ بریرہ کو پسند کرتے تھے۔“ عمارہ نے کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

”رضوان پچا نے عندیہ دیا اور میں نے ان کی مرضی پر سر جھکا دیا۔ بعد میں فیضان نے اپنے اور بریرہ کے تعلق کے بارے سب کچھ بتا دیا پس میں نے ان کے درمیان سے ہٹا ہی بہتر سمجھا۔“

عمارہ نے ذومعنی لہجے میں پوچھا۔ ”کسی اور لڑکی کے بارے پوچھا جاتا تو آپ کا جواب کیا ہوتا؟“

”کس کے بارے میں؟“ سرخ جی پر رکتے ہوئے محمود اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”کوئی بھی لڑکی، فرض کرو میرے بارے میں۔“ عمارہ نے اپنے لفظوں میں اظہار کر دیا تھا۔
”گھبرا سکتے ہیں جو کے محمود نے مریم جی کو گھوڑا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”تب جی میں وہی کہتا جو اس وقت کہا تھا۔“

”گو یا میں آپ کو قبول ہوئی۔“ عمارہ کی آواز جذبات سے جھجھک ہو گئی تھی۔

سبز جلی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ عمارہ میں خاموشی چھا گئی تھی۔ دو تین منٹ عمارہ نے انتظار کی سولی پر لٹکے گزارے تھے۔ وہ محمود کی جانب دیکھنے لگے یہ بجائے گود میں رکھے ہاتھوں کی طرف متوجہ تھی۔

”ہاں۔“ طویل ہوئی خاموشی کو محمود کی کھینچ آواز نے خوشی کے نغمے کا روپ دیا۔

”شکریہ محمود!۔۔۔ آپ نے مجھے اتنا مانا دیا۔“ عمارہ کی آواز میں خوشی بالکل دے لے رہی تھی۔

”عمارہ!۔۔۔ میں نے زندگی میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ دعا ہے، کسی کو توجہ دی ہے تو وہ دعا ہے، کسی کا خیال رکھا ہے تو وہ دعا ہے، کسی کے لیے راتیں جاگا ہوں تو وہ دعا ہے، کسی کی بہتری کے لیے سوچا ہے تو وہ دعا ہے۔ میں نے اسے ماں کی ممتا سے بھی نوازا ہے، باپ کی شفقت بھی دیا ہے، اور بھائی کا مان اور عزت بھی دی ہے۔ اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی ہے۔ جو اس نے مانگا ہے وہ بھی دیا اور جو نہیں مانگا وہ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ تو تجھ سے رشتا باندھنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ آپ کو دعا کا وجود برداشت کرنا ہوگا۔ بعض اوقات وہ ہٹ دھرمی اور ضد پراثر آتی ہے، ایسے موقع پر آپ نے حوصلے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔ وہ میرے لیے بہن بھی ہے، بھئی بھی ہے اور میری سب سے اچھی دوست بھی ہے۔ اس لیے یہ نہ ہو کہ آپ اس کی عادتوں یا باتوں کو لے کر اپنا خون بھی جاتی رہیں اور اس کے خلاف اس میں کوئی التماسیدھا سوچتی رہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہم اس رستے پر قدم نہیں بڑھاتے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس کی شادی کے بعد میرا اور اس کا تعلق اسی طرح رہے گا۔ میں اس کی ہر بات کو اسی طرح اپنی پہلی ترجیح پر ہی دیکھوں گا۔ اگر آپ کو یہ سب قبول ہے تو مجھے آپ سے بچھا رشتا ملے گا بھی نہیں۔ آپ خوب صورت ہیں، پر مہی

بیوی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر تنہائی کے ساتھی کی خلوتیں صرف میرے لیے مخصوص ہیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، کہ اس کی بہن کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے یا اس کی ماں کو اس کی زندگی میں کیا مقام حاصل ہے۔“

”مجھے آپ سے بھی امید تھی۔“ دعا کے اسکول کے سامنے کار روکتے ہوئے اس نے عمارہ کے ہاتھ کو پکڑ کر دبا دیا تھا۔ وہ ٹھیک چھٹی کے وقت پہنچے تھے۔ بچیاں کبھی سیلاب کی طرح اسکول کے گیٹ سے نکل کر پارکنگ میں کھڑی کاروں، رکشوں، سوزکیوں اور موٹر سائیکلوں پر بٹھ رہی تھیں۔ کچھ پیدل ہی روانہ تھیں۔ جلد ہی دعا بھی اسکول کے دروازے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ عمارہ بغیر کچھ کے عقبی جانب منتقل ہو گئی تھی۔

دعا آتے ہی۔ ”السلام علیکم!“ کہہ کر بیٹھ گئی۔ ”آج تو گڑیا کچھ زیادہ ہی تھکی تھکی لگ رہی ہے۔“ محمود نے کار آگے بڑھاتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔ ”بھیا! امتحان قریب ہیں اور ساری استانیاں بقیہ اسباق ختم کرانے کے چکروں میں ہیں۔“

”تو ارادہ کیا ہے، پہلی پوزیشن برقرار رکھنی ہے یا کسی اور کو آگے آنے کا موقع دو گی؟“

”اتنی آسانی سے تو آگے آنے کا موقع نہیں دیا کرتی، البتہ قسمت کسی کا ساتھ دے جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا؟“ عمارہ کے دماغ میں عجیب و غریب سوچ لہرائی۔ محمود کی وضاحت اور اس کے اپنے اعتراف کے باوجود نہ جانے کیوں دعا اسے ایک رقیب کی طرح لگ رہی تھی۔ ایک چھوٹی سے بچی کو اپنا رقیب سمجھنا اس کی بیا سوچ ہی کا شاخسانہ تھا۔

کی ہیں اور سب سے بڑھ کر میری پیاری چھو پھوکی ہیں۔“

”نظر پر آپ کافی اچھی کر لیتے ہیں۔“ عمارہ کے رونق پانچوہ صورت مسکراتے گئے تھے۔

”کونسی نو زندگی کا ساتھی بنانے سے پہلے اپنی فکر و فہم اور خامیوں سے آگاہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر دعا میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اگر تمہیں پچھڑھو ان کے بھرپور تک کا ہوا ہوں تو اس کی کھچھچھ دعا کا وجود ہے۔“

”میں اخیان ہے دعا بی بی کا تذکرہ کافی سے ناپودہ ہو گیا ہے اب اپنے بارے بھی کچھ بتا دیجئے۔“ عمارہ نے۔ باہر مزاحیہ انداز اختیار کیا تھا لیکن اس کے لہجے میں بلکے سے حسد کی بو آ رہی تھی۔

”ایک ہی گھر میں تو رہ رہے ہیں میرے بارے صدی کی سب کچھ جان لو گی۔ کون سا ہماری آج ہی لادنی ہو رہی ہے۔“

”مگر باقی سب کچھ جان لوں گی تو دعا کے بارے بھی تو میں نے جان لیتا تھا۔“ عمارہ کو دعا والی باتیں سنم نہیں ہوئی تھیں۔ محمود اب تک اس کا بنا نہیں تھا اور دعا اسے ناپسندیدہ ہستی لگنے لگی تھی۔ شادی کے بعد تو شاید وہ دعا کو ایک لمحہ بھی برداشت نہ کر پاتی۔

”ہاں اس کے بارے اس لیے بتانا ضروری سمجھا کہ بعد میں جنت قائم رہے۔ یہ نہ ہو شادی کے بعد تب دعا کی طرف میرا التفات دیکھ کر مجھ سے جھگڑنے کی کوشش کریں تو میں نے پہلے سے متنبہ کرنا ضروری سمجھا۔“

”محمود! ایک لڑکی کو شوہر کی توجہ کسی دوسری لڑکی کی طرف منتقل ہوتے دیکھ کر تب غصہ آتا ہے جب شوہر کی سوچ میں آلودگی ہوتی ہے۔ اگر کسی کا شوہر اپنی بہن کا خیال رکھتا ہے یا اسے اہمیت دیتا ہے تو اس کا

مردہ

سائنسوں کا ترک جانا ہی موت نہیں ہے، وہ انسان بھی مرا ہوا ہی ہے جس نے غلط کو غلط کہنے کی ہمت کھودی۔

تھی۔

محمود نے ایک اچھے سے ہوٹل کی پارکنگ میں کار موڑی کہ دعا کی ہر خواہش کو پورا کرنا وہ ضروری خیال کیا کرتا تھا۔ پارکنگ میں کار روک کر وہ اسے سمجھانے لگا۔

”یہ جو تم تھکی تھکی اور منہمکل لگ رہی ہو نا، اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ آئندہ لُچ بکس گھر ہی میں کھول کر دیکھ لیا کرو تا کہ میں رستے میں کوئی اچھی چیز پیک کر داکر تمہارے حوالے کر دیا کروں۔“

”دعا بی بی کا کھانا نہ کھانا گویا بہت بڑا مسئلہ ہے جو موصوف کو اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔“ عمار نے جمل کر سوچا۔ مگر یہ بات وہ ہونٹوں پر نہیں لاسکتی تھی۔ ابھی تک وہ محمود کے لیے اتنی ضروری نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت دیتا۔ سب سے پہلے اسے محمود کے دل میں جگہ بنانا تھی اس کے بعد ہی دعا کا سہ باب کر سکتی تھی۔

انھیں فیملی کیمین میں لے جا کر بٹھاتے ہوئے محمود نے عمارہ کی پسند پوچھی۔

عمارہ نے جواب دیا۔ ”آلو مٹر قیمہ بہتر رہے گا۔“

”گڑیا تو بریانی ہی کھائے گی نا؟“ محمود نے دعا سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”اچھا دوپہر کا کھانا تو وقت پر کھالیا تھا نا؟“

”بھیا! آلوہہ... میں...“ دعا نے جکلاتے

ہوئے اپنی بائیں اڈھوڑی چھوڑ دی۔

”باب کیا وہ؟“ محمود نے اس کی طرف نگلی بھری نظروں سے گھورا۔

”بھیا!... لُچ بکس کھولا تو آلو مٹر بنے تھے اور

آپ جانتے ہیں مجھے یہ سالن ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“

”تو کینٹین سے کچھ کھا لیتیں۔“

”میں نے سوچا آج بھیا سے خرچا کرواؤں گی۔“

دعا نے پینتزر بدلا۔ ”یوں بھی آج عمارہ آپ کا پہلا دن

تھا تو ان کی دعوت کرنا تو بنتا ہے نا۔“

محمود کو اس کی چالاکی پر نڈی آگئی تھی۔ اپنے فعل کی کوئی نہ کوئی توجیہ اس کے پاس ضرور موجود ہوتی تھی۔

”تمہیں اتنی جلدی مناسب بہانہ کیسے سوچھ جاتا ہے۔“ محمود نے اس کی طرف جھٹ کر سرگوشی کی۔

”با... با... با۔“ دعا نے قبضہ لگایا۔ محمود کو محسوس

ہوا دعا کے خوب صورت قبضے نے کار کی فضا میں نغے

بکھیر دیے ہوں۔ جبکہ اس کا ہنسنا عمارہ کی سماعتوں پر

سخت گراں گزرا تھا۔ اپنی اپنی سوچ اور ترجیحات ہوتی

ہیں۔ ایک ہی شخصیت کسی کے لیے دنیا کی سب سے

عزیز اور پیاری ہستی ہوتی ہے جبکہ دوسرے کے لیے

مقبوض ترین اور قابل نفرت شخصیت۔

”عمارہ آپ کی آپ بتائیں کیا میں نے غلط کہا

ہے؟“ دعا پیچھے مڑ کر اس کی جانب منوجہ ہوئی۔

”کیا کہہ سکتی ہوں۔“ عمارہ نے روکھے سے لہجے

میں کہا۔ چاہنے کے باوجود وہ دعا کو ایسی اہمیت نہیں

دے پا رہی تھی جس کا محمود نے تقاضا کیا تھا۔

”گویا آپ کو محمود بھائی کی جیب ہلکی کروانا گوارا

نہیں ہے۔“ دعا نے اس کی بیزاری کو اہمیت نہیں دی

عمارہ کو لگا وہ اتنا آسان ہدف بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے کوشش جاری رکھی۔ ”آپی بھی کہتی ہو اور میرے سمجھانے کا برا بھی مانتی ہو۔“

”آپی تو میں ہر بڑی لڑکی کو کہتی ہوں تو کیا مجھ سے جتنی بھی بڑی لڑکیاں ہیں تمام کو سر پرست مان کر ان کے احکامات کی بجا آوری شروع کر دوں۔“

عمارہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ چھوٹی سی لڑکی اتنی حاضر جواب ہوگی۔ مگر اب خاموش ہونا بار ماننے کے مترادف تھا اور وہ دعا سے ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

”مگر میں تو تمھاری سگی پھوپھو کی بیٹی ہوں تمھاری حقیقی آپی اور پھر میں تمھارے بھیا کی بیوی بھی تو بننے والی ہوں۔“

دعا نے اسے کڑے تیروں سے گھورا عمارہ کو لگا وہ اسے خاموش کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بچے تلے الفاظ میں بولی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بھیا کی بیوی کون بنے گی اس کا فیصلہ میں کروں گی، اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک ہے تو ابھی بھیا سے تصدیق کروا سکتی ہوں۔ اور جہاں تک تعلق ہے آپ کے آپی ہونے کا تو اسی وجہ سے تو اتنی دیر سے آپ کی جلی کٹی سن رہی ہوں اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ کھری کھری سناتی کہ کسی اپنے کو بھی نصیحت کرنا بھول جاتی۔“

”چنانچہ اس کے علاوہ تم کیا کھری کھری سناؤ گی۔“ جملے کئے انداز میں کہہ کر وہ بٹول کے داخل دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں سے محمود پیک کرائے ہوئے کھانے کا شاہر پکڑے آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے اندر بیٹھ گیا اس وقت دعا سے کچھ پوچھنا جنگ چھیڑنے کے

محمود نے پیرے کو بلا کر کہا۔ ”دو پلیٹ آلو میٹر قیمہ اور ایک بریانی لے آؤ۔“

”وہ جی سر!۔“ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اچانک دعا اٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے نہیں کھانا کھانا۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑی تھی۔

”گھر یا، کیا ہوا۔“ محمود نے پریشان ہو کر اسے آواز دی۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے کیمین سے باہر نکل گئی تھی۔

محمود نے سواہ نظرؤں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ وہ منہ بناتے ہوئے کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ محمود پھیکے انداز میں ہنسا۔

”چلو کھانا پیک کروا رہے ہیں، گھر جا کر کھالیں گے۔“

”مگر۔“ عمارہ نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلانے چاہے لیکن محمود کا ڈنٹر کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس نے لب سختی سے پہنچ لیے تھے۔ اس کے دماغ میں محمود کی گفتگو گونجنے لگی۔ یقیناً محمود عقل مند تھا جو اس نے عمارہ سے تعلق کی ابتدا کرنے سے پہلے ہی اس کے امکانی غصے کا سد باب کر دیا تھا۔ وہ شوذر بیگ کندھے سے لٹکا کر پارکنگ کی طرف چل پڑی۔ دعا کار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔

”یہ کیا حرکت ہے دعا!۔۔۔ جانتی ہو کتنی بد تہذیبی اور گنوار بننے کی علامت ہے۔“ محمود کی آمد سے پہلے اس نے دعا کو ہلکی سی سرزنش کرنا ضروری سمجھا تھا۔

عمارہ آپی!۔۔۔ یقیناً آپ مجھے تہذیب سکھانے نہیں بلکہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے آئی ہیں تو کیوں نہ آپ اپنے مقصد ہی پر توجہ دیں اور میرا اخلاق سدھارنے کا کام محمود بھیار پھوڑ دیں۔“

اس کے چچے تلے جواب سے عمارہ سلگ کر رہ گئی تھی۔ عمر ہونے کے باوجود وہ بات کرنا جانتی تھی۔

”پھر وہ ساری رات بھوکے رہے گی اور صبح ناشتا بھی نہیں کمرے گی۔ اسکول جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

عمارہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا: ”میرا خیال ہے اگر ایک دو رات بھوکا رہنے دیا جائے تو اس کا دماغ درست ہو سکتا ہے۔“

”وہ تو شاید ایک رات کی بھوک برداشت کر لے، اگر اس نے نہ کھایا تو مجھے ضرور کچھ ہو جائے گا۔“ محمود نے افسوس بھرنے انداز میں سر ہلایا۔ ”اللہ کی بندی مجھے اب تک اس کے دوپہر کو کھانا نہ کھانے کی تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور آپ اس کے رات بھر بھوکا رہنے کی تیاری کیے بیٹھی ہیں۔“

”اس طرح تو وہ نہیں سدھرے گی۔“
 ”ذہ بگڑی کب ہے کہ سدھرے گی؟“ اس مرتبہ محمود کے لہجے میں طنز شامل تھا۔
 ”تو بگڑنا کسے کہتے ہیں۔“

”محترمہ، یہ اپنے بھیا سے لاڈ اٹھواتا ہے۔ وہ میرے بارے حساس ہے اور وہ اگر کھانا چھوڑ کر آئی ہے تو اسی لیے کہ اسے یقین تھا کہ بریانی اس کے پیچھے پیچھے پہنچے گی۔ اور بتاؤ کیا وہ آپ سے باتیں کر نہیں رہی تھی۔“

”ہاں کر رہی تھی۔“ عمارہ نے اعتراف میں سر ہلایا۔

”اور جب میں نے دو تین بار مخاطب کیا تو کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ کس لیے؟ کیونکہ ناراضی صرف میرے ساتھ تھی۔“

”ٹھیک ہے جی!“ عمارہ کار سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”آپ جانیں اور آپ کی لاڈلی، مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھو۔“

(جاری ہے)

اعتراف تھا۔
 ”دعا نے بھی محمود کے چہرے پر حقیقی ذکیہ لی تھی، مگر وہ ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خفا ہو یا صرف اس کا حق بننا تھا اور آج تک وہ اس حق کا بے دریغ استعمال کرتی آرہی تھی۔“

رستے بھر وہ خاموش رہے تھے۔ محمود نے ایک دو بار دعا کو مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر وہ جواب دیے بغیر خاموش بیٹھی رہی۔ مجبوراً محمود کو بھی چپ سادھنا پڑی۔

کار گیراج میں کھڑی کر رہے ہی دعا ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اترتی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

محمود عمارہ کو مخاطب ہوا ”آپ جا کر تازہ دم ہوں میں شاہینہ ماسی کو کہہ دیتا ہوں وہ کھانا گرم کر دے گی۔“
 ”مجھے فی الحال دعا کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا۔“ غلطی بھی اس کی ہے اور آپ اسے مناتے بھی نہیں گئے۔“

”وہ غلطی کون سی، چھوٹی سی بچی ہی تو ہے۔“
 ”ویسے اس کی ناراضی کی وجہ کیا ہے؟“ عمارہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی، ورنہ اس کے نزدیک دعا کی شخصیت اتنی اہم نہیں تھی کہ پیٹھ پیچھے اسے یاد کیا جاتا۔

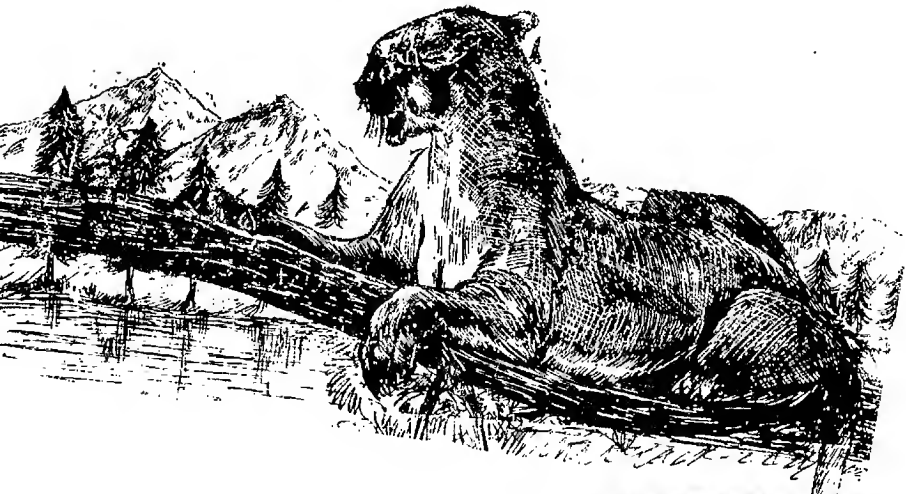
”وجہ۔۔۔“ محمود بے اعتبار ہنس پڑا۔ ”وجہ یہ ہے کہ آلو منتر اسے پسند نہیں ہیں اور آج دوپہر کا کھانا بھی اس نے اسی وجہ سے نہیں کھایا تھا۔ آپ کے آلو منتر قیمہ منگو کے کی وجہ سے میں نے بھی غلطی سے اسی سالن کا بتا دیا۔ اور اس کے تئیں اسے نظر انداز کیا گیا۔ بس خفا۔۔۔ میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔“

”مگر آپ اسے نہ منائیں پھر؟“ عمارہ نے

پوچھا۔

پیلی بھیبت کا آدم گردن جوڑا

شیر پہلے اپنے شکار سے کھیلتا ہے پھر ایک دم جھپٹ کر گرفت میں لے کر گردن توڑ ڈالتا ہے۔ مٹی ہوئی گردن سے بہتا خون چاٹتا ہے۔ اس دم اس کا عتاب دیکھنے لائق ہوتا ہے۔



☆ شیخ الطالیب حسین ڈیرہ دہلی

دیہی آبادیاں بھی ہیں۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے اور تہذیب کی روشنی دور دور دیہاتوں تک پھیل چکی ہے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس زمانے میں ان دیہی آبادیوں کے لوگ انتہائی سادہ لوح ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ عام شہری چیزوں تک سے ناواقف

ہیں ایک ضلع پیلی بھیبت ہے۔ اس کے جنگل بہت مشہور ہیں۔ باس اور رید کے بن انشز سے ہیں۔ عمارتی اور جلانے کی مکڑی بڑے شہروں کو یہیں سے سپلائی کی جاتی تھی۔ سینکڑوں میل پھیلے ان جنگلوں کے کچھ فاصلے پر چھوٹی چھوٹی

دوسرے روز بذریعہ ٹرین ایک اور سٹیشن بلایا کے لئے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر شکار کے دیگر انتظامات مکمل کر سکیں۔ اتفاق دیکھئے کہ ہمارے دوست بھلن اسی گاڑی میں بریلی سے آ رہے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی، مگر وہ مل گئے تو بہت خوش ہوئے۔ مزاج پرسی کی اور حال احوال دریافت کیا۔ ہمارا ارادہ جان کر بولے۔

”ارے میاں! بلایا میں تو آج کل ایک آدم خورشیر اور شیرنی نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ کٹان کرنے والے تک کام چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ جانے کتنے آدمی اب تک شیراٹھا کر لے جا چکا ہے۔ میزری مانو تو تم بلایا نہ جاؤ، میرے ساتھ چلو، میں تمہارا شیر کے شکار کا شوق پورا کروادوں گا۔“

آدم خورشیر کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ بھلن تو خائف نظر آتے تھے، مگر میرا اشتیاق یہ سن کر کچھ اور ہی بڑھ گیا۔ بھلن نے یہ دیکھا تو پھر بولے۔

”اب تک کئی شکاری بھی کوشش کر کے ہار چکے ہیں بلکہ درندے کی وحشانہ سرگرمیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔“

وہ مجھے سمجھاتے رہے مگر شکاری زندگی میں آدم خور سے جو واسطہ پڑ رہا تھا۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا اور پھر ان دنوں خطروں سے کھیلنا ہی اصل زندگی تھی۔ لہذا میں نے سوچا یا تو آدم خور نہیں یا پھر میں نہیں۔

بلیا کا سٹیشن آیا اور بھلن کو حیران پریشان چھوڑ پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم اتر پڑے۔ یہ سٹیشن جنگل کے بیچ میں تھا اور صرف ایک ڈاک بنگلہ اور اس میں صرف ایک ہی چوکیدار رہتا تھا۔ جگہ دیکھی، گھومے پھرے اور چوکیدار سے کہا کہ ڈاک بنگلے کی صفائی کرو اور ہم کل

تھے اور غربت کا یہ عالم کہ کبھی کبھار ہی انہیں کھانے کے لئے گوشت خعیب ہوتا تھا، وہ بھی اس صورت میں کہ اگر کوئی شکاری ادھر آ نکلا تو اس کے مارے ہوئے۔ جانور سے بچھ ان کو بھی مل جاتا تھا۔ باقی ضرورت کا سامان یہ لوگ ان خوانچہ فروشوں سے لیتے تھے جو ان جنگلوں میں چلنے والی ریلوں میں بیچتے تھے۔ حتیٰ کہ پینے کا پانی بھی ان کو ریل کا انجن ہی سپلائی کرتا تھا۔ یہ ریل گاڑیاں جنگل سے لکڑی لے جانے اور جنگل میں کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے چلتی تھیں۔ ان کے جنگلی سٹیشن بھی بس چھوٹے چھوٹے تھے، دو کمرے بیچے اور دو اوپر، دن میں نیچے کام کیا اور رات کو اوپر والے کمرے بند کر کے پڑ رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان جنگلوں میں خوں خوار جانور بہت تھے اور سانپوں کی تو اس قدر بہتات تھی کہ ہزاروں طرح کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سانپ یہاں مل جاتے تھے۔ ان کے ڈر سے لوگ چار پائیاں بھی بہت اونچی اونچی استعمال کرتے تھے۔

بلیا بھیبت کے جنگلوں میں ایک جنگلی شکاری پورے شکار کے لئے بہت مشہور ہے۔ ان دنوں اس جنگل کی تنہائی کا ٹھیکہ میرے ایک دوست بھلن ٹھیکیدار کے پاس تھا۔ انہوں نے میرے شوق کے پیش نظر کئی بار مجھے وہاں شکار کھینے کی دعوت دی۔ مگر کسی نہ کسی مسدودیت کی بنا پر میں وہاں نہ جا سکا۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں دہرہ دون انڈین مشنری اکیڈمی کے ایک کرل، کرل مینی جو میرے ساتھ ایک دوسرے شکار میں شریک رہے تھے، اپنی چشماں بلی بھیبت میں گزارنے کا پروگرام بنا بیٹھے مجھے بھی مدعو کیا اور میں اپنے ایک اور دوست پوری کے ہمراہ ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ غرض یوں ہم بلی بھیبت کے لئے روانہ ہوئے۔ ات کو بلی بھیبت ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا اور

وقت ہوگا جب ہم بلایا پہنچے۔ کھانے سے فراغت پائی اور پھر چوکیدار سے ٹھیکیدار کا پتہ پوچھا۔ وہ بولا۔
”یہاں سے نو میل دور ایک جنگل ہے۔ آج کل وہاں کٹان ہو رہا ہے۔ ٹھیکے دار وہیں رہتے ہیں۔ میں کل اُن کو بلالوں گا۔“

چوکیدار کورات کے وقت ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ہمیں اُسے اچھے سگریٹوں کا پیکیٹ بھی بطور نذرانہ دینا پڑا، کیونکہ اُس کا کہنا تھا۔
”میں نے تو اپنی پیڑی سگریٹ کا انتظام بھی نہیں کیا اور اب رات پڑنے والی ہے۔“

رات کو واقعی کوئی انسان گھر سے باہر قدم نکالنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ٹیشن کا عملہ بھی اوپر والے کمرے بند کر کے پڑ رہتا تھا۔

سورج طلوع ہوا، ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے بیٹھے ہی تھے کہ چوکیدار ایک چپ سے کوکو کر نکلا۔ وہ وعدے کے مطابق ٹھیکیدار کو لے آیا تھا۔ قسمت ساتھ تھی، یہ حضرت بھلن کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور ہم سے بھی صاحب سلامت تھی۔ کرل سے ان کا تعارف کرایا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس جنگل کا ٹھیکہ اُن کے پاس ہے اور شکار کے لئے یہ جگہ بہت مناسب اور دلچسپ ہے۔ شکار کثرت سے ملتا ہے۔ کٹان کرنے والوں کی آواز اور ان کی ہر وقت کی بول چال سے جانور انسانی آواز سے قدرے مانوس ہو کر کچھ ڈر بھی ہو گئے ہیں۔ اس لئے آسانی سے مارا کھاتے ہیں مگر پھر انہوں نے بھی وہ کہانی سنائی جو ہم پہلے بھی سن چکے تھے۔ کہنے لگے۔

”میں نے کام شروع کیا تو میرے پاس کوئی پچاس آدمی کام پر لگے ہوئے تھے۔ آئے دن شکاری آتے جاتے رہتے تھے مگر ایک بات عجیب ہوئی۔ کوئی ایک ماہ کا عرصہ گزرا کہ ایک سکھ شکاری پارٹی آئی۔ یہ

پھر آ میں گئے اور یہاں ٹھہریں گے۔ وہ گھبرا گیا۔
”جناب! آپ یہاں کچھ دن ٹھہریں گے؟“
”ہاں، کیوں..... تم بھی یہاں رہتے ہو؟“
”ناتجربہ، میں تو صرف دن دن رہوں ہوں۔
شام کو اپنے گھر۔“
”مگر کیوں بھی؟“

”جناب! میں تو اس علاقے میں بہت عرصے سے ہوں۔ پہلے تو کوئی ڈر نہ تھا، مگر اب تو آپ دیکھیں اندھیرا پڑنے پر کوئی بھلا ماس آپ کو گھر سے باہر نظر نہیں آئے گا۔ بات یہ ہے کہ کچھ دن سے یہاں پر ایک آدم خور شیر آ گیا ہے۔ کئی لوگوں کو چٹ کر چکا ہے۔ رات کے اندھیرے میں جو بھی گھر سے باہر گیا اسے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ کوئی دس بارہ آدمی غائب ہو گئے ہیں۔ کٹان کرنے والوں نے پہلے تو تلاش کیا، مگر اُن کا نشان تک نہ ملا۔ جانے زمین کھا گئی یا آسمان اُگل گیا۔ پھر تو کٹان کرنے والے بھی ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے۔ ٹھیکیدار کا کام بھی ٹھپ ہو گیا۔ وہ بھی سخت پریشان ہے۔“

صاف ظاہر تھا کہ پورے علاقے میں کسی آدم خور نے تباہی مچا رکھی ہے اور پھر یہ کہ وہ خاصا چالاک بھی ہے مگر لاشوں کے نہ ملنے کی وجہ سے سادہ لوح دیہاتیوں کے دلوں میں طرح طرح کے دوسے جنم لیتے تھے۔

”لوگوں کا خیال ہے جی کہ آدم خور شیر ہے پر اللہ جی جانے کیا ہوا ہے۔“ چوکیدار نے بھی اپنے خدشات کا اظہار کیا اور اندھیرا پڑنے ہی باہر نکلنے سے صاف انکار کر دیا، خیر! ہم یہ کہانیاں سن کر اور اسے بنگلے کی صفائی کرنے کی تاکید کر کے واپس پہلی بھیت آئے اور دوسرے روز کوئی نئے بھر کی ضروریات کی تمام چیزیں لے کر پھر بلایا پہنچے۔ دوپہر کے گیارہ بارہ کا

اور ان کا صحیح ٹھکانا ابھی تک کسی کو نہیں مل سکا تھا۔ خود ٹھیکیدار ہر قسم کی اعانت کے لئے تیار تھا۔ اس نے ہمیں اپنی جیب اور ڈرائیور دیا۔ ڈرائیور اس لئے کہ وہ ان جنگلوں اور آس پاس کے تمام علاقوں سے بخوبی واقف تھا۔ ٹینشن ماسٹر بھٹناگر نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ ان کا ٹینشن بھی وہی دو منزلہ چھوٹا سا تھا اور نکل دو آدمیوں کا شاف۔ انہیں شکار سے بس اسی حد تک دلچسپی تھی کہ ایک ذیل ہیرل ہندوق تھی جس سے چھوٹا موٹا جانور مار کر اس کا گوشت کھالیا کرتے تھے۔ اُن سے بھی آدم خور جوڑے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ آدم خور جوڑا نہایت عیار ہے اور کہیں ایک جگہ قیام نہیں کرتا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ کئی مرتبہ تو خود ان کے کوارٹر کے پاس بالکل یوں دبے پاؤں آئے جیسے کوئی چور آتا ہے اور خطرے کے بوسگھ کر بوٹنی تیزی سے سانپ کی طرح فرار ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی ٹینشن کوارٹر کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہم لوگ چونکہ ریست ہاؤس میں ٹھہرے ہیں، اس لئے وہ انسانی بو پا کر وہاں بھی ضرور آئیں گے۔

اب مشکل یہ آن پڑی کہ آدم خور جوڑے کا کوئی واضح ٹھکانہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہم اور کرنل اس سوچ میں تھے کہ کس جگہ اور کیا صورت اُن کے مارنے کی بہتر ہو گی۔ بھٹناگر کے خیال میں اس کام کے لئے کسی ماہر کھوجی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ وہاں اوّل تو آدمی کم اور جو تھے وہ بھی حد درجہ خائف۔ کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اچانک مجھے سنت رام کا خیال آیا، سنت رام ماہر تھا اور شکاری اس مہم میں ہمارے لئے بہت معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے فوراً اسے سفر خرچ اور تار روانہ کیا اور آنے کی تاکید کی۔ اس طرف سے اطمینان کر کے ہم نے طے کیا کہ رات کو ریست

ہو جائے۔ یوں کہ اور دن رات شیر کی تلاش میں سرگرداں۔ شیر تو انہیں کیا مالتا ایک روز کہیں سے شیر کا ایک بچہ مار لیا۔ یہ عام سانحے کے لئے برابر ہوگا۔ تھے بہت جتن کیونکہ اپنے میلان میں سردار جی نے شیر کا شکار تو کیا ہوا ہے دس بچہ ہی تھی۔ سردار جی تو شیر کا بچہ مار کر بیٹے بنے، مگر اسی روز سے اس جنگل میں قیامت آ گئی۔ رات رات بھر شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر یوں ہونے لگا کہ رات کو اگر کوئی گھر سے نکلا تو واپس نہ آ سکا۔ آہستہ آہستہ ایسے واقعات روزانہ ہونے لگے۔ جان سب لو پیاری ہوتی ہے۔ تیزی ساری لیبر بھاگ گئی اور مجھے مجبوراً کام بند کرنا پڑا۔

اب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ آدم خور ساری کارروائی انتظام کر رہا ہے۔ شکاری اور شکار کے ہر اصول کے خلاف بچہ مار کر انہیں شکاری پارٹی نے ایک بے ضرر جانور کو خونخواری پر آمادہ کیا تھا اور اب ہر انسان اس کے انتقام کا نشانہ بن رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ٹھیکیدار نے یہ بھی بتایا کہ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ نر اور مادہ ہیں یعنی ایک نہیں دو یا یوں کہنے کہ ایک جوڑا تھا۔ جنگلی خونخوار شیروں کا جو بچہ مارے جانے کے غم میں پکھل ہو کر اب زندہ انسانوں کا شکار کھیل رہا تھا۔

مجھے اور کرنل کو اب مہم کے خطرناک ہونے اور حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے ارادوں میں چٹکنی آ گئی۔ ان حالات میں آدم خوروں کا شکار اب شوق ہی نہیں ضرورت بھی بن گیا تھا، کیونکہ اس طرح تو غنہ مشہ تھا کہ یہ جوڑا روز بروز بڑھتا ہو کر اپنی کارروائیاں تیز کرتا جائے گا۔ ٹینشن ماسٹر بھٹناگر بھی بڑی دوز و سوچ میں لگے تھے۔ اپنی شکاری پارٹیاں آ کر تا کام واپس جا چکی تھیں کیونکہ یہ جوڑا نہایت ہوشیاری سے اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا تھا۔

دین کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ سے اخلاص کا تعلق اور بندوں سے فلاح کا تعلق۔

جانوروں کے ہمراہ جلد ہی واپس آ گیا۔ ٹھیکیدار غم بھی چلا آیا۔ خیر، سنت رام نے دو نالی بندوق اور چار کار تو س مانگے، میں نے اُسے بندوق اور کار تو س کی پیشی دے دی۔ دو روز تک سنت رام بندوق لئے آؤ دو آدمیوں کی ہمراہ میں جنگل جنگل ٹھوس رہا۔ صبح جاتا رات گئے واپس آتا اور پھر صبح دم تک نہیں جاتا۔ آس پاس کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک شکاری یاہٹی خوروں کے شکار کے لئے ریست ہاؤس، میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اکثر اوقات ہماری خیر خیریت پوچھنے اور کام کرنے کو آنے لگے اور علاقے میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

میں رات شیٹن پر گزارتا اور کرٹل ریست ہاؤس میں... واپس آ کر ابھی ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کھانڈے گنڈاسے لئے پانچ چھ دیہاتی چلے آئے۔ ان میں سے ایک دیہاتی کا لڑکا شام نے وقت جانوروں کو پانی پلا کر واپس لا رہا تھا کہ اجانک ایک جھاڑی سے تیر نکلا۔ جانوروں میں کھلنے لگی۔ چاروں نے بھاگ کھڑے ہوئے مگر گائے کا ایک ٹھنڈا جنگل سے اندر ہی طرف بھاگ نکلا۔ لڑکا فوراً ایک قرمبی اونٹ پر درخت پر چڑھ گیا۔ شیر ٹھنڈے کے پیچھے بھاگ لڑکے کو موٹا ملا اور وہ بیڑ سے کود کر ہانپتا ہانپتا گر بیٹھ گیا۔ رات کو ٹھنڈا واپس نہ آیا۔ سوچا کہ وہ شیر نے تجھے چڑھا گیا ہوگا۔ صبح وہ جنگل میں ایک جگہ خون میں است پت پڑا ہوا شیر نے اسے بس برائے نام ہی کھایا تھا۔

ہاؤس میں کرٹل رہیں گے اور میں بھٹانگر کے پاس شیٹن پر رات گزاروں گا۔ مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے شیر رات کو ادھر ادھر آئے۔ میں ضروری سامان لے کر سر شام ہی بھٹانگر کے پاس چلا گیا اور لائن مین کی ڈیوٹی رات کو جاننے کی لگا دی۔ رات سکون سے گزری صبح مجھے بڑی مایوسی ہوئی مگر دوسرے روز آدھی رات کو میں نے اپنے کاندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ لائن مین مجھے اٹھا رہا تھا۔ میں نے فوراً راتفل سنجھالی اور چوکنا ہو گیا۔ رات کی خاموشی میں شیر کی دھاڑ پیک بارگی گونگنی۔ میں نے سب طرف نظر دوڑائی مگر نظر کچھ بھی نہ آیا۔ البتہ آوازیں وقفے وقفے کے بعد آتی رہیں۔ ابھی نزدیک سے، ابھی دور سے... اب جو غور کیا تو ایک آواز بہت تیز اور گرج دھڑکی، دوسری تھوڑے کمزور اور دھیمی۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ شیر اور شیرنی نہیں آس پاس ہیں۔ سرچ لائٹ ڈال کر دیکھا، مگر نظر کچھ نہ آیا۔ البتہ آوازیں آتی بند ہو گئیں۔ میں پھر بھی ہوشیار بیٹھا رہا۔ رات کے پچھلے چار ایک وہ بار دور سے دھاڑ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

صبح کرٹل سے معلوم ہوا کہ وہ بھی رات بھر آوازوں پر جانٹ جاگ کر شیروں کو دیکھنے کی کوشش میں لگے رہے مگر نظر نہ پڑ سکی تین اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ جوڑا الٹی جنگل میں ہے۔ اب ہمیں اپنی کامیابی کا مدعا نظر آنے لگا۔

دوسری رات پھر بغیر کسی قبلی ذکر حادثے کے گزر گئی۔ تیسرے روز سنت رام بیٹھ گیا، وہ چورے حالات میں مریا۔

”ارے جی! ایک جوڑا کیا، چار ہی ہوں، بس ایک ہفتہ لگے گا۔“ اس نے کہا کہ اُسے دو ایسے آدمی چاہئیں جو اس علاقے کو ابھی طرح جانتے ہوں۔ ہم نے ٹھیکیدار کے پاس فوراً رقم بھیجا اور ڈرائیو دو کر لیں۔

کہ یہ وقت شکار کا شوق پورا کرنے کا نہ تھا۔ ہمیں تو اپنے خاص شکار کا انتظار تھا اور فائر کر کے ہم اُسے خبردار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی اور ہم انتظار کی کوفت میں گرفتار..... کوئی دو گھنٹے بعد ایک نیل گائے بڑے خوبصورت سیٹلوں والی مست خرابی سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ چیتل کی آواز پر ہم دونوں چونک پڑے۔ یہ چیتل بھاگتی جاتی تھی اور ٹوکنتی جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شیر اس کے تعاقب میں ہے۔ کچھ دیر بعد کچھ ایسا شور ہوا جیسے بہت سے جانور بیک وقت کسی خطرے کی بو پا کر بھاگ پڑتے ہیں۔ ہم چونکے ہوئے، روشنی ڈالی تو کچھ نظر آیا، پھر آہٹ ہوئی۔ پچھڑے کی لاش پر روشنی ڈالی تو بڑی ہاپوسی ہوئی کیونکہ دو تین گیدڑ اس کی لاش کو نوح نوح کر کھا رہے تھے۔ کرگل نے میری طرف دیکھا اور گردن ہلا دی۔ مطلب یہ ہوا کہ اب انتظار بے کار ہے۔ شیر اب اس لاش پر نہیں آئے گا۔ باقی رات ہم نے سگریٹ پی پی کر صبح کے انتظار میں کاٹ دی۔ دوسرے دن ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ شیر کے پچھڑے پر نہ آنے کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اُسے کہیں اور کوئی شکار مل گیا ہوگا اور اس نے تازہ شکار کے گوشت سے پیٹ بھر لیا۔

دوسرے روز کھوجی پھر جنگل کا جائزہ لینے نکل گئے۔ ایک جگہ گھنے درختوں کی طرف انہیں کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جانور اٹھ کر بھاگا ہو۔ اس جگہ جنگل نہایت گھنا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا پھر قریب ہی سے شیر کے غرانے کی آواز بھی سنائی دی۔ ایسی غرابت کی آواز شیر عموماً غصے کے عالم میں نکالتا ہے۔ کھنبیوں نے اُس وقت ہمت سے کام لیا اور لائیں زین پر مار مار کر اور چیخ چیخ کر خوب شور مچایا۔ آواز آئی بند ہو گئی۔ اب جو بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس جگہ شیر نے ایک دھوڑ

ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارا کھوجی تو خود جنگل کے اندر گیا ہوا ہے۔ وہ شخص جس کا پچھڑا تھا اُسے ہم نے وہیں روک لیا اور سنت رام کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ ہمارے فیصلے کا انحصار سنت رام کی رائے ہی پر تھا۔ سنت رام واپس آیا تو ہم نے اُسے دیہاتی سے ملایا اور واقعہ بتایا۔ اُس نے کہا۔ مجھے وہ جگہ دکھا لاؤ یہ سننا تھا کہ دیہاتی بدحواس ہو گیا۔ رات پڑنے والی تھی اور وہ کسی حال میں باہر نکلنے کو راضی نہ تھا اور ساتھ ہی یہ اصرار بھی کہ گھر واپس جاؤں گا، ورنہ گھر میں ماتم پڑ جائے گا۔ ہستی والے سمجھیں گے کہ اُسے بھی آدم خور چٹ کر گیا۔ مجبوراً اسے جیب میں ہستی تک پہنچایا۔ صبح وہ خود ہی چلا آیا اور سنت رام کو لے کر وہ جگہ دکھا لایا۔ سنت رام نے خیال ظاہر کیا کہ لاش تین دن کی باسی ہو چکی ہے اور شیر باسی شکار پر اب شاید ہی آئے مگر میرے اور کرگل کے نزدیک اب اور وقت ضائع کرنا حماقت تھی۔ ہم نے کہا کہ تم فوراً جگہ دیکھ کر چان بنادو، ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ ممکن ہے لاش پر شیر آ ہی جائے۔ ہم دونوں ضروری سامان لے کر وہاں پہنچ گئے۔

چان سے پچھڑے کی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ اب ہم دونوں اس طرح چان پر بیٹھے کہ ایک طرف سے کرگل اور دوسری طرف سے میں سب طرف بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ کچھ وقت انتہائی خاموشی سے گزر گیا، پھر کوئی چاپ سنائی دی۔ ہم نے غور کیا تو یہ ایک پینتھر کیٹ (Panther Cat) تھا۔ یہ بڑا خوبصورت بالکل چیتے کی شکل کا ایک بلا ہوتا ہے اور جانوروں اور پرندوں کے بچوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ خرگوش اُس کی من پسند غذا ہے۔ فادرست کی طرف سے اس کے شکار پر انعام ملتا تھا۔ اب یہی بلا ہمارے سامنے بڑی بے قدری سے چہل قدمی کر رہا تھا اور ہم رانگلیں سنبھالے بیٹھے۔ یہی سے دیکھ رہے تھے۔ صرف اس وجہ سے

کی بوجھوں کر لیتا ہے۔ روشنی ہوتے ہی شیر بھاگ کھڑے ہوئے اور ہمیں بہت مایوسی ہوئی۔ ہاتھ آیا شکار نکل گیا، مگر اتناطمینان ضرور ہو گیا کہ اب شاید خوفزدہ ہو کر انسان کا پیچھا نہ کرے اور اگر اسے کوئی اور شکار نہ ملا تو پچھڑ پر ضرور واپس آئے گا۔

صبح ہوتے ہی ہم چان سے اتر کر ریٹ ہاؤس میں آ گئے۔ سارا دن یہی موضوع زیر بحث رہا۔ آج ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک کی بجائے دو چان لگوائے جائیں اور چان کی اونچی اٹھارہ فٹ سے کم نہ ہو اور ہر رات پچھڑے کو جگہ بدل کر باندھا جائے۔ سنت رام نے پچاس پچاس قدم کے فاصلے پر دو چان بندھوا دیئے۔ رات جس چان پر بیٹھے وہاں سے کتنے ہی جانور نکلے، مگر ہم دل پر جبر کر کے رہ گئے اور رات گزر گئی۔ صبح بے شمار لوگ جمع ہو گئے کہ شاید شیر مارا گیا ہو، مگر ابھی اس کی موت نہیں آئی تھی۔

اگلی رات دوسرے چان پر بیٹھنے کی باری تھی۔ جنگل کا یہ ٹکڑا بہت خوبصورت اور مناسب تھا۔ اونچی اونچی گھنی گھاس تھی۔ جب ہم چان پر بیٹھے تو شکاری کی چھٹی جس نے بتایا کہ آج ضرور شیر سے ٹکراؤ ہو گا۔ کوئی گھبراہٹ کا عمل ہو گا، ہم اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ایک دم پچھڑ اڑ کر آیا، پھر عجیب سی آواز نکلی اور خاموشی چھا گئی۔ لائٹ ڈال، دیکھا کہ شیر پچھڑے کی گردن توڑ چکا تھا اور وہ بڑا اڑپ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دونوں شیر کھڑے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک ساتھ دو فائر کئے۔ میرا نشانے والا شیر تو اپنی جگہ سے ایک فٹ بھی نہ بل سکا۔ مگر میں نے جس یہ فائر کیا تھا وہ فائر کھا کر غائب ہو گیا۔ کرٹل پریشان تھا لیکن میں اطمینان سے اسے سمجھاتا رہا کہ شیر گرم گھاس میں نکل گیا ہے، مگر یہ دم زور نہ جانتے تھے کہ بات یوں تھی کہ میری گرفتاری کے بعد

ساتھ سے تین اونچ کا کارتوس گولی والا، غضب فی ما ہے۔ شیر تو شیر اس سے تو ہاتھی بھی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ کرٹل صاحب کی رائفل تھری ناٹ تھری..... خیر، خدا خدا کر کے دن نکلا..... ہمارے ساتھی سنت رام وغیرہ نمودار ہوئے اور مردہ پچھڑے کے پاس شیر پڑا دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ انہیں گھاس گھنٹل شیر کا قصہ سنایا۔ سنت رام نے مردہ شیر کو گاڑی پر لا دیا اور ہمیں انتظار کرنے کی ہدایت دے کر جنگل کا رخ کیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد یہ لوگ واپس آئے اور بتایا کہ شیر بڑی طرف رشی ہوا ہے۔ جدھر جدھر سے گزرا ہے خون ہی خون ہے۔ زخم تازہ تھا، وہ نکل تو گیا ہے مگر یقین ہے کہ بس جگہ بیٹھے گا، پھر وہاں سے اٹھ نہ سکے گا۔ اس وقت اسے تلاش کر کے اس کا سامنا کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ کل تک اس کی موت یقینی ہے، کل ہم لوگ بے خطر ہو کر جائیں گے اور اس کی لاش لے آئیں گے۔ ہم سب واپس ریٹ ہاؤس چلے آئے مگر کرٹل صاحب سخت مضطرب تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ساری محنت اکارت نہ جائے۔

دوسرے روز صبح ہی سنت رام اپنے ساتھیوں سمیت جنگل کو چل دیا۔ دن گزرتا جا رہا تھا اور کرٹل کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ شام ہونے کوئی کہ ایک آدھ دوڑا دوڑا آیا اور اس نے بتایا کہ شیر رشی ہونے والی شیرنی تھی اور مردہ حالت میں مل گئی ہے۔ آپ گاڑی نے چلیں۔ ہم خوش خوش پہنچے اور مردہ شیرنی کو لا کر لے آئے۔ وہ عام شیردں سے بڑی اور بہت تندرست تھی۔ جوڑا ہی بہت بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ جو دکھتا دنگ رہ جاتا..... دیہاتیوں کا تو گویا میلہ سا لگ گیا۔ ٹیکسٹر صاحب کو خبر پہنچی تو وہ بھی اپنے ساتھیوں اور مزدور دل کو لئے چلے آئے اور اچھا خاصا جشن منایا گیا۔



سے نکل آتے۔ یہ سڑک پر اور میں ساتھ ساتھ جھینوں میں چلتا جاتا اور جونہی کوئی استاد آتا نظر آتا میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ ان سے تقطیع کر کے مطمئن ہو کر چلا جاتا کیونکہ یہ لائق بیچے تھے اسی لئے جب مسلسل بریک کے بعد غائب پائے گئے تو انچارج نے تحقیق کی۔ میری غیر حاضری پر تو انچارج خوش ہوتے تھے کہ کم از کم بریک کے بعد تو شرارتی سے جان چھوٹی لیکن ایک لائق بیچے کی غیر حاضری کو قبول نہیں کیا گیا۔ حاسدین نے ہماری غیر موجودگی میں نمک مرچ لگا کر ہمارے فرار کی داستان انچارج کو سنا لی تو انہوں نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے کلاس فیلڈ کو منع کر دیا گیا کہ ہمیں کچھ نہ بتایا جائے کہ ہمارے فرار کا راز کھل چکا ہے۔ دوسرے دن ٹیچر نے بھی ہمیں پلاننگ کے مطابق کچھ نہ کہا اور جب بریک میں ہم حسب معمول فرار ہوئے تو آدھے راستے کے بعد انچارج صاحب سائیکل پر آتے دکھائی دیئے۔ میں نے حسب سابق پیشاب کا اور انہوں نے بھلکوا ٹیچر صاحب سے چھٹی کہہ کر دیا گیا جس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ رہی۔ ہمیں سکول واپس لے جا کر مرغانا کر ٹھنڈوں اور لاتوں سے پٹا گیا جس سے حاسدوں کے دل میں کافی ٹھنڈک پڑی اور میں اس دن کو کونے لگا کر جب میں نے ان کو اپنے ساتھ بھگانے کی ہائی بھری تھی۔ ان کی وجہ سے میرا فرار کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا اور مجھے پورا وقت بڑھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

میں اکثر بڑی مہارت سے کلاس فیلڈز کے پیچھے چوری کر لیتا تھا پھر وہ کسی ویران جگہ پر ڈال کر ان کو ساتھ لے جاتا اور ان کے سامنے وہ مجھے زمین پر پڑے ”ل“ جاتے۔ یہ بڑے سادہ مصالح تھے، میری سازش کو سمجھ نہ پاتے اور گھر والے جب پوچھتے کہ اتنے پیسے

شروع سے ہی پڑھائی سے میری جان جاتی تھی اور سکول میں ذرا دل نہ لگتا تھا اس لئے بمشکل بریک تک سکول میں ٹپک پاتا اور پھر کسی نہ کسی بہانے سے فرار ہو کر گھر آ جاتا۔ کبھی بیماری کا بہانہ تو کبھی کام کا حتیٰ کہ میں نے اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کی کئی کئی بار شادیوں کرائیں، خاندان کے تمام بزرگوں کو باری باری کئی بار مارا، والدہ کو کئی بار بیمار کیا جن کی دوائی لینے کے لئے چھٹی لے لیتا۔ حتیٰ کہ سارے بہانے ختم ہو گئے تو میں نے بستہ نہایت مختصر کر دیا جو صرف ایک رف کا پی پر مشتمل ہوتا تھا اور وہ بھی پتلی سی، کتابیں میں ان کی استعمال کر لیتا کیونکہ ہم اس کتبے ہی بیٹھتے تھے۔ اب بریک ہوتی تو میں اپنا مختصر سا بستہ ٹیپس کے نیچے نیفے کے اندر ڈال کر ٹھٹھا ٹھٹھا گھر پہنچ جاتا۔

رستے میں اگر کوئی استاد بازار سے ہو کر آ رہا ہوتا تو میں پیشاب کے بہانے کھیتوں میں گھس جاتا۔ اگر کبھی اتنا موقع نہ ہوتا اور استاد سر پر پہنچ جاتا تو کسی اور استاد کے کام سے جانے کا بہانہ کر دیتا اگر کبھی بستہ ہاتھ میں ہوتا تو سکول میں دو ایسے استاد موجود تھے جن کی یادداشت بزرگی کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی لہذا ان میں سے کسی کا باری باری نام لے دیتا کہ ان سے چھٹی لی ہے اور دوسرے دن ان سے دستخط کرا کے اپنے استادوں کو دکھا دیتا۔ مذکورہ استاد ایک بار احتیاطاً پوچھتے کہ چھٹی لی بھی تھی کہ نہیں، فراڈ تو نہیں لگا رہے۔ تو میں بڑے اعتماد سے بتاتا جب آپ ہینڈل کے نیچے بیٹھے تھے تو میں نے چھٹی لی تھی۔ اب یہ الگ بات کہ وہ ہمیشہ ہینڈل کے نیچے ہی بیٹھتے تھے۔

میری ان کامیاب وارداتوں سے یہ بھی لچھائے اور مجھ سے درخواست کی کہ آئندہ ان کو بھی شریک سفر کر لوں۔ میں نے ہائی بھری اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ اپنا مختصر سا بستہ ان کے بھاری بیگ میں ڈال کر ہم سکول

غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں ان جیسے پڑھا کو لڑکوں کی بات کر رہا ہوں درنہ مجھ جیسوں نے تو شکر کا کلمہ پڑھا کہ جان چھوٹی۔ خیر کلاس کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں انہوں نے تجویز دی کہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ آفیسرز سے مل کر تبادلہ کروایا جائے۔ اس پر عمل درآمد کا فیصلہ ہوا اور بغیر کسی ٹیچر یا گھر والوں کو بتائے پندرہ بیس لائق لڑکے سکول سے نکل کر بس پر ضلعی تعلیمی دفتر روانہ ہو گئے جس کی قیادت یہی کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ نکلا اور راستے سے گھر چلا گیا۔

کلاس کے جو چند نالائق لڑکے سکول میں رہ گئے تھے انہوں نے ہیڈ ماسٹر کو ہماری کارروائی سے آگاہ کیا۔ بی ٹی نے ان کے پیچھے بہت موٹر سائیکل دوڑایا مگر بس نکل چکی تھی۔ پوچھتے پچھاتے یہ ضلعی تعلیمی دفتر پہنچ گئے۔ وہاں ایک اچھی ہینڈ رائٹنگ والے لڑکے کو انہوں نے درخواست مانا کروائی اور پانچ سات لڑکوں کو ساتھ لے کر

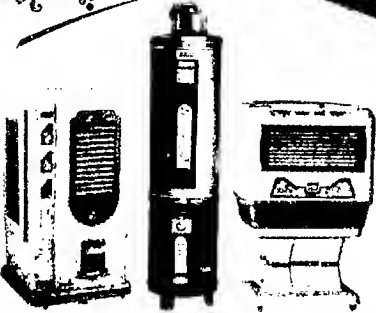
کہاں سے آئے تو میں ان کی گواہی ڈلوادیتا کہ مجھے لڑن جگہ سے ملے ہیں۔ یہ چونکہ شریف بچے تھے اس لئے ان کی گواہی قبول کر لی جاتی اور مجھ سے باز پرس نہ کی جاتی۔ یوں میں اسٹر ان کی مدد سے کالے دھن کو سفید کر لیتا۔ مجھے یہ سازش اس لئے کرنا پڑتی کہ یہ دیانت دار قسم کی چیز تھے اگر ان کو شریک جرم کر کے حصہ دار بنانے کی کوشش کرتا تو مجھے پکڑا دیتے۔

نویں جماعت میں ہمارے انچارج نہایت لائق فائق ٹیچر تھے۔ وہ دور دراز سے آتے تھے اس لئے ہفتہ بھر ہاسٹل میں رہتے اور پڑھائی کے شوقین بچوں کو سکول کے بعد بھی پڑھاتے رہتے، ان کو پڑھانے کا بے حد شوق تھا۔ ٹیچر کی کمی کے باعث وہ ہمیں پانچ مضامین خود ہی پڑھاتے تھے۔ ہم بھی ان سے بے حد مانوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے سر توڑ کوششوں سے اپنا تبادلہ اپنے گھر کے نزدیک کر لیا۔ کلاس کو جب پتا چلا تو لڑکوں میں

RTM NO 373738



مردل چاہیے



لوتالہ (سہن) طر

• واشنگ مشین • ڈرائیور • روم انوکیٹر
• گیٹر • پلاسٹک فرنیچر



055-3857636 فون: کلائمکس آباد جی ٹی روڈ گوجرانوالہ



آپ اسے رکوانے چلے گئے۔ ان کی بات ہمیں بعد میں سمجھ آئی۔

میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے، ہمارے ایک کلاس فیلو جنہوں نے کافی حاسد قسم کی طبیعت پائی تھی، اسی لئے مکار اور سازشی بھی تھے، وہ اپنی طرف سے ان سے مقابلہ لگائے رکھتے تھے۔ انہوں نے ان کو تیاری سے باز رکھنے کے لئے یہ طریقہ کیا کہ چھٹی کے بعد شام تک ان کے ساتھ رہتے تاکہ یہ تیاری نہ کر سکیں اور خود رات کو جاگ جاگ کر تیاری کرتے جبکہ یہ رات کو تھوڑا بہت پڑھ کر سو جاتے۔ زلٹ آیا تو ان کے پورے 60 نمبر ان سے زائد تھے حالاں کہ پیروں میں بھی وہ ان سے پوچھ پوچھ کر لکھتے رہے اور ان کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا اس لئے انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ کہتے تھے صحت بھی خراب کی اور پوزیشن بھی نہ ملی۔ ضرور انہوں نے کوئی ملی بھگت کر کے نمبر بدلوا لیے ہیں حالاں کہ کوئی ملی بھگت نہ تھی بس توکل اور نیت کا پھل تھا جو ان کو ملا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ جو خود بے ایمان ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بے ایمان سمجھتا ہے، بس یہی اصل صورت حال تھی۔

میٹرک تک یہ کبھی سٹیج پر نہیں گئے تھے لیکن ان کے رجحان کو دیکھ کر بزم ادب کے انچارج نے انہیں آئندہ پردگرام میں تقریر کا آرڈر دے دیا۔ یہ تقریر تو تیار نہ کر سکے کہ ان کے مزاج کے خلاف تھی البتہ انہوں نے دو چار لطیفے سنا دیے جن کے اشارے انہوں نے ہاتھ پر لکھے ہوئے تھے لیکن اس دوران بھی یہ اس قدر کانپ رہے تھے کہ لگتا تھا ابھی گر پڑیں گے۔ اس کے باوجود انچارج بزم ادب ناراض ہو گئے کہ تقریر کی جگہ لطیفے کیوں سنائے حالاں کہ ان کا ساری زندگی یہی دستور رہا ہے۔



آفیسر کو پیش ہو گئے اس نے درخواست پڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے لئے ایک رقعہ دیا جس میں ان کو دفتر حاضری کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ سب خوش خوش واپس آ گئے کہ اب تبادلہ رک جائے گا کیونکہ درخواست میں بڑے رقت آمیز لہجے میں کلاس کے یتیم ہو جانے کا ذکر کر کے تبادلہ رد کرنے کی التجا کی گئی تھی۔ اب مسئلہ تھا وہ رقعہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو دینے کا۔ یہ رقعہ تو پڑھا کو لوگ لائے تھے جو عموماً ڈرپوک ہوتے ہیں اس لئے کسی کو ہمت نہیں ہو رہی تھی اس لئے میں نے نوہر مارنے کے لئے رقعہ لے لیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دینے کی ہامی بھری۔

اسمبلی ہوئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب لے سرگودھا جانے والے لڑکوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ میری شامت جو آئی تو میں نے اسی دقت اٹھ کر رقعہ ان کو دے دیا۔ رقعہ پڑھتے ہی ان کا رنگ اڑ گیا اور انہوں نے سرگودھا جانے والے لڑکوں کے ساتھ مجھے بھی مرغا بننے کا حکم دے دیا۔ خود وہ اسی دقت سرگودھا روانہ ہو گئے اور مرغوں کا چارج نائب ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے گئے۔ انہوں نے کافی دیر ہم سے بانگیں دلوائیں اور اسی حال میں سارے سکول میں پھرایا۔ یہ سزا تھی دراصل بغاوت کی اصل سزا تو یہ بنتی تھی کہ سکول سے ان کو نکال دیا جاتا مگر ان میں زیادہ تر لائق لڑکے تھے اس لئے بالآخر معافی دے دی گئی۔ بڑی منتوں اور سفارشوں کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کو ضلعی دفتر میں آفیسر نے جھاڑ پلائی کہ یہ آپ کا ڈسپن ہے کہ لڑکے ضلعی دفتر پہنچ گئے اور آپ کو پتا بھی نہ چلا۔ ہمیں اس جھاڑ کا علم تب ہوا جب اگلے دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں پھر مرغا بنایا۔

یہ سارا قصہ ضلعی دفتر سے ہمارے تبادلے والے انچارج صاحب کو پتا چلا تو آفیسر کے حکم سے وہ ہمیں مطمئن کرنے آئے اور کہا کہ آپ میرے اچھے خیر خواہ ہو میں نے اتنی مشکلوں سے گھر کے نزدیک تبادلہ کر لیا اور

کوروئٹا کی لاش

وہ منزل کی طرف یوں چلی جیسے کسی پھانسی گھاٹ کی طرف
جا رہی تھی، کوئی لاش لینے یا لاش کی صورت ڈھل جانے۔



راولپنڈی

0345-6875404

☆ ڈاکٹر ہرمن ملک

”یہ محض ڈرامہ ہے، بابا! مان لو۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ایسا کوئی دیکھا جسے کورونا نے بہار کیا ہو؟ میں اسے حکومتی دہشت گردی سمجھتا ہوں۔ بڑی طاقتوں کو لاشیں درکار ہیں۔ کوئی ہسپتالوں کے چکر میں پڑ جائے تو اسے زہریلے ٹیکے لگا کر مار دیا جاتا ہے، پھر لاش تانہوں میں سجا کر سمندر پار بھیج دی جاتی ہیں، ہر لاش کہتی ہے، حکومت کو پیسے مل جاتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے بھی خرافات کو صداقت کا درجہ دینے پر تہہ بیٹھے ہیں۔“ شہزادہ مسلسل بولتا رہا۔ نواب کے چہرے پر رنگوں کی چھاپ عکس بدلتی رہی، بالآخر یاس نے اس کے نقوش پر تسلط جمالیا جو گہرا ہو گیا۔

”بیٹا! پیسے ان غیر سرکاری ہسپتالوں کو ملتے ہیں جو کورونا وائرس کی بیماری کا علاج کرتے ہیں، حکومت ایسے مریضوں کے اخراجات برداشت کرتی ہے، مگر یہ انتظام صرف یورپ اور امریکہ میں ہے، ہمارے ہاں

دو حقائق جھلکاتے رہنا کبھی مفید میں نہیں ہوتا۔ اگر تم ڈھب سے سوچنا سیکھ جاتے تو زندگی میں یوں ناکام نہ ہوتے۔“ نواب نے شہزادے سے کہا بدلتے لفظ اس کے منہ پر دے مارے۔ کبھی غصے میں آتا تو وہ بیٹے کی سرزنش سردیتا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ وہ اپنے لفت جگر سے ڈرا کرتا تھا۔ جو نہ صرف بدتمیز تھا بلکہ اس پر یوں سوار ہو جاتا جیسے وہ اس کا بیٹا نہیں، پاس تھا۔ پانچھ دو امیوں کی طرح روایتی باپ۔ غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھڑا رہتا، چہرے پر تیوری رہتی۔ ماں کی زندگی میں بے شمار مشن تھے۔ اولین مطمع نظریہ تھا کہ وہ باپ اور بیٹے کی بیچ تعلق خوشگوار رکھے۔ اگر کبھی دونوں کے درمیان تلخیاں گہری ہو جاتیں تو اس کی جان پر ہن جاتی۔ اسے اپنی کم مائیگی پر ترس آنے لگتا۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں چوبیس کی آگ بھی بھڑک اٹھتی تو وہ بوکھلا جاتی۔

سے واپس لوٹے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آتے آتے صبح کر دے، اسے ہر حال میں جانگتے رہنا تھا، سو گئی تو شہزادے کو کھانا کون دے گا؟

بھاگ بھری نے بیتیاں گل کر دیں اور بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ پرانی یادوں نے اسے گھیر لیا۔ شہزادے کو اس نے مانگ کر خدا سے لیا تھا۔ اس کے لئے بہت تڑپ تھی، ملا تو تمام امیدیں اسی سے وابستہ کر لیں۔ اس کی پرورش پر بہت توجہ دی، مگر شہزادے نے ہوش سنبھالا تو راہیں بھٹک گئیں۔ اس نے زندگی کا ہر سبق تجربہ کر کے سیکھا، پے در پے کئی مسائل میں مبتلا ہوا۔ بارہا گرا پھر سنبھلتا رہا۔ اس سچ بڑا نقصان یہ کیا کہ پڑھائی سے بدگ گیا، بمشکل میٹرک تک پڑھ سکا۔

زندگی مراحل کا مجموعہ ہے، گیا وقت واپس نہیں آتا۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے، آدمی گئے مراحل میں لوٹ کر انہیں شرمناک نہیں کر سکتا، پیچھے دوڑ کر پریشان رہتا ہے۔ ماں کا ذہن انہی خیالوں سے اٹا رہا۔ اس کے کیچے پر سانپ لوٹنے رہے۔ نواب بیوی کی حالت جانتا تھا مگر کچھ نہ کر سکا۔ اس کا اپنا چپ رہنا بھی کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

رات بھگ چکی تھی جب شہزادہ گھر لوٹا۔ ماں کو وہ ماندہ سا لگا۔ ٹوائلٹ سے نکلا تو اس کے بدن پر لرزش تھی۔

”پیٹ میں درد ہے ماں!“ اس نے کہا۔ ماں اسے زبردستی کھانے کی میز پر لے آئی۔ اس نے بمشکل چند تھکے زہر مار کئے۔

”ساری چیزیں تمہاری پسند کی ہیں، پھر تم نے ہاتھ کیوں کھینچ لیا؟“ ماں نے استفسار کیا۔

”شاید مجھے تپ چڑھ گیا ہے، ہر کھانا بد ذائقہ سا محسوس ہوتا ہے۔ نہ تو تمکین کا احساس ہوتا ہے اور نہ بیٹھے کا“ شہزادے نے بتایا، کچھ پریشان بھی نظر آیا۔

”یہ مختلف ہے، تم نے تو تمام کہانی ہی بدل ڈالی؟“
”ہاں، تم نے چار ہفتائیں کیا پڑھ میں، اخباروں کو ہی معتبر سمجھ بیٹھے۔“

”کاش! تم بھی چار ہفتائیں پڑھ لیتے۔“ نواب نے کہا۔ ”شہزادے نے باپ پر گھوڑی ڈالی اور پاؤں پختا ہوا گھرتے نکل گیا۔“

”کیا ہی اچھا ہوتا جوان پُر فطر دونوں وہ آوارہ گردی ترک کر دیتا۔“ نواب نے آہ بھرتے ہوئے خواہش کی۔ ”وہ کسے بھی کیا ہے چارہ، بہت پریشان ہے آج کل، جوان جہاں ہے، یوں گھر میں پڑا رہے تو ہر کوئی اکتا جاتا ہے۔“ ماں نے معانہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”جو تے بنانے والی فیکٹری میں جانا شروع ہوا تو خوش تھا، اسے اچھے پیسے مل جاتے تھے۔ ہنر بھی سیکھ رہا تھا مگر خدا کی مارت ہو ان لوگوں پر جنہوں نے چوکا دوڑوں کا شور بہایا، وہ بھی سانپ کھا کر، نہ زندگی دیکھی، نہ پید کی، خود تو مرنا تھا ہی، بیمار کی دنیا بھر میں بانٹ دی۔“ بھگ بھری اندھیرے میں تیر چلاتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی بڑبڑاہٹ جھنجھٹ میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ خاندان کے پاؤں دھار رہی تھی، ساتھ مسلسل بل رہی تھی۔

”بچہ ہے، دل کا برا نہیں، موقع پڑے تو تمہارے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ دن دیکھتا ہے نہ رات، اس کی فیر مانگا کرو۔ باپ کا دل مندا ہو جائے تو اولاد پر بھاری پڑتا ہے۔“ ماں نے کہا، پھر بوسیدہ دوپٹے کے ساتھ اپنے ایشب پونچھنے لگی۔ اس کا چہرہ اب خاندان کی طرف نہیں تھا، پھر بھی چند قطرے نواب کے جسم پر گر پڑے۔

جان چکی تھی کہ اس کی شب کوٹوں پر لوٹنے کے لئے اس کا کھٹ جگر غصے کے عالم میں گھر سے گیا تھا۔ اس نے کھایا بھی کچھ نہیں تھا۔ ضدی تھا، سنبھلے گا تو دیر

حکایت

کا دو تہائی حصہ بیویوں ہی گزار دینے کے بعد اس حصے کو احساس ہوا کہ وہ بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکا ہے، اس نے کام کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا لیکن کوئی علم یا ہنر نہ رکھنے کے باعث ہر جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کام کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے جب وہ تھک گیا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ ملازمت کی تلاش میں جس جگہ بھی جائے گا، مالک ادارہ کو اپنی ناکامیوں کی طویل داستان سنا کے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

افتاق کی بات کہ اس بار وہ جس کمپنی میں ملازمت کی امید لے کر گیا، اس کا مالک اس شخص کی دو تہائی بیکار زندگی سے واقف تھا۔ جب دونوں کا آمنا سامن ہوا تو امیدوار کو ڈھارس بندھی کہ شاید اس بار وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن خلاف توقع کمپنی کے مالک نے چند سوالوں کے بعد نفی میں گردن ہلا کے اسے مایوس کر دیا۔

امیدوار نے غزہ آواز میں کہا: ”یہ میرا بچا سوال انٹرویو تھا اور اس میں بھی میں ناکام رہا ہوں۔“

کمپنی کے مالک نے جواب دیا: ”مجھے یقین ہے کیونکہ میں تمہارے پیچھے زندگی کے دو تہائی حصے اپنی بربادی پر فوج کھان دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تم نے وقت کو ضائع کیا تھا اور اب وقت تمہیں ضائع کر رہا ہے۔“

سداہ والدین اسے جاتا دیکھتے رہے، حتیٰ کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

والدین گھر پہنچے تو کم صدم تھے، گھر کی دلیلیں ان کے لئے دیوار ہو گئی۔ کواڑ کھٹا تھا مگر بیروں میں سکت نہیں تھی کہ اندر قدم رکھے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کچھ باتیں لگا ہوں نے طے کیں۔ نواب نے اشک سنبھال لئے، جبکہ صنفِ مازک یہ ہمت نہ کر

سکھو بیٹا! ہاں حالات ایسے نہیں، اُن گنت لوگ بیروزگار رہے ہیں۔ مجھے میں کئی جنازے اٹھ چکے ہیں۔ بیرونی گھر میں داخل ہو گئی تو بڑا نقصان ہو گا۔ تمہارا باپ موصعہ مند تھی مگر ضعیف ہو چکا ہے، کسی روگ کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ میں احوال میں اسے۔ تم خود عاقل و بالغ ہو، جانتے ہو کہ یہ گھر محض پیشین پر چل رہا ہے۔ اس کچھ اور بھی ہتی مگر شہزادہ کی بے سکونی دیکھ کر چپ ہو گئی۔

”ماں! دعا کرو، بازار اور بند فیکٹریاں کھل جائیں۔ میں ڈبل شفٹ کر لیا کروں گا۔“ شہزادے نے نسلی آمیز لہجے میں کہا: ”تمہیں پیسے کی آزمائش نہیں آئے گی۔“

ماں گہری سوچ میں الجھ گئی۔
فجر ابھی دور تھی، جب شہزادے کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ تپ صدیں چھوٹے لگا اور وہ تقریباً بے حال ہو گیا۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا، پھر بے چینی اس کی نرس نرس سے ابھرنے لگی۔ کھانسی تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیت تھی۔ ماں نے اسے بخار کی عمومی دوائیں دیں، اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں بھی رکھیں مگر شہزادے کی حالت غیر ہوتی گئی، حتیٰ کہ ماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

نواب نے اپنے لوت جگر کی کیفیت دیکھی تو اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ دن چڑھا تو معلوم ہوا کہ شہزادے کو کوہ ہو چکا تھا۔

”آپ اسے مل نہیں سکتے۔ ہاں، اسے فیصلہ سے دیکھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے مریض کے والدین سے کہا: ”بہتر ہو گا کہ گھر چل جائیں اور اس کا انتظار کریں۔“ اس کی اگلی ہدایت یہ تھی۔ اس کے بعد کوئی بھی تقاضا بے معنی تھا۔

شہزادہ وکیل چیئرز پر تھا۔ نڈھال اور تقریباً بے

بہت کھٹن تھا، بلاخیز خدشوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ منزل کی طرف یوں چلی جیسے کسی پھنسی گھاٹ کی طرف جا رہی تھی، کوئی لاش لینے یا لاش کی صورت دھل جانے۔ وہ دیر تک ایک کمرے میں بیٹھی رہی ہسپتال کے

اس گوشے میں بڑا سکون تھا، لحد کی طرح گہرا۔ کئی لاشیں ایک کونے میں پڑی تھیں۔ بند آنکھوں سے احباب کی منتظر۔ بالآخر بھاگ بھری کو خفگی کٹ پہننا دی گئی۔ کچھ ہی محو میں منظر واضح ہو گیا۔ ڈاکٹر کے ہمراہ اس کا لخت جگر کھڑا تھا، وہ بری طرح رو رہا تھا۔

”ہانا! مجھے معاف کر دینا، ہانا! مجھے معاف کر دینا“۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ پھر جلد ہی نڈھال ہو گیا۔

”ہم آپ کے خاوند کو نہ بچا سکے، وہ مٹی آرمین فیلر کی بھیٹ چڑھ گئے۔ آخر میں ان کا دل بند ہو گیا۔

کورونا وائرس انتہائی خطرناک ہے۔ گز جائے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آپ کے لئے دلا سے کا پہلو بھی ہے۔ بیٹے کی صحت آپ کو مبارک ہو“۔ ڈاکٹر نے کہا۔

بھاگ بھری نہ تو جشن مناسکی اور نہ ہی سوگ، ابھی بیٹے کی طرف دیکھتی تو کبھی مرحوم خاوند کی طرف۔ پھر سوگ اس پر حاوی ہوتا گیا اور آنکھوں میں پانی چمک

آیا، آنسو اس کے گالوں پر بھسنے لگے۔ وہ الم کی تصویر نظر آنے لگی۔ شہزادہ ماں کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ دبا کے باعث وہ اسے گلے بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں جھک نکلیں۔

”مرحوم کو دفن خفگی تدابیر کے تحت کرنا ہوگا۔“ سناف شہزادے کو سمجھا رہا تھا۔ ”قبرستان کے بارے میں ہم بتا دیں گے، آپ کی طرف سے دس افراد جنازے پر آئیں گے۔ میت کے غسل اور غسل کا انتظام ہم کریں گے۔ خدا آپ کو حوصلہ عطا فرمائے!“



سہی۔ دیر بعد دونوں لرزیدہ قدموں کے ساتھ صحن تک آئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس روز کے بعد نواب اور اس کی بیوی انتظار کی سوئی پر تنگ گئے۔ ایک دوسرے کو تسلی دیا کرتے۔ وقت سسک سسک کر گزرنا رہا۔

بہشت بھر گزرا ہو گا کہ شب تار کے دوران ایک دوسرا گہرا طوفان اتر آیا۔ نواب پر کھانسی کا دورہ پڑا تو اس کی سانس بھی رکنے لگی۔ وہ دو روز سے بخار میں مبتلا تھا۔ اس صبح اس کا جسم سینے سے شاپور ہو جاتا۔ اب اس کے سینے میں شدید درد ادھ رہا تھا۔ وہ بری طرح کراہنے لگا۔ لاچار عورت پر آزمائش اسی طوفان کی طرح اتری جو دھرتی پر برپا تھا۔ اس نے ہانپ کر گرگی میں گھروں کے تمام دروازے پیٹ ڈالے۔ بالآخر پڑوسیوں نے نواب کو ہسپتال پہنچایا۔

صبح دم نواب کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ آسپین بیل پر بے مدد پڑا تھا۔ بھاگ بھری میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ خاوند کی طرف دیکھ سکتی۔ اسے گھراوٹ جانا تھا۔ جی مڑا کر اس نے دل ہی دل میں خاوند کو اوداع کہا اور ہاں سے نکل گئی۔

بھاگ بھری گھر پہنچی تو دھلیز پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ دیر تک وہیں پڑی رہی، کسی سہکت پھر کی طرح۔ سوچیں اس کے ذہن میں منجھد ہو گئی تھیں۔ شب اس نے کواڑ کے ساتھ ٹیک لگائے گزار دی۔ آخر مجبور یوں نے اسے وہاں سے اٹھا دیا۔ سانسوں کے سفر نے اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا۔ دن دنوں طوفان بہت آنے اور ظفرات بھی قیامت مچاتے رہے۔

نہ تو دھرتی پر سکون تھا اور نہ ہی بھاگ بھری کے دل میں، بس زندگی اسے بھاتی رہی۔ کبھی لمحے منجھد ہو جانے کی دعا کرتی تو کبھی یہ انجناد ٹوٹنے کی۔ اسے کسی بڑی قیامت کا کھکا تھا۔ بہشت کسی طرح اس نے گزار دیا، پھر ایک روز اسے ہسپتال سے بلاوا آ گیا۔ یہ مرحلہ

میں اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ کو میرا رونا پسند آ گیا ہے۔ میری یہ خوشگوار زندگی شاید میرے بہے ہوئے آنسوؤں اور اشکوں کا خراج ہے۔

اشکوں کا خراج



میں تھیں۔ میں روزانہ باقاعدگی سے سرکاری سکول جاتی اور دل لگا کر پڑھتی۔ مجھے بچپن سے ہی اپنی ماں کا پورا احساس تھا۔ انہوں نے میری خاطر اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور میری خاطر اپنے آپ پر ہر طرح کا آرام اور سکون حرام کر لیا تھا۔ وہ میری بہترین پرورش اور تربیت کر رہی تھیں۔ پانچ وقت کی نماز خود بھی پڑھتیں اور مجھے بھی پڑھاتی تھیں۔ شام کو محلے کے ایک گھر میں میں قرآن پاک پڑھنے جاتی تھی۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں جو مجھے کی بچیوں کو مفت کلام پاک پڑھاتی تھیں اور ساتھ اسلامی تعلیم بھی دیتیں۔ ہر روز ایک دو احادیث مع اردو ترجمہ بچوں کو سمجھاتیں۔ انسانی رشتوں کی قدر اور اہمیت بتاتیں۔ حقوق العباد کا درس دیتیں۔ الغرض دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی اخلاقی تعلیم کا پورا خیال رکھتیں۔

میرا نام فاطمہ ہے۔ ایک دن ایک لڑکی نے میرا نام بگاڑ کر مجھے پھانتا کہہ کر بلایا تو ان بزرگ خاتون جن کا نام رضیہ تھا، کو غصہ آ گیا اور انہوں نے اس لڑکی کو ایک ٹھپڑ مارا اور سختی سے منع کیا کہ کسی بچی کا نام نہیں بگاڑنا، خاص طور پر میرا نام کیونکہ فاطمہ ہمارے پیارے

میرے بچپن ہی میں میری ماں بیوہ ہو گئی۔ میری عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ابو کی وفات کے بعد میرے ماموں مجھے اور میری ماں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ جب میری ماں بیوہ ہوئی تو اس وقت وہ جوان تھی۔ میرے ماموں نے بہت کوشش کی کہ میری ماں دوسری شادی کر لے مگر میری ماں نے سختی سے منع کر دیا کہ پتہ نہیں سوتیلا باپ کیسا ہو، وہ مجھے قبول کرتا ہے یا نہیں، ماموں نے ساتھ کیسا سنوک کرے۔ یہی سوچ کر میری ماں نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔

میرے ماموں کے گھر میں غربت تھی، ان کے اپنے بیوی بچے تھے، ان کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ میری ماں نے سوچا کہ بھائی پر بوجھ بننے کی بجائے وہ کوئی کام کر لے گی اور میرا اور اپنا خرچہ خود اٹھائے گی۔ میری ماں ان پڑھ تھی چنانچہ انہوں نے تین چار گھروں میں ماسی کا م شروع کر دیا۔ وہ صبح مجھے ناشتہ کروا کر سکول چھوڑ دیتیں اور خود کام کرنے چلی جاتیں۔ مہینے بعد جو تنخواہ میری ماں کو ملتی تھی اس سے ہمارا گزارہ اچھی طرح ہو جاتا بلکہ چند سو روپے بچا بھی

امتحان پاس کر لیا۔ اُس روز میں اور میری ماں بہت خوش تھیں۔ پڑھائی میں میرے شوق کو دیکھتے ہوئے امی نے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے محنت اور لگن سے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور بی اے کر لیا۔ میں ایم اے کرتا چاہتی تھی مگر میری امی ہمت ہار بیٹھیں، انہیں بارہ سال ہو گئے تھے لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہوئے، اب وہ بیمار رہنے لگی تھیں، ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اُوھر ماموں کے حالات بھی کافی بہتر ہو گئے تھے، انہوں نے امی کا کام چھڑوا دیا اور امی گھر بیٹھ گئیں۔

میری عمر بیس سال ہو گئی تھی، میری امی کو میری شادی کی بہت فکر تھی، وہ چاہتی تھیں کہ جلد از جلد میری شادی ہو جائے۔ انہوں نے تین چار لوگوں کو میرے رشتے کا کہہ رکھا تھا۔ میں بہت خوبصورت تھی۔ گورا چٹا رنگ، دلکش نین نقش، لمبے سیاہ گھنے بال اور لمبا قد۔ میں پردہ کرتی تھی کیونکہ رضیہ آنٹی نے سختی سے سب لڑکیوں کو پردہ کرنے کا کہا ہوا تھا۔ آنٹی رضیہ کہتی تھیں کہ شرم و حیا اور پردہ ہی عورت کی زینت اور حسن ہیں ہم سب لڑکیاں ان کی باتوں پر عمل کرتی تھیں۔ اسی دوران میرا ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا کراچی کی کسی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ اس کی صرف ماں زندہ تھی، باپ وفات پا چکا تھا۔ لڑکے کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ میری ماں اور ماموں نے اس رشتہ کی چھان چھانک کی اور اللہ کا نام لے کر میرے رشتے کی باں کر دی گئی اور چھ ماہ بعد شادی طے پا گئی۔ میرے شوہر کا نام ناصر تھا وہ تھوڑے تیز طرار اور چالاک تھے۔ شادی کے بعد وہ پندرہ دن گھر رہے اور پھر کراچی چلے گئے۔ ان کا معمول تھا وہ ایک مہینے کے بعد تین یا چار دن کے لئے آتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اور امی کو بھی اپنے

نبی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری بیٹی کا ہم مبارک ہے جو جنت میں خواتین کی سردار ہیں۔ خیر! آئندہ کسی نے نام بگاڑا تو وہ چڑی ادھیڑوں کی۔ اب روزِ زندگی میں کبھی مرتبہ انہیں اندھ غصہ آیا۔ ان سے غصے کو دیکھتے ہوئے پھر کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ کسی بیٹی کا نام بگاڑے۔

زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی اور میں جوانی کی صدوں میں داخل ہو گئی۔ میرا میٹرک کا امتحان سر پر آ گیا، میں نے دن رات خوب محنت کی اور پوری تیاری سے امتحان دے دیا۔ امتحان دینے کے بعد میں فارغ تھی تو میں رضیہ آنٹی کی طرف چلی جاتی۔ گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی پھر وہ مجھے اسلامی واقعات سناتیں جنہیں سن کر مجھے بہت تسکین ملتی۔ میری ماں کو لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے گو وہ کام والی ماسی تھیں مگر انہوں نے مجھے شہنشاہیوں کی طرف نہ رکھا تھا۔ وہ میری ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ انہوں نے مجھے ماں باپ دونوں کا پیار دیا۔ میرے ناز و نعم اٹھائے، میری ہر خواہش پوری، میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ میری عمر اس وقت سولہ سال تھی اور یہ وہ عمر تھی جب آنکھوں میں سنہرے سپنے جتے ہیں، دل میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے مگر میں نے اپنے دل کو کنٹرول میں رکھا۔

یونکہ امتحان کا رزلٹ پورے ساڑھے تین ماہ بعد آتا تھا، میں فارغ تھی تو میں نے اپنے علاقے میں ہی ایک سلائی کڑھائی اور کپڑوں کی کلنک والے سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد میں وہاں چلی جاتی اور دوپہر دو بجے واپس گھر آتی۔ وہ دو سے اڑھائی ماہ کا کورس تھا جو میں نے مکمل کر لیا۔ اب میں بھی سلائی کڑھائی کی ایکسپرٹ ہو گئی۔ ایک ماہ بعد میرا میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ میں نے فرسٹ ڈویژن میں

تھا میں نے بہت اچھے نمبر لئے تھے۔ میں نے محکمہ ایجوکیشن میں مختلف آسامیوں کے لئے اپلائی کر دیا۔ اب اتنی تعلیم حاصل کی تھی تو اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو اٹھانا چاہئے ورنہ ساری تعلیم بیکار جاتی۔

ادھر ناصر کے طور طریقہ بدلنے لگے تھے۔ اب اس نے دو مہینے بعد آنا شروع کر دیا اور گھر کے خرچ میں بھی کمی کر دی۔ ہمارا ہاتھ بہت تنگ ہو گیا تو میں نے قسطوں پر ایک سلائی مشین لے لی اور کپڑے سینے کا کام شروع کر دیا۔ چونکہ میں نت نئے فیشن اور ڈیزائن کے کپڑے بہت اچھی سلائی کرتی تھی تو میرے پاس بہت کام آنے لگا۔ میں رات کے بارہ بجے تک ٹیبلٹوں کی سلائی کرتی رہتی جس کی وجہ سے ہماری آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر مختلف آسامیوں پر اپلائی کی ہوئی سیٹوں کی سٹیکیشن کے لئے مختلف ٹیسٹ بھی دیتی رہی مگر انٹرویو میں ناکام ہو جاتی کیونکہ میرے پاس گٹری سفارش نہیں تھی۔ میں اپنے بچے بھی پال رہی تھی، اپنی بوڑھی ساس کی خدمت بھی کر رہی تھی اور گھر بھی چلا رہی تھی۔ ناصر نے اب گھر آنا بہت کم کر دیا۔ وہ تین مہینے کے بعد آتے تھے پھر چار مہینے بعد آنا شروع کر دیا۔ میں نے اب ناصر کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو کام میں مصروف کر لیا۔

اسی معمول میں آٹھ سال گزر گئے۔ اب ناصر چھ ماہ بعد آتے تھے۔ ایک دن گھر میں کوئی پیسہ نہیں تھا، میری ساس کی طبیعت کچھ خراب تھی، انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ صبح کا نام تھا تو میں نے ناصر کے موبائل پر کال کی تو پانچویں گھنٹی پر کسی خاتون نے کال پک کی میں نے پوچھا کہ آپ کون بول رہی ہیں تو اس عورت نے جواب دیا کہ مسز ناصر بول رہی ہوں، اتنے میں ناصر آ گئے اور انہوں نے فون پکڑ لیا۔ میں نے

سناٹھ کراچی لے جائیں تو وہ کہنے لگے یہ اپنا مکان ہے، وہاں کراچی میں دوستوں کے ساتھ مل کر رہتا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو وہاں لے گیا تو لاگ مکان لینا پڑے گا جس کا کرایہ دینا پڑے گا۔ جس سے میرے خرچات بہت بڑھ جائیں گے۔ میں نے کہا ہم یہ والا مکان کرایہ پر دے دیتے ہیں اور اس کرائے سے وہاں مکان لے لیں گے تو ناصر کہنے لگے۔ یہ چھوٹا شہر ہے یہاں کرایہ صرف پانچ ہزار روپے ملے گا جبکہ کراچی بڑا شہر ہے وہاں مہنگائی بہت ہے کم سے کم بیس ہزار روپے پر مکان ہمیں کرایہ پر ملے گا تو اس لئے آپ ادھر ہی رہو۔

میں سارا دن گھر میں فارغ رہتی تھی، میں نے پرائیویٹ ایم اے کی تیاری شروع کر دی۔ شادی کے سال بعد اللہ نے مجھے پیدا دیا، بہت خوبصورت اور پیارا بیٹا تھا۔ اس کا نام ہم نے حاشر رکھا۔ میں اب گھر کے کام بھی کرتی، حاشر کو بھی سنبھالتی اور ساتھ ساتھ ایم اے کی پڑھائی بھی کرتی۔ خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے میں نے ایم اے کا امتحان دیا۔ اب میری توجہ گھر داری اور بیٹے کی طرف ہو گئی۔ تھوڑا سا مٹا تو میں سناٹھ کڑھائی کر لیتی۔ میری شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ دنیا کے دھن سے نجات پا کر منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ میں کچھ دن مومن کے گھر رہی اور پھر واپس اپنے گھر آ گئی۔ ناصر کی دینی روٹیں تھی مہینے بعد چاروں کے لئے آتے تھے اور واپس کراچی چلے جاتے۔ میری شادی کو چار سال ہو گئے تھے، اللہ نے مجھے تین بیٹے عطا کئے۔ بڑے بیٹے کا نام حاشر، دوسرے کا یاسر اور تیسرے کا نام عامر رکھا۔ میری ساس اچھی عورت تھی، وہ سارا دن میرے بیٹوں بچوں کو کھلاتی رہتیں، میرے بیٹوں بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ میرا ایم اے کا رزلٹ آ گیا

ہوگئی۔ وہ گھر جس میں ہم رہ رہے تھے، وہ میری ساس کے نام تھا کچھ دنوں بعد ساس نے وہ گھر میرے نام کر دیا اور کاغذات بنوا دیئے۔ میری ساس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہنے لگیں انہیں ناصر کی پہلی شادی کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ہرگز اس کی شادی میرے ساتھ نہ کرتیں۔

”ای! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے ان سے کہا۔ ”آپ اپنا دل چھوٹا نہ کریں جو میرا مقدر نصیب تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ اب آپ اور میرے تینوں بچے میری کل کائنات اور زندگی ہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گی اور اپنے بچے پالوں گی۔“

اور پھر میں دل و جان سے اپنے کام میں جت لگئی۔ میں اپنے تینوں بچوں کی بہترین پرورش کر رہی تھی۔ آئی رضیہ کی ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں اور ان کی باتوں کی روشنی میں میں اپنے بچوں کی تربیت کر رہی تھی۔ ایک دن اخبار میں پبلک سروس کمیشن کا اشتہار میری نظروں سے گزرا جس کے مطابق انہیں بیچکار از کی ضرورت تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اپلائی کر دیا۔ میں ہر نماز کے بعد رورڈ اپنے اللہ سے دعا مانگتی پھر مجھے تحریری امتحان کی کال آئی۔ میں نے امتحان دے دیا۔ تحریری ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد مجھے انٹرویو کی کال آئی میں نے پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ انٹرویو دیا۔ انٹرویو دینے کے بعد میں گڑگڑا کر رب کے حضور دعا مانگتی اور پھر اللہ نے میری سنی۔ میری سائنس بطور بیچکار گریڈ سترہ میں ہوگئی۔ جس دن مجھے میری تقرری کا پروانہ ملا اس روز میری خوشی دیدنی تھی میں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ میں نے اللہ کی بارگاہ میں شکرانے کے نوافل ادا کئے اگلے ہی دن میں نے سرکاری کالج جان کر کیا۔ لیکچرر بننے کے بعد میری زندگی

صرف اپنی ساس کی بیماری کا بنایا اور کہا کہ پیسے نہیں ہیں ہمارے پاس تو آپ جلدی پیسے بھیج دیں۔ دو گھنٹے بعد میرے شاختی کارڈ پر ایزی پیسہ کے ذریعے پانچ ہزار روپے انہوں نے بھیج دیئے جو میں نے نکدوا کر ساس کو چیک کروایا اور ان کی دوائی لی۔

ایک ہفتے بعد ناصر گھر آ گئے۔ میں نے اپنی ساس کے سامنے ان سے پوچھا کہ ان کی دوسری بیوی بھی ہے؟ تو انہوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہے۔ وہ ان کی پہلی بیوی ہے اور میں دوسری بیوی ہوں اور وہ نراچی میں گھر داماد بن کر رہ رہے ہیں۔

”جب پہلے سے آپ شادی شدہ تھے تو مجھ سے دوسری شادی کیوں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنی ماں کی خدمت کے لئے۔“ وہ بڑی ڈھٹائی سے بولے۔ ”کیونکہ ان کو میں ساتھ لے جا نہیں سکتا تھا اور یہاں اکیلا چھوڑ نہیں سکتا تھا تو اس لئے تم سے شادی کی۔“

مجھے یہ سب سن کر بہت دکھ ہوا۔

”اپنی ماں کی خاطر میری زندگی برباد کی آپ نے۔“ میں نے کہا۔ ”آر اپنی ماں سے اتنی محبت تھی تو ساتھ لے جاتے ان کو اور الگ گھر میں رکھتے۔ یہ کیا کہ دو دو شادیاں رچا کر بیٹھ گئے اور عیاشی کرتے رہے۔“

میری ساس بھی یہ سن کر بہت ناراض ہوئیں۔ وہ بھی کہنے لگیں ناصر تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ تم نے مجھ سے بھی چھپایا اس معصوم بچی کی زندگی تباہ کر دی بہت فکر کیا تم نے۔ میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی اور پنہ دودھ بھی نہیں بخشوں گی۔ میری ساس نے خوب سنیں اور ناصر سے لڑائی کی۔ گھر کا ماحول خراب ہو گیا تھا۔ اس رات ہم تینوں ہی نہیں سوئے۔ میں ساری رات روتی رہی، میری ساس بھی بہت رنجیدہ تھیں۔ کچھ دن ناصر واپس کراچی چلے گئے گھر کی فضا سوگوار

میں نے کاریگر خواتین رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ کپڑا اور سلائی کا سامان میں خود خریدتی۔ میرا بوتیک بہت اچھا چل رہا تھا اور خوب آمدنی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت مصروف کر لیا تھا۔

میرے تینوں بیٹے انتہائی لائق اور حساس تھے، وہ پڑھائی میں بہت محنت کر رہے تھے۔ میں نے دنیاوی علم کے ساتھ ساتھ دینی علم بھی انہیں دیا۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود میں اپنے ماں باپ اور ساس، شوہر کو نہیں بھولی سال بعد ان چاروں کی برسی منائی اور ان کے ایصال ثواب کے لئے صدقہ خیرات کرتی اور ان کی مغفرت کی دعا بھی کرتی۔ میں نے اپنے بچوں کے دل میں ان کے باپ کے لئے نفرت نہیں ڈالی اور نہ ہی ان کو بتایا کہ میں ان کی دوسری بیوی تھی۔ بس اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ ایک فیکٹری میں جاب کرتے تھے اور آگ لگنے کی وجہ سے جھلس گئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بچوں کے دلوں میں ان کے باپ کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اپنے باپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح پچیس سال کا عرصہ بیت گیا۔ الحمد للہ، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آج میرے تینوں بیٹے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں، بڑا بیٹا حاشرہ اکٹر ہے، یاسر انجینئر ہے اور عامر کالج میں پروفیسر ہے۔ حاشرہ شادی کر دی ہے۔ اس کی بیوی میری بہو ہیں بیٹی ہے۔ میرے تینوں بیٹے اور بہو میرے بہت تابع فرمان ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے جاب چھوڑ دی ہے اور گزشتہ سال حاشرہ اور بہو کے ساتھ حج کی سعادت بھی حاصل کر لی ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ شکر ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ کو میرا رونا پسند آ گیا ہے۔ میری یہ خوشگوار زندگی شاید میرے بچے ہوئے آنسوؤں اور اشکوں کا خراج ہے۔



بہت مصروف ہو گئی۔ میں نے ساتھ ساتھ کپڑوں کی منائی کا کام بھی جاری رکھا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔

ایک دن خبر آئی جس فیکٹری میں ناصر کام کرتے تھے وہاں اچانک آگ لگ گئی اور کئی ورکر جل کر لقمہ اجل بن گئے۔ ان جلنے والوں میں ناصر بھی شامل تھے۔ انہیں کراچی میں ہی دفن دیا گیا تھا۔ ناصر میری ساس کا اکلوتا بیٹا تھا، ان کی وفات کا سن کر انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ ہر وقت اپنے بیٹے کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کے مرنے کا غم اور اثر دل پر بہت لیا اور دو ماہ بعد وہ بھی چل بسیں۔ مجھے ان کا بہت آسرا تھا، اب میرا وہ آسرا بھی چھن گیا تھا۔ میرے بچے ابھی چھوٹے تھے اور اپنی داوی سے بہت مانوس تھے۔ مجھے ساس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی مگر اللہ نے مجھے ہمت اور حوصلہ دے دیا۔ چھوٹے چھوٹے تین بچوں کا ساتھ تھا۔ معقول تنخواہ مل جاتی اور ساتھ سلائی کے پیسے بھی آ جاتے۔ مکان اپنا تھا تو ہماری گزر بسر بہت اچھی ہو رہی تھی۔ میں نے تینوں بچوں کو سکول داخل کروا دیا۔ شام کو خود بھی انہیں پڑھائی۔ بچوں کو بچپن سے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ ساتھ قرآن پاک ناظرہ بھی پڑھائی۔

میں نے اپنے جذبات کو پکھل دیا تھا۔ جب رات کو بچے سو جاتے تو میں بہت روتی۔ کبھی اپنے باپ کو یاد کرتی، کبھی اپنی ماں کو، کبھی اپنی ساس کو اور کبھی اپنے شوہر کو۔ روتے روتے میری آنکھ لگ جاتی۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا، میرے بچے جوانی کی حدوں میں داخل ہونے لگے اور میرے سر میں چاندی اترنے لگی۔ مجھے گریڈ انیس مل گیا تھا اور تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ بچوں کے مشورہ سے میں نے ایک بوتیک کھولی لیا تھا۔ اب میں خود سلائی تو نہیں کرتی تھی کپڑوں کی سلائی کے لئے



بھیگے یا بے کار دی؟

ان لڑکیوں نے ہماری روزی پر لات مار دی ہے اور، راپیشہ سنبھال لیا ہے۔ ہمارے لئے اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں بھلیب یا بدکاری۔

لاہور

حکایت ادب سنہ 1441ھ

تھے اور سرکاری کام کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران ڈپٹی کمشنر صاحب دفتر کے کام بھی کرتے جاتے تھے۔ اسی دوران انٹرکام پر اُن کے سیکرٹری نے کسی ملاقاتی کے لئے وقت مانگا تو انہوں نے کہا کہ ایک گھنٹے بعد بھیجنا اور صرف پانچ منٹ کے لئے۔ پھر وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد ان کے سیکرٹری نے پھر اس ملاقاتی کی یاد دہانی کروائی۔ انہوں نے کہا کہ بھیج دو اور اسے تاکید کر دو کہ پانچ منٹ سے زیادہ نہ بیٹھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک بڑی خوبصورت لڑکی کمرے میں آئی۔ اس نے جینز پہنی ہوئی تھی۔ آدھی آستین کا بنیان پہنا ہوا تھا اور بڑی خوبصورت عینک لگائی ہوئی تھی۔ ایک کندھے پر کیمرہ لٹکایا ہوا تھا، دوسرے کندھے پر بیگ تھا۔ بڑی شاہانہ چال کے ساتھ چلتی ہوئی آئی اور انگریزی زبان میں اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ جرمنی سے آئی ہے۔

مئی 2020ء کے شمارے میں ایک کہانی ”ادھورے انسان“ سیدہ شاہدہ شاہ صاحبہ کی نظر سے گزری۔ بہت اچھی اور با مقصد کہانی تھی جو ایک منٹ کے گرد گھومتی ہے۔ اس کو پڑھ کر مجھے بھی ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

میری بیوی کے ایک کزن نے آج سے بیس پانچ سال پہلے مقابلہ کا امتحان پاس کیا اور سندھ سیکرٹریٹ میں ملازمت شروع کر دی۔ آج کل وہ سندھ ٹورنمنٹ میں گریڈ 21 کے آفیسر لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک فوجی محفل میں یہ قصہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں انہیں اندرون سندھ کے شہروں میں جانا پڑتا تھا اور مختلف محکموں کے سربراہوں سے ملنا پڑتا تھا۔ کئی دفعہ شہر کے ڈپٹی کمشنروں سے بھی ملاقاتیں کرنی پڑتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے پاس بیٹھے ہوئے

دعوت دے دی اور پوچھا۔ کیا آپ پاکستانی کھانے لہنت ہیں؟ اور کون سی ڈش زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا۔ وہ پاکستانی ڈشز بڑے شوق سے کھاتی ہے مثلاً کڑا ہنی گوشت، کباب، قورمے اور روغنی نان وغیرہ وغیرہ۔ اس سے پوچھا گیا کہ آپ اتنی دور سے اکیلی یہاں تک پہنچی ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگا۔ کسی نے اکیلی لڑکی دیکھتے ہوئے تنگ کیا ہو؟ یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہو؟ کہنے لگی۔ میں جب پُر اعتماد طریقے سے بات کرتی ہوں تو کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ دوبارہ بات کرے۔ یہاں پر دل پھینک لوگ بہت ہیں۔

آخر میں ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا کہ شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گی اور مجھے بھی دعوت دی کہ آپ بھی آئیں۔ لڑکی سے کہا کہ میرا ڈرائیور شام کو آپ کے پاس آئے گا، اُس کے ساتھ آ جائیں۔ اس لڑکی نے کہا کہ اگر میں جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میرا تم سے پکا وعدہ ہے۔ ”سرا! جو پیسے آپ میرے کھانے پر ہوں میں خرچ کریں گے اور تحفہ بھی دیں گے جو پاکستانیوں کی روایت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تمام پیسے مجھے نقد دے دیں۔“

”اس کی کیا وجہ؟“ کمشنر صاحب نے پوچھا۔ ”آپ مجھے جو سمجھ رہے ہیں میں وہ نہیں ہوں۔“ اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ ”میں ایک محنت ہوں۔“ یہ سن کر ڈپٹی کمشنر صاحب غصہ میں آئے اور کہا میں تمہیں ابھی گرفتار کراتا ہوں۔ تم مجھ جیسے کتنے آدمیوں کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔ ”سرا! میں آپ سے پہلے جان کی امان کا وعدہ لے چکی ہوں۔“ اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

یونیورسٹی کی طالبہ ہے، ٹورسٹ بھی ہے۔ پاکستانی کچھر اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھتی ہے اور وہ سندھ کے آثار قدیمہ دیکھنا اور ان کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے کہ آپ محکمہ آثار قدیمہ والوں سے میرا تعارف کروادیں اور ان کا پتہ بتادیں۔

”میں پاکستان اور دین اسلام سے بھی دلچسپی رکھتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اردو بھی سیکھ لی ہے۔ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے ان کا کلام بھی یاد ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اشعار سنانا چاہتی ہوں۔“

جب ڈپٹی کمشنر صاحب نے اسے اجازت دے دی تو اس نے اردو میں باتیں کرنا شروع کر دیں اور ایسے ایسے اشعار سنائے کہ ہم حیران رہ گئے۔ اس کی گفتگو بڑی متاثر کن اور دلربا تھی۔ کمشنر صاحب اتنے ریشہ نشین ہو گئے کہ اس کے لئے چائے اور بسکٹ منگوا لئے۔ اس نے اپنے کمرے سے ان کی تصویر لی اور کہا کہ وہ جرمنی جا کر جو مضمون لکھے گی اس میں شائع کرے گی۔ اس نے اسلام کے بارے میں جو باتیں بتائیں اس میں قرآن اور احادیث کے حوالہ جات بھی تھے۔ پاکستانی ڈراموں اور فلموں کے بارے میں بھی اس کی معلومات تازہ ترین تھیں۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے اس سے بہت سے سوالات کئے جن کے جوابات اس نے بالکل ٹھیک دیے۔ جب اس سے پوچھا کہ اس کا یہاں کہاں قیام ہے؟ اس نے ایک بہت اچھے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بھی بتا دیا۔ وہ پانچ منٹ کے لئے آئی تھی لیکن آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا اور ملاقاتی بھی باہر انتظار کر رہے تھے۔ آخر میں ڈپٹی کمشنر صاحب اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کو شام کے کھانے کی

پیٹ بھر لیتے تھے لیکن آج کل ان کی بُری حالت ہے اور یہ بڑی بڑی سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ بعض بدکاری کی طرف بھی مجبوراً نکل ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایک خواجہ سرائے نے شکوہ کے انداز میں کہا۔ ”ہم لوگ اب کیا کریں اور کیسے کما کر پیٹ بھریں؟“

اب شریف شرفاء گھرانوں کی بہو بیٹیوں نے خود ہی رقص اور گانے میں مہارت حاصل کر لی ہے اور بڑی بے باکی سے شادیوں وغیرہ کے فنکشن پر سب کے سامنے ناچتی ہیں۔ ان کی ویڈیو بھی بنتی ہے جو بعد میں سب رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے اور سب اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان لڑکیوں نے ہماری روزی پر لات مار دی ہے اور ہمارا پیشہ سنبھال لیا ہے۔ ہمارے لئے اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں بھیک یا بدکاری۔

نوکری کوئی دیتا نہیں، ہر جگہ ہمیں تنہیک اور طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اگر ہم ایسے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہم بھی اللہ کی مخلوق ہیں ہمارے ہاتھ پیر سلامت ہیں حکومت اگر چاہے تو ہمیں کارآمد پاکستانی بنایا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم میں ایک آل راؤنڈر کھلاڑی کیپٹن تھا اس نے اکیلے ہی بارہ اپنی ٹیم کو کامیابی دلائی وہ ہماری برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم میں بھی دم ہے اور ہم کسی سے کم نہیں، موقع تو دیا جائے۔



یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ کے پی کے حکومت نے ان خواجہ سراؤں کو اس کام کے لئے ملازم رکھ لیا کہ جو قرضے لے کر واپس نہیں کرتے۔ یہ لوگ ان کے گھروں کے سامنے اپنے انداز میں خوب شور شرابہ کرتے ہیں اور نادہندگان کو قرضہ واپس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ڈپٹی کمشنر صاحب وقتی طور پر غصہ میں آئے لیکن نوکری طور پر اپنا وعدہ یاد آیا اور اسے معاف کرتے ہوئے اس کی فنانسنگ صلاحیتوں کی داو دی اور ساتھ اسے ایک خطیر رقم دی اور ڈرائیور سے کو کہا کہ اس نے جہاں جانا ہے اس کو چھوڑ کر آؤ۔

ڈپٹی کمشنر صاحب آج کل ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ میں جب اپنے کزن سے بات کرتا ہوں تو اس واقعہ کی تجدید ضرور کرتا ہوں۔

بعض محنت بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں۔ اس طرح آج کل ان مخنثوں کی جو صدر سے اس کا نام پروین بوبی ہے۔ جو بڑی خوبصورت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اس کو کوئی دفعہ ٹی وی پر دیکھا ہے۔ اس کی باتیں بڑی پُراثر ہیں۔ اس نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اس کو بڑے بڑے لوگ اپنے فنکشنوں میں بلوانے میں عزت محسوس کرتے ہیں۔ وہ بڑی صاحب ثروت ہے اور مخنثوں کی فلاح کے لئے کوشش کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس کی کارروائیوں کی تفصیلات آتی رہتی ہیں۔

بعض لوگ ان تیسری دنیا کے لوگوں کی بڑی عزت اور توقیر کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو تنگ نہیں کرنا چاہئے اور ان سے دعا کیے کروانی چاہئیں۔ اس کے بارے میں خدا بہتر جانتا ہے۔

تاریخ میں بھی خواجہ سراؤں کا ذکر آتا ہے جو بڑے زبردست لڑاکا اور فن حرب و ضرب کے ماہر تھے۔ قوت میں عام مرد حضرات سے کہیں بڑھ کر تھے۔ ان خواجہ سراؤں کو شاہی زمان خانے میں بیگمات کی محافظت کے لئے رکھا جاتا تھا۔

کوئی وقت تھا کہ یہ لوگ شادی بیاہ، لڑکا پیدا ہونے پر اور خوشی کے دوسرے مواقع پر ناچ گا کر اپنا

الافہووی محبت

حالات میں بڑا عجیب اور نہایت قابل یقین نمود آ گیا مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مریم کی قربانی اور لٹنی کی مہربانی کی وجہ سے زندگی میں ٹھہراؤ آ رہا ہے۔ لیکن ایک دن میرے ساتھ ایک عجیب انہوتا اور دلخراش واقعہ ہو گیا۔

آخری قسط

راولپنڈی

راوی: راجہ شیر حسن

محمد رمضان مجوم



شریف، خوبصورت لڑکی ہے اور تیرے ساتھ خوب بیٹھے گی۔“

”لیکن میں اس دل کا کیا کروں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے دل میں تو مریم جیسی ہوئی ہے۔“

”دیکھ شیر! مجھے غصہ نہ دلا اور جو میں کہتا ہوں مان جا۔“ حکیم نیاز نے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تیری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اس کا وہ حال کرتا کہ دنیا دیکھتی۔ تو نے میرے گھر کی عزت پر شب خون مارا ہے، میری دوستی کا بھی خیال نہیں کیا۔ میری بہن اپنے گھر میں اکیلی تھی، تو نے اس کی معذوری اور سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے اپنی طرف مائل کر لیا۔“

”اگر میری نیت میں فتور یا کھوٹ ہوتا تو میں اس کی عزت پر بہ آسانی ہاتھ ڈال سکتا تھا۔“ میں نے اسے کہا۔ ”لیکن میری نیت نیک اور ہماری محبت پاکیزہ ہے۔“

”کیا خاک پاکیزہ ہے؟“ اس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کبھی مجھے بابا کو اس بارے بتایا؟“ پھر اس نے تیز تیز سانس اپنے سینے میں کھینچنے شروع کئے اور غصے بھرے سرخ دہیوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اپنا تو تیز میری اور سیکن کی شادی کے بارے میں لیا خیال ہے؟“

اب میں بھی اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا، میں نے اسے کہا۔

”حکیم تجھے یہ بات، غوی معلوم ہے کہ میری زبان تجھ اور مجھ سے تقریباً پندرہ سولہ سال چھوٹی ہے تو بھی اس کے لئے بے جوڑ ہے اور میں بھی۔“

”کیوں میرے میں کیا نمی ہے؟“ اس نے نفریہ انداز میں کہا۔ ”کیا جوان، خوبصورت اور برسرِ روزگار نہیں ہوں اور ویسے بھی تو بتا کہ تجھے مجھ سے اچھا کوئی

میرا دل چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں یا آسمان ہی مجھے اوپر اٹھا لے۔ حالانکہ صرف میں ہی قصور وار نہ تھا۔ مریم دل و جان سے محبت کے اس کھیل میں شامل تھی لیکن پھر بھی میں شرم سے مرا جا رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کون سی ایک ایک بات؟“

”اُس نے جھٹکے سے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا کہ تیرے اور مریم کے درمیان چا چا طیفہ کے گھر یہ..... یہ باتیں نہیں ہونیں۔ اس نے میرے سامنے سارا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اُس نے وہ باتیں اور ماحول بھی بتایا جو وہاں ہوا تھا۔ میں وہاں اپنی صفائی کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے انتہائی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری بولتی بند ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے ایک تھڑے پر بٹھا کر کہا۔

”یہ بات میں تجھے ابھی تک بھائی چارے اور دوستی کے ناطے کہہ رہا ہوں۔ تو نے اگر بھلیں سے شادی کرنی ہے تو کر لے لیکن میں کسی قیمت پر بھی تیری شادی اپنی بہن سے نہیں ہونے دوں گا۔“

میرے اندر جانے کہاں سے اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”میرے سامنے میرا یہ راز کھل ہی گیا ہے کہ میں اور تیری بہن نے آپس میں محبت اور شادی کا وعدہ کر لیا ہے تو میں بھی کسی قیمت پر اپنے وعدہ سے پھر نہیں سکتا اور مریم بھی ہر قیمت پر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”وہ چاہے یا نہ چاہے لیکن میں دل سے یہ نہیں چاہتا۔“ اس نے اڑیل انداز میں کہا۔ ”اور جس کام کو میں من سے نہیں چاہتا وہ بھی بھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔“ اس کے بعد اس نے مجھے بھانا شروع کر دیا۔

”دیکھ شیر! تو میرا یاد ہے اور میں تیرے بھٹکے کی بات کروں گا۔ بھیس بہت خوبیوں کی حامل، خدمتگار،

دے۔ کیونکہ اس نے میرے سامنے کئی نہ ہونے والے کام اپنی ضد سے کھتا کے ذریعے کئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے امراں کمار نور لالہ جی کا انجام گھونٹنے لگا۔

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“

اس سوال کا جواب بار بار میرا دل میرے ذہن سے مانگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ضدی مصیبت سے کیسے جان چھڑائی جائے۔ دراصل بات وہیں آ کر ختم ہو جاتی تھی کہ میں اُس سے زیادہ الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نے بھی مریم کو ہر سورت حاصل کرنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اس بات میں وزن تھا کہ میں نوکری چھوڑ کر کوئی اپنا کاروبار شروع کروں کیونکہ واقعی نوکری میں رہ کر میں اپنا کوئی اچھا مستقبل نہیں بنا سکتا تھا۔ حکیم واقعی سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنے کاروبار میں کافی روپیہ کمانے کے علاوہ دن دو گنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا لیکن وہ جس راستہ پر چل رہا تھا میں اس پر نہیں چل سکتا تھا اور نہ ہی دل ماننے والا تھا۔

میں نے یہ تو قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں سرکاری نوکری کو چھوڑ کر اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار کروں گا۔ میں ابھی مصطفیٰ حکیم کو پوری طرح ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے کئی کاموں میں مدد چاہئے تھی کیونکہ وہ دفتری اور کاروباری معاملات میں چالاک ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے بھی اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر کچھ ایسے کام کئے جن کو کرنے کا میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ مثلاً وہ مجھے رستم خان کے اڈے میں لے گیا وہاں میں نے لڑکیوں سے کچھ بے تکلفی کا اظہار کیا اور ان سے ہمیں ماریں۔

وہاں مجھے خواہ مخواہ رسم خان نے کہا کہ ٹو عدالتوں، کچہریوں میں اس کے ان غنڈوں کے

اور رشتہ سیکندہ کے لئے ملے گا؟“

”ملے یا نہ ملے تجھے اس سے کیا مطلب؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”دیکھ شہباز! تو مجھ سے ضد اور اڑ پھنس نہ لگا۔“ اس نے طیش میں آنے کی بجائے میری پشت پر ٹھونکا مارتے ہوئے کہا۔ ”تو بہ خوبی جانتا ہے اور یہ بات دیکھ بھی لی ہے کہ میں جو سوچتا یا کہتا ہوں اسے ہر صورت میں پورا کرتا ہوں۔۔۔ تو اپنے دل میں جو مرضی سوچ لیکن یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی تیری شادی مریم سے نہیں ہونے دوں گا اور ہاں اگر تو نے بقیس کو اپنانا ہے تو سو بسم اللہ اور دوسرے میں تیری آنکھوں کے سامنے سیکندہ کو اپنانا کر چھوڑوں گا۔“

”تو پھر میری بات بھی کان کھول کر سن لے۔“ میں نے بھی دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں بھی اپنی زندگی میں تجھے تیرے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے پدے!“ اس نے حقارت بھری لہجے میں کہنا۔ ”مردوں والا ہاتھ ملا۔۔۔ دیکھتے ہیں ضد اور اتار کے ہیل میں کون کامیاب ہوتا ہے۔ اب اپنے قدموں کی زمین سے چھوڑنا بزدل!“ اس نے زبردستی میری ہاتھ پکڑ لیا۔

میں جواہر کچھ بھی نہ بولا۔ بس خاموش ہی رہا۔ وہاں خلاف توقع میرے اور حکیم کے درمیان بقیس، مریم، سیکندہ کی شادیوں کے معاملہ میں کھپاؤ اور تناؤ ضرور رہا لیکن بات لڑائی جھگڑے تک نہ پہنچی۔

”کی اناں! تو میرے ساتھ میری دکان پر چل۔“ اس نے مجھے کہا۔ ”اس بحث کو بعد میں دیکھیں گے۔“

میں دل ہی دل میں اس بات پر خوف زدہ اور پریشان تھا کہ یہ خطی، ضدی اور پُر اسرار خلوک کا حامل آدمی ہے یہ نہیں مجھے یا سیکندہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا

”پس تیری بہن کو خوش رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”میں اسے اپنا سہارا دوں گا۔“

”تو اسے سہارا دے گا؟“ وہ یہ ہمہ کہہ کر ہنسا اور
 کہنے لگا۔ ”کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ کان کھول کر
 سن لے، تیری سریم کے ساتھ شادی ناممکن ہے البتہ
 بلیس کے لئے تو راضی ہو جائے تو سو بسم اللہ۔“

”جدا نے چاہا تو بلیس سے شادی کبھی نہ ہو
 گی۔“ میں نے طیش میں کہا۔
 ”سکینہ کو میں ہر صورت میں حاصل کر کے رکھوں
 گا۔“ اس نے بیٹے انداز میں کہا۔

”میں بھی اپنی زندگی میں کبھی بھی تیری شادی
 سکینہ سے نہیں ہونے دوں گا۔“ میں نے بھی حکیم کو
 جوابی طور پر غصہ سے کہا۔

”شعبہ تو مجھ سے ازپس نہ لگا۔“ حکیم نے کہا۔
 ”ضد نہ کر تو مجھے جانتا نہیں ہے کہ میں پہلے والا حکیم
 نیاز نہیں رہا۔ میرے اندر اب گروہاں کے دیئے ہوئے
 کٹا کی طاقت ہے جو ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتا ہے۔“
 ”سکینہ کو حاصل کرنے کا تیرا تصور خواب ہی
 رہے گا۔“ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے
 ہوئے کہا۔

عین اس وقت اتفاق سے رستم خان اپنے
 بد معاش بندوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔

”میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔“ اس
 نے اپنی گھٹی مونچھوں کو مر دڑا دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ
 بڑی بد تمیزی سے مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”اھر آ بے
 چھو کرے!“ وہ مجھے حکیم سے علیحدہ ایک جگہ لے گیا اور
 کہنے لگا۔ ”تو اس کی بات مان لے، یہ جو تجھے لونڈیا بتا
 رہا ہے اس سے بیاہ کر لے اور جس سے یہ چاہتا ہے
 اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن ورنہ۔“ اس نے بات
 ادھوری چھوڑ دی۔

ساتھ رہے گا جو مذکورہ دکان کی رجسٹری کروانے میں
 مددگار ہوں گے۔

حکیم مجھے اپنی دکان پر بھی لے کر گیا۔ وہاں میری
 ملاقات ساتھ والے جند و دکاندار سے بھی ہوئی۔ وہ بھی
 ایسے تہن بہت پریشان تھا۔ وہ دکان واقعی بہت باموقع
 اور کاروباری لحاظ سے بہت منافع بخش تھی۔ علاقہ
 ارد گرد کے کافی ہندو کاروباری لوگ آئے انہوں نے
 حکیم سے استدعا کی کہ وہ اس دکان کو نہ خریدے لیکن
 حکیم نے انہیں رغب سے کہا کہ میں ہر قیمت پر یہ دکان
 خالی کراؤں گا۔ وہ کاروباری لوگ تھے اور لڑائی بھڑائی
 سے ان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے وہ خوف زدہ
 ہو گئے۔

دوسری طرف میں اپنے طور پر پچھتا رہا تھا کہ میں
 لیوں اس گندے کھیل میں پڑ گیا ہوں۔ میں خدا سے
 دعا کر رہا تھا کہ وہ مجھے جلد سے جلد اس امتحان سے
 نکالے۔ تین چار روز بعد رستم خان نے لالہ کے بیٹے کو
 پچھری لے جا کر اس سے ضروری کاغذات پر دستخط اور
 بیانات دلو کر دونوں دکانیں حکیم کے نام کر دلائیں۔ ان
 لوگوں نے مجھے پچھریوں، عدالتوں، اشقام کھٹے وغیرہ
 میں ساتھ ساتھ رکھا۔

اس نے مجھے پچھری میں خوب استعمال کیا۔ نہ
 جانے کہاں کہاں مجھے بیانات اور دستخطوں کے لئے
 دوڑایا بھگایا گیا۔ دکانیں اپنے نام کروانے کے بعد وہ
 مجھے رستم خان کے ذمے میں لے کر گیا۔ وہاں پھر
 سے اس نے سکینہ کے بارے میں باتیں شروع کر
 دیں۔ میں نے اسے جبر پور انداز میں انکار کیا تو اس
 نے میری طرف طنزیہ اور مذاق بازیاتے ہوئے نگاہ ڈالی
 وں بولا۔

”تو میری بہن کے لئے کیا کر سکتا ہے تیرے
 ہاتھوں میں اس ٹوٹی پھوٹی نوکری کے سوا کچھ ہی کیا؟“

میں پہلے ہی ذہنی طور پر پریشان اور تپا ہوا تھا۔ میں نے اس وقت یہ نہ دیکھا کہ میں علاقہ کے ناہی گرامی بد معاش کے ذریعے پرکھرا ہوا ہوں۔ میں نے ایک ٹھکے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے آپ ہمارے گھریلو معاملات میں نہ پچھلے۔“

میں نے کوئی اس کے غم دماغ پر غصہ پانی والے پیرتیم خان نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”یہ تو اہل رہا نہیں۔“

اس کے ذریعے میں موجود بد معاشوں نے شغلیہ انداز میں میرے جسم پر کئی لوٹے پانی کے انڈیل دیئے۔ سیکم نے مجھے ان کے چنگل سے چھڑاتے ہوئے کہا کہ ”ٹو اٹھی یہاں سے جا اور میں نے تجھ سے جو باتیں لگی ہیں، ان پر غصہ ہے بے سوچنا۔ میں جب وہاں سے اپنی جان بچا کر ڈیسے سے باہر جانے لگا تو مجھے رستہ میں روک لیا۔“

”بات سن اونے لوٹے!“ اس نے کڑھتے بچے میں کہا۔

ساتھ ہی ہم۔۔۔ میں؟ میں ایک دم گھبرا گیا۔

”یہ بڑی کی طرح نہیں مہیں نہ کرو۔“ اس نے مونچھوں کو تاتا دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے ہی بات کر رہا ہوں۔ یہ حکیم بڑا ضدی اور اڑیل ہے، جس بات پر ایک بار اڑ جائے پھر منوا کر ہی دم لیتا ہے اور اب تو وہ اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کوئی بوائی مخلوق گھس گئی ہے اور پھر میں بھی اس کے پیچھے ہاتھ رکھے کھڑا ہوں۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ جو وہ کہتا ہے شرافت سے مان جاؤ نہ۔“

یہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ حکیم اپنی ضد کا پکا اور بے رحم بندہ ہے۔ یہ لازماً سیکم کو حاصل کرنے کے لئے اپنے تئیں بہت تک و دو کرے گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے شیطانی کام دیکھ لئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ہیزڈ بڑ میں اپنی یونٹ میں اپنا استعفیٰ لکھ کر دیا۔ پھر سے چند ہندو ساتھیوں نے مجھے ایسا کرنے سے روکا لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ میں ذہنی طور پر کتنا پریشان ہوں۔ خود استعفیٰ لکھ کر دینے کے بعد اس زمانہ میں سرکاری طور پر یہ قانون تھا کہ نوکری چھوڑنے والے کو اس وقت تک کلیئر سرٹیفکیٹ نہ دیا جاتا تھا جب تک متعلقہ ملازم اپنی ڈیوٹی کا تمام چارج مجاز آفیسر، سپرنٹنڈنٹ کو نہیں دے دیتا تھا۔ مجھے وہاں تقریباً ایک ماہ رکنا تھا۔ میرا ذہن کئی پریشانیوں میں گھرا ہوا ادھر ادھر کی سوچ رہا تھا۔ کبھی مجھے حکیم کی جانب سے دی گئی دھمکیوں کا خیال آتا تو دوسری طرف میرا ذہن مریم، سیکم کی طرف جاتا۔ اس دوران مجھے یہ خبر بھی ملی کہ رستم نے اپنے غنڈوں کی مدد سے حکیم کے ساتھ والی ہندو گریبانے والے کی دکان خالی کروالی ہے اور وہاں اس کا سپارا سامان سڑک پر پھینک دیا ہے۔ یہی نہیں یہ بھی سنا گیا کہ اس علاقہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان بہت کچھ آذناؤں ہے۔ کسی نے بتایا کہ حکیم کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

ایک دن میرے گاؤں سے میرے ابا کا یہ خط ملا کہ ”نو جلدی سے گھر آ۔ کیونکہ آج کل نہ جانے کیوں سیکم رات بھر سوتی نہیں ہے اور وہ دن رات بے چین پاگلوں کی طرح پھرتی رہتی ہے اور وہ کبھی کبھار بہت بلند آواز میں چلاتی ہے۔ ابا نے مجھے یہ بھی تاکید کی کہ یہ خط پڑھتے ہی آ جا۔“

یہ خبر پڑھتے ہی میری پریشانی کے گراف میں مزید اضافہ ہو گیا، کیا جائے؟ میرا ذہن اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ کیونکہ میں نے اگلے دن اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے میجر شمل کے پاس جانا تھا۔ اس نے مجھے خصوصی طور پر بلایا تھا۔ دوسری جانب مجھے

ہے۔“

”کل اس کے گاؤں کا ایک لڑکا ماجھا آیا تھا۔“
انسان ورمیان میں بولی۔ ”اس کا کہنا تھا کہ چند دن پہلے
اسے حکیم ملا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر ان لوگوں
نے (یعنی ہم نے) اسے سیکھ نہ دیا تو میں اپنے
اندروں کو جو کھانا کے ذریعہ اسے قابو کرواؤں گا۔“

وہاں برادری کے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ وہ
فوری طور پر میرے ساتھ پشاور شہر چلیں گے جہاں وہ
حکیم کو جان سے مار دیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ
صرف زبانی جمع خراج کر رہے ہیں عملی طور پر کوئی کچھ
نہیں کرے گا۔ یہ محض بروہیں مارنے والے لوگ تھے۔
”خدا کے لئے اس وقت تم لوگ اپنے جذبات پر
قابو رکھو۔“ میں نے سب سے کہا۔ ”ہمیں فی الحال سیکھ
کے علاج کے لئے اس عمل کو سمجھنے اور تونے والوں سے
رابطہ کرنا چاہئے۔“

میں نے انہیں واصل یہ بات کہہ کر ملا تھا۔ میں
فوری طور پر حکیم کے دوست ماجھا کے پاس گیا۔ وہ
طبیعت کا کچھ ہمدرد اچھا انسان تھا۔ ماجھا نے ہمیں بتایا
کہ وہ حکیم کا گہرا دوست ہے۔ اس نے یہ بات اسے
بتائی تھی لیکن میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔
میں نے ماجھے سے اس کی بہن مریم کا ذکر کیا کہ وہ مجھے
کسی طرح اس سے ملوا دے یا میرا اسے پیغام پہنچا
وے۔ ان حالات میں ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

ماجھا ایک تیز طرار اور کسی حد تک ہمدرد مخلص
انسان تھا۔ اُس نے اپنی بہن کے ذریعہ میرا پیغام مریم
کو پہنچا دیا۔ وہ گولی کی طرح اپنی سہیلی لبتی کے ساتھ مجھ
سے ملنے ایک مخصوص جگہ آئی۔

ہم دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے، میں نے اسے
تفصیل سے ساری بات بتائی کہ حکیم میری کزن کے
پیچھے پڑ گیا ہے اور وہ ضد کرنے کے علاوہ مجھے وھمکی

سیکھنے کی بھی فکر تھی۔ میں نے بہر حال اپنے ضروری
سرکاری کاموں کو پس پشت ڈالا اور میں سیدھا اپنے
گاؤں کے گھر پہنچا تو وہاں واقعی سیکھنے کی وافی حالت
انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بھینٹ جیج
ماری۔ اس طرح بیسے کہ وہ مجھے دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ یہی
نہیں اس نے ہمارے گھر کا سارا سامان تتر بتر کر کے
رکھا ہوا تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی انتہائی خراب تھی یعنی
اس نے اپنے کپڑے جگہ جگہ سے پھاڑے تھے اور بال
بے ترتیب اٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے گھر میں
اور دُرد گئے پڑوسیوں، برادری کے لوگوں کا تانا بندا
ہوا تھا۔ ابا نے میری شکل دیکھتے ہی مجھے گالیاں دینا
شروع کر دیں۔ ”کی نہیں بلکہ اوس پڑوس برادری کے
لوگ بھی میرے پیچھے پڑ گئے۔“

”تو اب آیا ہے جب ہم بالکل تباہی کے وصال
پر کھڑے ہوئے ہیں۔“ ابا نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تیری
وجہ سے ہو رہا ہے۔“

”میری وجہ سے کیوں؟“ میں نے حیران ہو کر
کہا۔

”یہ سب تیرے دوست حکیم کی کارستانی ہے۔“ ابا
نے غصے سے کہا۔ ”وہ تم بخت اس پر اے سیدھے مل
کر کے اس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا
ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ میں نے جھنجھلا کر
پوچھا۔

”ہم نے اسے شہر کے قابل ڈاکٹروں، حکیموں
اور جاہد عملیات کا حساب کرنے والوں کو رکھایا۔“ ابا
نے سخت غصہ سے کہا۔ ”ڈاکٹروں حکیموں نے تو اسے
واپس دیا لیکن اوپر کی اشارات کے ماہرین یہی کہتے
ہیں کہ اس پر کوئی عاشق ہے اور شیطانی عمل کروا رہا
ہے۔ بلکہ ایک۔“ نے تو تیرے دوست حکیم کا حلیہ بھی بتا دیا

غریب لوگوں کی عزتوں سے کھینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ معصوم، غریب اور مجبور لڑکیوں کو چند نکلے دکھا کر انہیں درغلا تے ہیں۔ بلیقےس کیونکہ بہت خوبصورت، وجہہ شکل

ہے، اس لئے اس پر کافی عیاش ہندوؤں کی نظر تھی۔ یہ خود بھی روپیوں پیسوں کی لالچی تھی اور پیسوں خاطر عیاش مادر ہند سکھوں کو ادا نہیں دکھا کر انہیں نلچاتی۔ اس کے بارے میں ایک آدھ شکایت ملی۔ اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے بدوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی

لیکن یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ ہوس کے شکاریوں کے لئے بلیقےس آسان شکار تھی۔ وہ اپنا کھیل کھیلتے کھیلتے ہوس کے پجاریوں کا کھلونا بن گئی۔ ایسی باتیں چھپی کتب رہتی ہیں۔ اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے بلیقےس گاؤں میں بدنام ہو گئی۔

”تم بہت سیدھے سادے ہوشیر!“ آخر میں مریم نے کہا۔ ”تمہاری اسی سادگی کی وجہ سے میرے ابا اور بھائی یہ گندہ کاٹو کر تمہارے سر پر سوار کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ شاید مریم میرا دل بلیقےس کی جانب سے کھٹا کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس بات کی تصدیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب مریم اور لٹی وہاں سے چلے گئے تو میں نے معراج سے بلیقےس کے کردار کے بارے میں اس کی تصدیق چاہی تو اس نے مریم کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی واقعی پیسوں کی خاطر اپنا سب کچھ بیچنے پر تیار ہوتی ہے۔ اس مقام پر آ کر میرا دل مکمل طور پر بلیقےس کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔

میں دوسرے روز سیکنہ کو راولپنڈی شہر کی جامع مسجد کے خطیب کے پاس لے کر گیا۔ وہ جنات اور علمیات کے توتے کے ماہر تھے اور روحانی علاج کرتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس بچی پر

دے رہا ہے کہ وہ کسی صورت بھی مریم سے میری شادی نہیں ہونے دے گا اور وہ سیکنہ کو حاصل کر کے رہے گا۔ بلیقےس کا بھی میں نے اس سے ذکر کیا۔

”جہاں تک سوال تمہاری اور میری شادی کا ہے، میں اس کے لئے اپنی جان دے دوں گی۔“ مریم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو تم اس بات کا یقین رکھو کہ میں تمہاری خاطر اپنے ماں باپ، بھائی تک کو چھوڑ دوں گی۔“

میں نے بھی اسے پورا یقین دلایا کہ میں تجھے کسی بھی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے اپنی عقل، حوصلہ سے میرا ساتھ دینا ہے۔

”تم سیکنہ کو راولپنڈی شہر میں جامع مسجد کے خطیب کو دکھاؤ۔“ مریم نے مجھے مشورہ دیا۔ ”وہ بڑے نام فاضل بزرگ ہیں اور اللہ کے کلام سے اس کا علاج کریں گے بلکہ خود تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

میں نے اس کو منع کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بات کا علم حکیم کو ہو جاتا تو معاملہ مزید بگڑ جاتا تھا۔

”ایک بات تو بتاؤ مجھے مریم!“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ تمہارا بھائی حکیم اور ابا بلیقےس کے ساتھ میری شادی پر اتفاق دیکر ہیں؟“

”یہ بھی ایک راز ہے۔“ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں کو کھولنے کا اب شاید وقت آ گیا ہے۔“

اس نے میرے سامنے بلیقےس کے بارے میں جو افشاش کیا وہ خاصا فسوس ناک تھا۔ اس نے جو بتایا وہ خوفناک تھا۔

بلیقےس بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ یہاں کے مادر ہندو مسلمان اور سکھوں کے گھروں میں چاکری کرتی تھی۔ یہاں کے والد اور عیاش مقامی لوگ

ایک دن ہمارے گاؤں کے تمام بڑوں نے مجھے ایک جگہ نمائشنگ میں یہ حکم دے دیا کہ مجھے اس لازمی سیکینہ سے شادی کرنی ہوگی۔ اس جگہ میں میرا بیاہنا تھا اور گاؤں کی سجدہ کے امام مولوی صاحب پیشہ تھے۔ برادری کے چند بزرگ بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں کہا۔ مجھے ابھی پشاور اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے جانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد شادی تاریخ دے دوں گا۔ بڑی مشکل سے میں نے ایک ہفتہ نہیں ملا۔

”یہ تیری سیکینہ سے شادی کی آخری تاریخ ہو چاہئے۔“ ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اب آئی تیرا کوئی حیلہ بہانہ نہیں چلے گا۔“

میں دوبارہ اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے پشاور اپنی یونٹ میں گیا تو وہاں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے غصہ سے کہا۔

”تجھ پر میجر شامل انتہائی برہم ہے۔ اس نے تجھے اپنے دفتر میں بلوایا تھا تو کہاں دفع ہو گیا تھا؟“

میں نے اسے سیکینہ کی حالت کے بارے میں بتایا تو اس نے میرے سامنے ایک اور جواب ملکی پیپر رکھ دیا جس میں مجھ سے کئی سوالات پرانے مقدمہ کے بارے میں درج تھے۔ حالانکہ اس کا تقریباً کرل سپاٹ ہے۔

ہمارے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ اس میں بھی آفس سپرنٹنڈنٹ امرا ل کمار کا ہاتھ اور سازش تھی۔ اس نے جی میرے اور حکیم کے بارے میں افسران کے کان بھرے تھے۔ دراصل اس کا دشمن حکیم کی صورت میں توکل چکا تھا۔

میں گھبرا کر جب میجر شامل کے دفتر میں گیا تو اس نے پہلے تو مجھے خوب ڈانٹا، ذلیل کیا لیکن جب میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو اس کا دل کچھ نرم ہوا۔ اس نے مجھے بہر حال کلیئر سرٹیفکیٹ دے دیا۔ اس سے مجھے

کوئی مرد کا لایم کروار رہا ہے یا خود کر رہا ہے۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے کچھ قرآنی آیات پڑھنے اور نقاش پانی میں ڈال کر پینے اور تعویذ آت دیئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے ساتھ روالپنڈی میں سیکینہ اور میرے دوست کے علاوہ ان کی بیوی بھی۔ وہاں حیرت انگیز طور پر میرے منع کرنے کے باوجود مریم اور غلام حسین بھی آ گئے۔ وہ دھڑلے کی بہت چوکی تھی۔ اس نے اور میرے دوست کی بیوی نے سیکینہ کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا۔

گاؤں آ کر سیکینہ کو معمولی سا قرنی پڑا تھا۔ اس کی کیفیت پہلے سے بدتر تھی۔ میں دماغی طور پر بہت پریشان تھا۔ کچھ کچھ نہیں آ رہا تھا، کہ میں کیا کروں۔

کیونکہ میں نے ایڑیا میجر شامل کے پاس اپنے کلیئر سرٹیفکیٹ کے لئے جانا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے آفس میں مجھ سے ملاقات بھی کرنی تھی۔ مجھے یہ ڈر اور

ندیشے ڈتے رہتے تھے کہ نہ جانے پیچھے میرے کام کا کیا بنا ہو گا۔ مریم کی محبت مجھے الگ ستانی تو سیکینہ کی دماغی حالت سے بھی میں بہت دل گرفتہ تھا۔

دوسری جانب مجھے ابا امان، برادری، دوست، عزیز واقارب، یہی زور دے رہے تھے کہ تو سیکینہ سے فوری شادی کر اور تجھے بہر حال میں یہ کام کرنا پڑے گا۔

میں نے وہاں بغاوت کر دی کہ میں سیکینہ سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے اور دوسرے

میں اس سے چندرہ سولہ سال بڑا ہوں۔ ابا، اماں اور سب مجھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ اب تیرے سوا اس کا کوئی ہاتھ نہیں پکڑے گا کیونکہ اس کی دماغی حالت کی خبر گاؤں میں ہر جانب پھیل چکی ہے اور وقت کا تقاضا

یہی یہی ہے کہ تو اسے اپنا لے۔ بلکہ کچھ گاؤں کے بڑوں نے ابا کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد سیکینہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے۔

ہے۔ یہ میں نے اس کو نہیں بتایا تھا۔ کتا اب تک اس کے وجود سے پوری طاقت چوس کر اسے مڈھال کر چکا ہوگا۔ وہ اب جلدی مرے گا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پرتحس ہوا کر اس سے سوال کیا۔

”وہ مورکھ انسان ہے۔“ گردوپال شیطانی انداز میں ٹھیکھا کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ بغیر محنت کئے ڈھیروں دولت حاصل کرنا چاہتا تھا اور جلد سے جلد ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے کی تمنا رکھتا تھا۔ وہ بہت تھوڑے وقت بہت کچھ پانا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے پہل اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ضدی اور اڑیل قسم کا بندہ ہے۔ وہ

کالی طاقتوں کو اپنا غلام بنانے کا نسنائی تھا۔ وہ سب پر حکم چلانا چاہتا تھا مگر یہ اس کی بھول اور خام خیال تھی۔

کتا جن کسی بھی جسم میں داخل ہو کر پہلے اسے عارضی طاقت دے کر اس کے چند کام نکالتا ہے اور پھر اس جسم کو چوس کر اپنی خوراک اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہی حال اب حکیم کے ساتھ ہوا۔ وہ اب بے بس، بے جان دیمک کھایا ہوا وجود رہ گیا ہے جو کسی بھی وقت ڈھے جائے گا۔“

”وہ مجھے بڑی خوفناک دھمکیاں دیتا ہے کہ تجھے کلتا سے مروادوں گا۔“ میں نے گردوپال کو بتایا۔

”تجھے اب اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ گردوپال نے کہا۔ ”تجھے جو کام کرنا ہے بلا دھڑک کر۔ اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں ہے تو خود جا کر یا کسی ذرائع سے میری بات کی تصدیق کر لے۔“

گردوپال کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا۔ میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا ہوا کہ حکیم کو جا کر دیکھوں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ میں پہلے اس کی سائیکلو کی دکان پر گیا۔ وہاں اس کا نوکر ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مالک آج ٹھیک نہیں رہتا۔ معلوم نہیں اسے کون سی بیماری لگ

وائے ہوئے۔ میں اس کی رپورٹ پر بری ہوا اور دوسرے اب میں ذہنی طور پر کسی حد تک آزاد تھا۔

میں جب اپنے کلیئر سرپیکلیٹ جمع کروانے اپنے دفتر آیا تو وہاں سپرنٹنڈنٹ امراں مہار بڑا سا منہ بنا کر میرے اشغفی کی منظوری کا لیٹر دیا۔ میں نے وہاں بازار میں ایک دوست سے اپنے کچھ روپے لینے مجھے، میں اس کے پاس چلا گیا۔ کچھ گپ شپ کے بعد اس نے مجھے میری ادھار رقم واپس کر دی۔ میں وہاں سے واپس آیا تھا کہ اتفاق سے روپال ملا۔ وہ اس وقت ایک دکان سے لوہاں خرید رہا تھا۔

”مرے شبیر! تم یہاں کیسے؟“ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھے ایک بوتل میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے شکوہ کیا کہ تم پھر میرے پاس نہیں آتے حالانکہ میں نے کہا تھا کہ حکیم کے بغیر اکیلے آنا۔

”جی بات ہے میرا آپ شے پاس آنے کا دل ہی نہیں کیا۔“ میں نے صاف کہہ دیا۔ ”آپ جو کام کرتے ہیں اسے میں ٹھیک نہیں سمجھتا اور اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی وجہ سے میرا دین بھی ایسی باتوں سے منع کرتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ نفع نقصان کا مالک نہیں رب ہے۔“

”تو نے اچھا کیا کہ میرے پاس نہیں آیا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو اپنے ایمان پر قائم رہا۔ تو نے عقل سے کام لیا۔“

باتوں باتوں میں میں نے اسے حکیم کی ان حرکات کے متعلق بتایا جو وہ میری بہن سکینہ پر کر رہا تھا۔ ”گلتا ہے حکیم کا برا وقت آنے والا ہے۔“ گردوپال نے کہا۔ ”میرے علم کے مطابق اس کے جسم میں نہیں نے جو کتا نامی جن داخل کیا تھا وہ انسانی جسم سے نواں چوستا رہتا ہے۔ خوشبو اور خون اس کی خوراک

”یہ تجھے کیا ہو گیا ہے حکیم؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس نے مجھے اس حالت میں بھی پہچان لیا۔ اس نے انتہائی تکلیف زدہ آواز میں کہا۔

”میں کہیں کا نہیں رہا شبیر!“ اس نے کہا اور پھر رونے لگا۔ روتے روتے بولا۔ ”میں مرنے والا ہوں شبیر! کتا نے میرے جسم کو چھوڑتے چھوڑتے اسے تقریباً نچوڑ لیا ہے۔“ اس کا سانس پھول گیا۔

وہ ابھی مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے وہاں موجود چند برہمچاشوں نے بڑے بڑے برے طریقہ سے پیچھے دھکیلے ہوئے کہا۔

”اے بڑے ہٹ اب تو یہاں سے جا، ہم نے اس سے ابھی کچھ اپنا ذاتی کام لیتا ہے۔“

”کیسا کام؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”تو یہاں سے اپنی شکل گم کر اے!“ ایک نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”اب ادھر آنے کی ہمت نہ کرنا ورنہ ڈیرے کے اندر ہی گاڑ دیں گے۔“

میں نے وہاں سے زندہ سلامت نکل آنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جب میں ڈیرے کی حدود سے باہر آنے لگا تو مجھے ایک ملازم نے بڑی رازداری سے بتایا

کہ رستم خان نے حکیم کی دونوں دکانوں کو اس سے بغیر روپے دیئے ہوئے دھوکہ سے اپنے نام کر لیا ہے اور وہ پچھلے مالک مالک کے بیٹے سے بھی دونوں دکانات کی خریداری کے روپے کھانے بیٹھا ہے اور اب رستم خان نے اس سے عدالت میں کیجہ اور ضروری بیانات کروانے ہیں۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا کہ حکیم کو

ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے جسم کا خون ختم ہو چکا ہے اور یہ چند روز کا مہمان ہے۔

یہ خبر سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں جب

گئی ہے جو اندر ہی اندر اسے چاٹ رہی ہے۔ ان سے تو ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جاتا۔ ان کی دونوں دکانوں کے تمام لین دین کے معاملات رستم چلا رہا ہے اور وہ کسی سے ڈیرے میں ہیں۔

میں اس وقت نشش و بیخ میں پڑ گیا کہ حکیم کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں۔ کیونکہ ایک طرف اب وہ میرا براہ راست دشمن بنا ہوا تھا اور جبکہ دوسری جانب مجھے نہ جانے کیوں اس پر ہمدردی آرہی تھی۔ اس کے بارے میں جو بُری خبریں آرہی تھیں یہ چیز مجھے اکسار ہی تھی کہ میں اس کی خبر نہ لیت پوچھوں۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی میں ڈرتے ڈرتے وہاں گیا۔ وہاں حسب معمول شرابی، جواڑی، وغیرہ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ رستم خان مجھے ملا اس نے میری توجہ کے خلاف مجھے کچھ نہ کہا۔ وہ ایک آرام کرسی میں بیٹھ کر بڑے مزے سے پنے کھا رہا تھا۔

”ہاں بے خرگوش بنا کیوں آیا ہے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تجھے کیا کوئی کام ہے؟“

”میں حکیم کی طبیعت دیکھنے آیا ہوں۔“ میں اسے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ آج کل بہت بیمار ہے۔“

”اے بیمار، وہ تو مرنے والا ہے۔“ رستم نے کہا اور طاق پھاڑ کر ایک بندے کو بلا کر کہا۔ ”جا بے اسے مرے سے وادے۔“

”اے مرے کو کیا دیکھنا؟“ وہاں بیٹھے سب برہمچاشوں نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔

میں جب حکیم کے قریب گیا تو وہاں میری نظروں کے سامنے وہ ایک ٹوٹے ہوئے پھٹے پر بے سدھ ہڈیوں کے ڈھیر کی مانند پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ آنکھیں بڑی طرح اندر کو ہٹ چکی تھیں۔ ڈھانچے کی اس کی کیفیت تھی۔

”میرا ایک سوال ہے تم سے مریم!“ میں نے اسے کہا۔ ”اگر میری شادی سکیئنہ سے ہوگئی تو کیا تم میری دوسری بیوی بن کر رہو گی اور اگر وہ اپنے پاگل پن سے ٹھیک ہوگئی تو تم کیا سوکن کی حیثیت سے اسے برواشت کرلو گی؟“

”شیر! تم اگر مجھے مرنے کو بھی کہو گے تو میں مر جاؤں گی۔“ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں تمہارا وہ مان جو تم مجھ پر کرتے ہو بھی ٹوٹنے نہ دوں گی۔“

ادھر میں جب اپنے گھر پہنچا تو وہاں مجھے میرے ابا اماں اور برادری کے بزرگوں نے گھیر لیا۔ ان سب نے مجھے کہا کہ تو نے آج ہی لازماً سکیئنہ سے شادی کرنی ہیں

”سکیئنہ کی دماغی حالت اس وقت خراب ہے۔“ میں ان کو ماننے کے لئے کہا۔ ”میں بھلا اس حالت میں اس سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ یہ کام تو شرع کے بھی خلاف ہے۔“

وہاں میرے موقف کی کسی نے تائید نہ کی۔ وہ سب یک زبان ہو گئے کہ سکیئنہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ان لوگوں کے سامنے بے بس ہو گیا اور انتہائی سادگی سے میرا نکاح پاگل سکیئنہ سے کر دیا گیا۔ سکیئنہ کو دلہن بنا کر جب میرے پاس لایا گیا تو اس وقت بھی اس نے اپنا تمام میک اپ خراب کر کے، عروسی لباس چھڑ کر خوب دیوانہ پن کیا۔ مجھے دیکھ کر مسلسل قہقہے لگاتی رہی اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے علاوہ اس نے وہاں موجود مہمانوں کو خوب گالیاں بھی دیں۔

مجھے اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پھنسا ہوا ڈھول میرے گلے میں ڈال دیا گیا ہو۔ میں جب اپنے ابا اماں اور گاؤں کے بزرگوں سے شکایت کرتا کہ تم نے میرے ساتھ یہ بہت ظلم کیا ہے تو مجھے لا جواب کرتے

وہاں سے واپس گھر آیا تو میں سیدھا مریم سے ملا۔ اس کا باپ اور بھائی کام کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مریم دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔ جب میں نے اسے حکیم کی گرتی صحت کے بارے میں بتایا تو وہ رونے لگی۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا کہ کیا، کیا جائے۔

”تم میری یہاں آمد کا کسی کو نہ بتانا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”یونہی کوئی نام لے کر تم یہ بات اپنے باپ کو بتاؤ کہ ایک آدمی آیا تھا اس نے بتایا کہ حکیم کی پشاور شہر میں حالت بہت خراب ہے۔“

اس نے کہا کہ میں کچھ کرتی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ابا اماں اور برادری والے مجھ پر سکیئنہ سے شادی کروانے پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں جبکہ اس کا تو دماغی توازن اپنی جگہ پر نہیں۔

”تم کیا ایک دماغی طور پر فارغ لڑکی کے ساتھ کمزورہ کر لو گے؟ اور دوسرے کوئی لڑکی جو اپنے حواس و ہوش میں نہ ہو اس سے آپ کیسے شادی کر سکتے ہیں۔“

”میرے آپ کی مرضی۔“ شیر! تم جو چاہو میں ذہنی طور پر ویب کرنے کو تیار ہوں۔“

”مریم! میں آج بھی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”خدا نے چاہا تو میں تم سے کیا ہوا شادی کرنے کا وعدہ ہر قیمت پر بھانڈاں گا۔ میں آج کل بہت ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ خدا نے میری جانب سے اپنا دل لٹھنا کرنا اور میں جب تمہیں اپنانے کے لئے پکاروں تو بلا تامل آ جانا۔“

”مجھ معذور اور معمولی صورت سے کون شادی کرے گا؟“ مریم نے روتے ہوئے کہا۔ ”تم سے پہلے بات میرے ذہن میں تھی کہ میں عمر بھر کنواری رہوں گی۔“

”جب تم مجھے ملے اور تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تو اسی دن سے میں نے اپنی زندگی تم سے جوڑ دی تھی۔“

ہاں، مریم، بقیس، رشتہ دار حلقہ بنائے رو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے اشارے سے قریب ہونے کو کہا۔ میں نے جب اپنے کان اس کے منہ کے قریب کر دیئے۔ ”میں تجھ سے ہار گیا شبیر!“ اس نے انتہائی تکلیف اور ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کمزور آواز میں کہا۔ ”میں غلط تھا، ٹو بقیس سے نہیں مریم سے شادی کر لئے۔“ یہ بات اس کے باپ نے بھی سنی تھی۔ اس نے بھی اس کے منہ کے ساتھ اپنے کان جوڑ لئے تھے۔

اس کے باپ نے اسے روٹنے ہوئے کہا۔ ”تیری وجہ سے نہ صرف ٹو برادر سوا زمانہ ہوا بلکہ ہم بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔“ وہاں موجود کچھ لوگوں نے اسے کہا کہ یہ مر رہا ہے اسے اس وقت طے نہ دد بلکہ معاف کر دو۔

اس کے باپ نے اسے اس کے کان میں معافی کا لفظ کہا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے اس کے کانوں میں معافی کا لفظ کہا۔

پھر اُس نے اشارے سے مریم کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا۔ ”میرے مرنے کے بعد تم شبیر سے شادی کر لینا۔ یہ اچھا لڑکا ہے۔“

اس کے منہ میں آب زم زم ڈالا گیا اور اسے کہا گیا کہ کلمہ پڑھو (کچھ لوگوں نے وہاں ایسا کرنے سے منع بھی کیا گیا کہ یہ مر رہا ہے ایسا نہ ہوتا کہ نزع کے عالم میں یہ اس کا انکار نہ کر دے اور کفر کی موت مرے) لیکن اس نے کلمہ طیبہ پڑھنے کے الفاظ میں پڑھا اور پھر اس کی روح اس کے جسم سے نکل گئی۔

وہاں یہ بہت عجیب بات ہوئی کہ مریم مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ یہ منظر بقیس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ حکیم کی میت پر خوب آہ و بکا ہوئی۔ وہاں میرے ابا، اماں گاؤں کے دیگر لوگ بھی

نے پہچنے کہ اس کا ذمہ اور بھی ٹوٹا ہے کیونکہ میرے دوست حکیم نے ہی اس کو کسی کالے عمل سے پاگل کیا ہے۔

ایک دم دوبارہ راولپنڈی جامع مسجد بھی لے گئے اور ایک آدھ ماہ عملیات کو دکھایا گیا۔ ان سب نے کہا کہ اس پر چارویں عمل کرنے والا اپنا پورا کام کر چکا ہے۔ ہمیں پچاس فیصد تھا کہ یہ سب کچھ اعلانیہ طور پر حکیم نے ہی کر دیا ہے لیکن وہ تو خود زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔

شادی کے بعد مجھے مریم پہلی بار ملی۔ اسے میں نے اپنی زبردستی کی شادی بتائی تو وہ خاموش رہی بولی کچھ نہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا باپ بھائی اور گاؤں کے چند لوگ پشاور رستم خان کے ڈیرے میں گئے تھے۔ اس نے بھائی کو انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ شبیر تم جب مجھے پکارو گے اڑ کر آؤں گی۔

دوسرے روز میں سیکرٹ کو قریبی گاؤں کے ایک مہنوی کے پاس دم کروانے لے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عباس (مریم کا بھائی) اور ان کے گاؤں کے دو بندے میرے پاس گھر ماہٹ کے عالم میں آئے۔ عباس نے مجھے بتایا کہ آج صبح رستم خان کے چند بد معاش ایک ہٹی جیب میں آئے تھے، وہ حکیم بھائی کو مین سڑک پر پھینک کر بھاگ گئے ہیں۔ بھائی مرنے والے ہیں وہ آپ کو فائدہ بلا رہے ہیں۔ میں نے سیکرٹ کو اپنے گھر کی عورتوں کے حوالے کیا اور خود ان کے ساتھ اسی وقت ان کے گھر پہنچا۔ ان کے گھر کے باہر ان کے رشتہ دار، دوست، برادری والے جمع تھے۔ میں اندر چلا گیا۔ وہاں مفتی حکیم کا جسم پڑیوں کا بغیر بنا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں یعنی اس کا سانس زندگی اور موت کے درمیان الٹا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے قریب اس کا باپ،

تمہاری پوری مدد کروں گی اور گھر چنانے کے لئے اپنا
خاصا خرچہ دوں گی۔

”تو کوئی ثواب زادتی ہے؟“ بیس نے مصحفہ خیر
لجے میں کہا۔ ”جو تم اپنی دوسو کنوئیں کے علاوہ اپنا خرچہ
بھی برداشت کرے گی؟“

”میرا یقین کرو شیراز!“ اس نے روپائی آوار میں
کہا۔ ”میں نے اتنا روپیہ پیسہ جمع کر لیا ہے کہ میں ہم
جیسے لوگوں کے کئی گھروں کو پال سکتی ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے جس طریقہ سے تو نے اتنی پیوی
رقم جمع کی ہوئی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
”مجھے تیرے کڑو توں کا بخوبی علم ہے بلقیس!“

”اچھا تو تمہیں میرے ماضی کے بارے میں
الزام مریم نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“ وہ چونک کر
بولی۔

”نہیں مجھے مریم نے تمہارے بارے میں کچھ
نہیں بتایا۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”تمہارے
کالے کڑو توں کا ارد گرد کے تمام لوگوں کو علم ہے۔“

”یہ میرا سیاح ماضی تھا شیراز!“ اس نے روتے
ہوئے کہا۔ ”تب انہیں مجبور تھی، نادان تھی لیکن میں تم
سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم مجھے اپنا لو میں تمہارے ساتھ

ایک پاکیزہ زندگی گزاروں گی اور ویسے بھی تمہاری دو
بیویاں ہوں گی۔ میں اور مریم، سبکدہ تمہاری شرعی بیوی
نہیں ہے۔ تم اس کے ساتھ حرام زندگی گزار رہے ہو۔“

”تو کون ہوتی ہے میری شادی کے بارے میں
فتویٰ لگانے والی؟“ میں نے نفرت سے کہا۔

”شیراز! خدا کے واسطے مجھے اپنا لو۔“ بلقیس میرے
پاؤں میں گر کر گڑا لڑانے لگی۔ ”میں مریم کے ساتھ مل کر
رہ لوں گی۔“

”تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ میں نے اسے اپنے
قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خوبصورت ضرور ہو

گئے۔ اس کے جنازہ کے بعد مجھے کسی ذریعے بلقیس کا یہ
پیغام ملا کہ میں اسے لازماً آخری بار کھلو رام کی دکان
کے پچھواڑے میں رات کے وقت ملوں۔ میں درحقیقت
اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے گندے
آزار کا جب سے علم ہوا تھا تو مجھے اس سے فطری طور
پر نفرت ہو چکی تھی۔ بہر حال میں اس سے کھلو رام کی
دکان کے پچھواڑے میں اس سے ملا۔ بلقیس کو میں نے
کہا کہ تمہیں مجھے یہاں نہیں بلوانا چاہیے تھا۔

”یہ میرے بس کی بات نہیں شیراز!“ اس نے
جذباتی انداز میں کہا۔ ”میرا اپنے دل پر کنٹرول نہیں
ہے۔“

”تم تو پاگل ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں
معلوم نہیں کہ میں اب شادی شدہ ہوں۔“

”شیراز! تم نے ایک لڑکی سے اس کے پاگل پن
میں اور اس کی غیر رضامندی سے شادی کی ہے۔“ وہ
کہنے لگی۔ ”یہ اسرار حرام کاری، شرعی لحاظ سے غلط نکاح
ہے اور اب سنا ہے کہ تم مریم سے شادی کرنے چلے
ہو۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟“ میں نے ٹھٹکتے
ہوئے اس سے پوچھا۔

”یہ بات اب راز نہیں رہی شیراز!“ اس نے کہا۔
”جلیئم بھائی خنے نے فیصلہ کر لیا تھا اور پھر موت سے پہلے
بھی آخری بات یہی کہی تھی انہوں نے۔“ دیکھو شیراز!

اگر تم واقعی نکلڑی مریم سے شادی کرنا چاہ رہے ہو تو
اپنے دل کی تمنا بے شک پوری کر لو لیکن مجھے بھی اپنا
لو۔“

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ میں نے اسے کہا۔

”تو کیا میں تین شادیاں کروں؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔
”تم تینوں بیویوں کو سنبھالنے اور خرچ کی فکر نہ کرو۔“ میں

نہیں میں نے مریم سے کیا عہد مردوں کی طرح نبھانا ہے۔ سیکینہ کے ساتھ شادی کرنا میری خاندانی مجبوری اور حالات کا تقاضا تھا۔“

”تم میری محبت کو ٹھکرا رہے ہو شبیر!“ اس نے جھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”میری محبت کے جواب میں نفرت اور حقارت دے رہے ہو۔۔۔۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تبھی اپنی زندگی میں مریم کو تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہاری نظر میں بُری ہوں تو بُری بن کر دکھاؤں گی۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں آگ بھری تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے وہاں سے بھیجا۔ وہ روتے ہوئے میرے پاس سے چلی گئی۔

میں نے وہاں سے واپس آ کر مریم کو اپنی اور باقیس کی ملاقات کے متعلق بتایا اور اسے وہ ساری باتیں بھی بتائیں جو اس کے اور میرے درمیان ہوئی تھیں۔ وہ یہ سب سن کر خاموش ہی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ بولی۔

اس کے باپ نے مجھے کہا کہ بیٹا شبیر تم نے عظیم کی آخری خواہش سن لی تھی۔ تمہارا اس کے بارے میں کیا ارادہ ہے۔

”میں ول و جان سے مریم کو چاہتا ہوں۔“ میں نے انہیں کہا۔ ”اور اس سے ہر حال میں شادی کروں گا۔“

”سیکینہ بھی تمہارے نکاح میں ہے۔“ اس کے ابا نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تم اس صورت میں بھی میری بیٹی کو اپناؤ گے؟“

”ہاں!“

انہوں نے یہ شرط لگائی کہ تم مریم سے نکاح کر کے ہمارے ساتھ گھر دادا بن کر رہنا میں نے ان کی تمام باتیں مانتے ہوئے انہیں کہا کہ میں اپنے ماں

باپ سے مریم سے اپنی شادی کی بات کروں گا۔

میں جب اپنے گاؤں کے گھر گیا تو وہاں سیکینہ کے پاگل پن میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اب گھر کے قریب سے گزرنے والے لوگوں کو پتھر مارتی اور گالیاں دیتی۔ اس نے ایک روز قبل اماں کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے۔ اماں اسے نہلانا چاہ رہی تھی۔ ابا اماں کو چھڑانے آئے تو اس نے ابا پر تھوک دیا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ مجھے تو وہ دیکھ کر اور زیادہ ہی جنونی ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے بھی زد و کوب کرتی۔ میرے بال بکھیرتی، کپڑے پھاڑتی، اور کہتی میرا بھائی خاوند آگیا۔

میں نے ابا اماں سے اپنے دل کی بات کھل کر کرنے کے لئے گاؤں کے بڑے بزرگوں سب کو ایک جگہ کی صورت میں اکٹھا کیا۔

”آپ سب لوگ سیکینہ کی حالت دیکھ رہے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا۔ ”میں اب سیکینہ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس نے میرا ہی نہیں بلکہ سب کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسے میرے خیال میں لاہور یا آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کر دیا جائے۔“

بزرگوں اور ابا نے ان بات کو تسلیم کیا کہ واقعی سیکینہ کی دماغی حالت اب اس قابل نہیں رہی کہ اسے اپنے طور پر سنبھالا جائے کیونکہ اس نے گاؤں کے کئی لوگوں کے سر پھاڑے، پتھراؤ کیا تھا۔ گاؤں اور گھر والوں نے ایک حد تک اس کی دیوانی حرکات برداشت کر لی تھیں۔

اس جگہ میں موجود بڑے مختلف رائے دینے لگے۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گی اسے ایسا ہی رہنے دیا جائے۔ کچھ ابا کو کہہ رہے تھے کہ اسے واقعی آگرہ یا لاہور کے پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ ایک گروپ وہاں ایسا بھی تھا جو میرے ابا اماں کو یہ سمجھانے کی کوشش

وہاں سے میں مریم کے پاس آ گیا۔ میں نے اس کے باپ کو بتایا کہ میں اپنے پیچھے اپنے تمام رشتہ داروں کو اپنے وعدہ کی خاطر چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں اسے یہ بھی کہا کہ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں مال روڈ مری میں ایک بڑی مشہور دکان کے باہر سمو سے، پکڑوں، چائے کا ڈھابہ کھولوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمیں کچھ بھی نہ ملا تو ہم یہاں آرام سے روٹی تو کم از کم کھا لیں گے۔

”شیر! مجھے اس بات کا پکا یقین ہو گیا ہے، نہ تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو۔ مریم نے موقع پا کر کہا۔ ”میرے دل میں کوئی فتق نہ رہے گا تم اب بھی چاہو تو یہاں سے واپس اپنی بیوی کیلینہ کے پاس لوٹ سکتے ہو۔“ میں نے اسے کہا۔ ”میں جب تمہارے پاس اپنا سب کچھ چھوڑ کر کشتیاں جلا کر آ گیا ہوں، اب واپس نہیں لوٹوں گا۔“

اس نے بتایا کہ بلیس نے اپنی کوٹھڑی تاپا کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے لیکن اس نے ابھی اس کا قبضہ نہیں دیا ہے۔ میرے اور مریم کے نکاح کی تیاری شروع ہو گئی۔ میں نے اپنے چند قریبی دوستوں کو بلا دیا۔ جبکہ مریم کی جانب سے بھی چند قریبی لوگ آئے اس نے بلیس کو بھی بلا دیا۔ حالانکہ میں نے اسے بلوانے کے لئے منع کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ہم نے نہ بلایا تو ہماری برادری والے ہمیں ذلیل کرنے کے علاوہ کئی الٹی سیدھی باتیں کریں گے۔ وہ بھی، دل اسے اپنی شادی میں بلانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا اور مریم کا نکاح انتہائی سادگی سے اس کے ہی گھر ہوا۔ کوئی ڈھول نہ بجا اور نہ ہی کوئی شادی کی رسومات ہوئیں۔ صرف لہجی نے مریم کے ہاتھوں میں مہندی لگائی، مجھ سے ٹھوڑا بہت شغل کیا۔ میں نے جن قریبی دوستوں، رشتہ داروں کو

کرتا تھا کہ شیر اور پاگل یکینہ کا نکاح غلط غیر اسلامی غیر شرعی ہے۔

”میں اب مریم سے اپنی مرضی کی شادی کروں گا۔“ میں نے اس بات کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اور کیلینہ کو بھی طلاق نہیں دوں گا۔“

ابا اماں اور برادری کے کچھ بڑوں نے مجھے ذلیل خوار کرتے ہوئے کہا کہ جیسا بھی ہو ہر قیمت پر کیلینہ کے ساتھ بھاگ کر۔

”جس لتکڑی کی خاطر تو مر رہا ہے اسی کے ظالم بھئی کی وجہ سے اچھی بھلی کیلینہ پاگل ہو گئی ہے۔“ ابا نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔“

”اس میں مریم کا کیا قصور ہے؟“ میں نے انہیں کہا۔ ”میں نے اس سے پہلے ہی شادی کا وعدہ کیا تھا اور میں یہ کام ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔“

”میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔“ اماں نے کہا۔ ”تیرا میرا جینا مرنا ختم۔“ ابا نے جذباتی انداز میں کہا۔

”آپ جو مرضی میرے فیصلہ کے بارے میں سوچیں۔“ میں نے گستاخی کے انداز میں کہا۔ ”میں نے ہر حال میں مریم سے شادی کرنی ہے اور دوسرے میں کیلینہ کو طلاق بھی نہیں دوں گا۔ مریم سے میں نے اس بارے میں پہلے سے بات کی ہوئی ہے۔“

اس محفل میں میرے ابا اور برادری والوں کے درمیان خوب بحث و ہنگام ہوئی۔ کچھ لوگوں نے میرے موقف کی تائید بھی کی۔ میں کیلینہ کے قریب گیا اسے میں نے کہا کہ مجھے معاف کر دینا میں پھر بھی تجھے اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بیچاری اپنے آپے اور ہوش حواس میں ہی نہ تھی۔ درحقیقت خیم نے مرتے ہوئے کہا تھا کہ اس پر جو کلام لعل میں نے کر دیا ہے اس کا توڑ بہت مشکل ہے۔ اگر ہوا بھی تو برسوں لگیں گے۔

دیکھوں گی۔ یا تم اسے میرے پاس یہاں لے آؤ۔ اس نے مجھے بہت دلاسا دیا۔ یہ بات جب دوسرے رشتہ داروں، برادری والوں تک پہنچی تو وہاں رنگ برنگے مشورے ملنا شروع ہو گئے۔ کچھ نے کہا کہ تو اکیلا اپنے گاؤں جا، کیونکہ اگر تیرے ساتھ مریم گئی تو الٹا تیرے گھر، گاؤں والے مزید غصہ سے بھڑکیں گے اور مریم کی تذلیل کریں گے۔

میں نے کہا کہ سیکینہ پاگل ہے وہ اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ یہ ممکن تھا اور اس بات کا مجھے بھی اندیشہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے اپنے گھر گیا تو وہاں میرے لہجہ اور قریبی رشتہ دار بھوتے بھیر یوں کی طرح مجھ پر بھینسے اور مجھے خوب لعن طعن کی اور گالیاں دیں۔

”ہم کب تک تیری پاگل بیوی کے دھول کو اپنے گلے میں لٹکا پھریں گے؟“ ابا نے دھاڑ کر پوچھا۔

اماں نے الگ مجھے اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے کہا کہ دیکھ تیری جو روئے تھپڑ مار مار کر میرا کیا حال کر دیا ہے۔ وہاں ہر کوئی سیکینہ کی شکایتیں کر رہا تھا۔ انصرض وہاں موجود سب نے میرا دباغ مزید خراب کر دیا۔ میں تو پہلے سے ہی بہت اذیت میں تھا۔ میں نے سیکینہ کو دیکھا اس کا ایسا برا حال تھا کہ اُسے لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے سر کے بال الجھے ہوئے۔ چہرے پر جگہ جگہ ناخنوں کے کھرچنے کے نشانات، کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ کسی وحشی کی طرح میرے پاس آئی اس نے میرے چہرے پر لگا تار کی تھپڑ مارے۔ اس نے دل کھول کر کافی دیر تک مجھے مارا اور میں مار کھاتا رہا۔

”اب بہت ہو گئی، ہم سے صبر نہیں ہوتا۔“ شیراز ٹو اپنی پاگل بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جا، تیرا مرنا، جینا اب ہم سے ختم ہوا۔“ ابا نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اماں میں شام کو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دیا تھا وہ ابا اور برادری کے ذریعے نہ آئے۔ ادھر بائیس خادمہ چسپن کے ساتھ کافی بجھے، نقدی لے کر عہدہ خشی کا عالم میں آئی۔ اس نے مجھے اور مریم کو بہت بہت مبارکباد دی۔ اس نے مریم کو کیا کچھ شہرہ تجھے مبارک ہو۔ اب میں نے اس کو حاصل کرنے کا ارادہ دل سے نکال دیا ہے اور ویسے بھی میں نے بڑی سے بہت دور چلے جانا ہے۔ مریم نے پوچھا کہاں جاؤ گی تو جواباً اس نے کہا کہ میں بہت دور جا رہی ہوں۔ میں وہاں خاموش بیٹھا رہا، میں سمجھ نہ بولا۔

دوسری جانب مجھے ابا اور اماں کا یہ پیغام ملا کہ سیکینہ کی دماغی حالت آخری حد تک خراب ہو گئی ہے۔ اس نے گاؤں کی گلیوں میں تقریباً نیم برہنہ ہو کر پھرتا، کانیاں دینا اور اودھم مچانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے ابا نے کہا کہ تو سیکینہ کا گلا گھونٹ یا اپنے پاس نئی نوپلی دھن کے ساتھ رکھ۔ مجھے اس وقت یہ بات کسی پہاڑ سے کم محسوس نہ ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں اس صورت میں کیا کروں۔ میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ میں سیکینہ کو مرچھٹے پائس لے آتا اور دوسرے سیکینہ کو روپنٹی، لاہور، آگرہ کے پاگل خانہ میں داخل کرواتا۔

میں بھی میں سمجھتا نہ لگتا کہ خواہ مخواہ مریم سے شادی کا چنگا لیا ہے۔ وہ ننگری ہے تو سیکینہ پاگل۔ کیا کروں؟ پھر میں نے سوچا کہ وعدہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے، میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ اگر ابا نہ کرتا تو لفظ محبت بدنام ہونے کے علاوہ میرا ضمیر ساری زندگی میری روح کو تھوڑے مارتا۔

میں نے مریم سے اپنی اس جی پریشانی کا ذکر کیا تو خلاف توقع اس نے میرا دل بڑھاتے ہوئے کہا کہ سیکینہ میری سوکن نہیں میری بہن کی طرح ہے۔ میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں کے گھر جا کر اسے

وقت پاگل تھی۔

”اسے پاگل بھی تو تیرے دوست نے کیا تھا۔“

ابا نے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اور تو اس کی انگڑی بہن

کے عشق میں دیوانہ ہو کر مر رہا تھا۔“

”تو ہمیں اس کا دوش نہیں دے سکتا کہ ہم اس

صورتِ حال کے ذمہ ہیں۔“ اماں درمیان میں بوئیں۔

جب میں پاگل سیکنہ کو اپنے گاؤں کے دو دوستوں

کے ساتھ مریم کے گھر لایا تو اسے دیکھ کر مریم نے ابا نے

منہ پھلایا۔

”تیری پاگل بیوی کو سنبھالنا ہماری ذمہ داری نہیں

ہے۔“ اس نے صاف صاف کہا۔ ”اسے ابھی کسی پاگل

خانے لے کر جا، تو اسے یہاں کیوں لایا ہے؟“

درمیان میں مریم آنکھی، اس نے اپنے ابا سے کہا

کہ اسے میں نے اپنی مرضی سے اپنے پاس بلایا ہے۔

میں اسے ہسپتال لے جاؤں گی اور اس کی دیکھ بھال بھی

کروں گی۔

”تو تو خود محتاج ہے، تو کیا کسی کو سہارا دے گی؟“

”ابا! میری ایک ٹانگ کمزور ہے لیکن میری ہمت

اور حوصلہ مضبوط ہے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا

”میں اس مصیبت کے وقت میں شبیر کا سہارا بنوں

گی۔“

اس کے ابا نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنی زندگی میں پہلی لڑکی دیکھی ہے جو

اپنی سو کن کو دل و جان سے چاہتی اور اس کی خدمت کرنا

چاہتی ہے۔“ پھر اس نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے

کہا۔ ”میں کسی صورت میں بھی اس کو اپنے گھر نہیں

رکھوں گا۔“ پھر اس نے مجھے اور سیکنہ کو کنگی گالیاں دینا

شروع کر دیں۔ میں وہاں بالکل بے بس تھا۔ مجھے وہاں

صرف یہ ڈھارس تھی کہ مریم میری وکالت کرنے کے

علاوہ میرا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ مریم کے گھر میں

”یہ میرا جانا (خاوند) ہے؟“ ادھر سیکنہ چلاتی

رہی۔ ”خبل بخل دفع ہوا“ وہ پہاڑی زبان میں کہنے

لگی۔ ”جا۔۔۔ دفع ہو۔“

میں ہونفوں کی طرح اسے دیکھتا رہا اور یہ سوچنے

لگا کہ اس پاگل کا کیا کروں۔ اسے شہر کہیں ہسپتال میں

لے کر جاؤں یا اسے ادھر ہی تنہا چھوڑ کر اس سے جان

چھڑاؤں؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچتا تھا

کہ وہ جیسی بھی ہے، ہے تو میری بیوی اور دوسرے مرحوم

چچا کی بیٹی بھی ہے۔

”ہم اس بچی کی حرکتوں سے تھک گئے ہیں۔“ ابا

نے میری سوچوں کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیری زبانی

ہے اسے اپنی نئی ٹوپی دہن کے پاس لے جا۔“

”ہمارے سر سے اتار اس پاگل کو۔“ وہاں

بزرگوں نے مجھے سختی سے کہا۔ ”اگر تجھے اسے اپنے

سر پر لے جانے میں پریشانی ہو رہی ہے تو ہم خود

اسے تیری نئی دہن کے پاس چھوڑ آئیں گے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں شام کو اسے یہاں سے

لے جاؤں گا۔“ میں نے ان سے کہا۔

”نہیں تو جھوٹ بولتا ہے، تو اسے ابھی یہاں

سے لے کر جا۔“ برادری والے مجھ پر دباؤ ڈالنے

لگے۔

بدقسمتی سے میری اماں ان لوگوں کی ہم زبان ہو

گئی۔ مجھے ان لوگوں نے جو میرے اپنے ہی تھے، مجھے

بھی نیم پاگل بنا دیا۔ میرے پاس اب کوئی راستہ نہ بچا

تھا جو بھی تھا سیکنہ کو سنبھالنا میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں

نے اسے مریم کے گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابا اماں،

میرا بھائی اور دوسرے وہاں سب اس معاملہ میں پتھر دل

بن گئیں میں نے بھی وہاں اپنا خوب غصہ نکالا۔ میں نے

ابا اماں کو کہا کہ تم لوگوں نے میری رضامندی کے خلاف

اس سے شادی کروائی جو شرع کے خلاف ہے۔ یہ اُس

پاس اس کا روحانی علاج کروانے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نام سے بھارہ کہوں کے پاس ایک مشہور بندہ ڈالہ ہو بھی دکھارہے تھے وہ اسے جسم، دماغ کی طاقت کی دوائیاں دینے کے علاوہ کچھ ایکسرسائز بھی کروا رہا تھا۔ اس سے اس کی دماغی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اس سے ہمیں دلی تسلی ہو رہی تھی کہ چلو ہماری مشقت، محنت، صبر کچھ رنگ لارہا ہے۔

میں جب بھی مریم سے یہ سوال پوچھتا تھا کہ جب کبھی سکیٹ ٹھیک ہو گئی تو تمہارا میرے اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا؟

”میں اسے تقدیر کا لٹھا سمجھوں گی۔“ وہ جواب دیتی۔ ”دور قریب ہی ہم دونوں کو براہِ حق وقت دینا۔ باقی تمہیں میری طرف سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ وہ ہلکی سی دھڑکنے لگی تھی کہ یہ نہیں ہمیں نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی کہ میرا بھائی اس کو اس حالت میں لائے گا ذمہ دار ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سیدہ کا علاج کریں۔

پھر حالات میں بڑا عجیب اور ناقابلِ یقین ماحول پیدا ہو گیا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری قربانی اور قربانی کی قربانی کی وجہ سے زندگی میں تھراؤ آ رہا ہے لیکن ایک دن میرے ساتھ ایک عجیب ٹھونسا اور دلچراش واقعہ ہو گیا۔ سوایوں کے میں باڑیاں دیکھنے اپنی نوکری نے سانسد میں کمرے آفس سے ملنے اس کے ہاتھ میں پیدل پہنچی راستہ سے گزرتا ہوا جا رہا تھا کہ گھات میں نیچے ایک ٹکڑے چوڑے ٹکڑے نے مجھے دبوچ کر اچانک پکڑ لیا کہ میں خوف سے جم گیا۔ میں نے سمجھا کہ کوئی چور دھاڑ رہا ہے۔ اگلے لمحے مجھے بچا ہوا تھا، میں نے بھی اس کے شیشے سے پتے کے سنے اپنے تئیں مزاحمت کرنا شروع کر دی۔ ہم دونوں خشم خشم ہو گئے۔ اس نے میری کمر میں ۱۰۰۰

اسے دور اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا پیچہ والا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے زمین سے ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر مارا جس سے اس کی گرفت مجھ پر سے کمزور پڑ گئی، وہ بھی ٹھیک ٹھاک ڈھکی ہو گیا۔

ہماری اس لڑائی کو چند مقامی دہریاتوں نے دیکھ لیا۔ وہ دور دراز سے پا لے آئے، انہوں نے ہم دونوں کو فوری ڈھکی حالت میں ہسپتال پہنچایا بعد میں پولیس کو اس بندے نے بتایا کہ وہ رستم خان کی جانب سے بھیجا ہوا تھا (اس کی دھمکی مجھے رستم خان نے پشاور میں دی تھی)۔ میری کمر میں پیچہ کے حملہ کی دوکان کی خبریں آتی تھیں۔ مجھے مرنے لے ہوئے سرکاری ہسپتال، داخل کروا دیا گیا۔ مریم، بلقیس، لکٹی مجھے ہسپتال دیکھنے آئے۔ مریم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے فوراً انہوں سے اسے پورا یقین دلایا کہ خدا کے فضل و کرم سے میری جان بچ گئی ہے، لیکن وہ دروازہ کھلا ہوا ہے جسے چاروں نے دیکھا۔ اسی لمحے وہ دفعہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر مذہبی روٹی کہ کچی بات ہے وہ مجھے اس وقت کوئی ڈرامہ باز نہ لگی۔ لکٹی بھی آنسو بہا رہی تھی۔ وہاں بلقیس نے ہاتھ لڑگوں سے خوب باتیں کیں اس نے روتے ہوئے مجھ سے اور مریم سے اپنی چھٹی کچھ سزائوں کی معافی مانگی۔ اس نے بتایا کہ وہ واقعی کسی وقت بدراہ ہو کر بھٹک گئی تھی۔

اس دوران مجھے ہسپتال میں مریم ہوا کہ سکیٹ کی دماغی حالت مزید خراب ہو رہی ہے وہ اب جنونی عافیت میں آ کر اتنا بھڑکتی ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس نے مارنے کیا ہے مجھے وہاں یہ بھی پتا چلا کہ اس نے ہماری ایک پڑوس کا سر بھاڑ دیا ہے۔ لوگ مریم کو کہتے تھے کہ تو نے خواہ مخواہ کسی کا مذاق اپنے کلمے ڈالا ہوا ہے۔ اسے یہ مشورہ دیا جا رہا تھا کہ تو اپنے خاندان سے یا

محلہ دار اسے یہ مجبور کر رہے تھے کہ وہ تم سے طلاق لے
یا سیکنے کو وہاں سے نکالے۔ البتہ بلیس ابھی تک
ہمارے ساتھ پورا تعاون کر رہی تھی۔

میرے سامنے لا تعداد ایسے مسائل تھے جن سے
نظر میں چرانا یا انہیں جوں کا توں چھوڑنا میرے لئے
ممکن نہ تھا اور ان سے نمٹنا بھی لازم تھا۔ میں نے اب
اماں کو ہسپتال ہی سے ایک دکھ بھرا خط لکھا ان سے معافی
اور امداد کی اپیل کی۔ دوسری جانب میری کمر کے زخم
مجھے مزید تنگ کرنے لگے۔ رستم خان نے جو ہندہ مجھ پر
حملہ کرنے لئے بھیجا تھا اس کا پولیس کیس الگ بنا ہوا
تھا۔ ہسپتال میں آئے روز پولیس آ کر مجھے تنگ کرتی
تھی۔ انہوں نے الٹا مجھ پر جھوٹا کیس ڈال دیا کہ تم نے
مخواہ خواہ ایک شریف آدمی کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنوایا
ہے۔ رستم خان نے پولیس اور موقع کے گواہوں کو خرید
لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے میری کمر کے زخموں کے فوری
علاج کے لئے میری بساط سے زیادہ اخراجات بتا دیئے
تھے۔

مجھے پتا چلا تھا کہ مریم میرے علاج سے اخراجات
کی رقم کے حصول کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ لہٰذا میں نے
اسے کچھ روپے دیئے تھے۔ ایک دن میرے پاس
بلیس، خادم حسین کے ساتھ مجھ سے ملے ہسپتال آئی۔
اس نے مجھ سے بہت سے روپے دیئے ہوئے کہا کہ شہیرہ
اس رقم سے اپنا اور سیکنے کا اچھی طرح علاج کرواؤ۔
”میں مرنے والی ہوں لیکن کبھی بھی تم سے یہ رقم نہ
لوں گا۔“ میں نے اسے کہا۔ ”تم نے پہلے ہی سیکنے کو
اپنی کوششوں میں پناہ دے کر ہمیں احسان مند کر دیا ہے۔
وہ رورور کر یہ رقم لینے پر اصرار کرنے لگی۔

”تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟“
میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس میں مجھے کچھ حرام کی
کھوٹ محسوس ہوتی ہے۔“

تو طلاق لے یا اس کی پہلی بیوی کو اس کے حوالے کرے
نہیں مریم ان سب کا صبر سے مقابلہ کر رہی تھی۔

ادھر ڈاکٹروں نے میرے زخموں کی حالت دیکھ
کر مجھے راولپنڈی کے بڑے سرکاری ہسپتال میں
آرپیشن کروانے کا مشورہ دیا کیونکہ میری کمر کے زخم
میں بگاڑ پیدا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں کو ڈر تھا کہ یہ زخم ناسور
میں تبدیل ہو جائیں۔ اب میرے ارد گرد کی صورت
حالت بہت گھمبیر تھی۔ میرے پاس نہ تو پلے کوئی روپیہ
پیسہ تھا جس سے میں اپنا اچھا علاج کروانا دوسرے میں
کسی کے در پر پڑ کر اپنی دونوں بیویوں کو سنبھال رہا
تھا۔ بالخصوص سیکنے کا علاج اور اسے سنبھالنا بھی کسی
عذاب سے کم نہ تھا۔ والدین مجھ سے الگ ناراض
تھے۔ ادھر مریم بار بار میرے پاس بڑی دور اونچی نیچی
پہاڑیوں کو اپنی بیساکھیوں کے سہارے ملے کر کے آتی
تھی۔ وہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ
نولاد کی بنی ہوئی سخت جان صبر والی کوئی خاص لڑکی
ہے۔ اسے دیکھ کر لوگ مجھے کہتے تھے کہ شہیرہ تو بہت خوش
قسمت ہے جسے اتنی وفادار، ہمت والی مخلص بیوی ملی
ہے۔ وہ تو بچاوری مجھ سے اپنے لا تعداد مسائل کا ذکر کم
ہی کرتی تھی۔ کیونکہ اسے میری زخمی حالت اور مالی
کمزوری کا بخوبی علم تھا۔ جبکہ اس کی جگہ لہٰذا مجھے ساری
باتیں کھل کر بتانی تھی۔ مثلاً پیچھے گھر میں سیکنے نے بہت
آفت، عذاب بھارتھا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کا
پاگل پنا آخری حدیں پار کر چکا ہے۔ اسے بعض دفعہ
کوئی زیادہ ہی دیوانے پن کا دورہ پڑ جاتا تھا اور پھر وہ
اپنے آگے والی ہر چیز کو تیس تیس برباد کر دیتی تھی۔ اس
نے بتایا کہ سیکنے کی جنونیت اب کسی کے قابو میں نہیں آ
رہی ہے۔ دوسرے مریم کے پاس میرے اور سیکنے کے
علاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔ اس کا باپ بھی تلاش
ہونے کے علاوہ اس سے سخت ناراض ہے۔ برادری اور

سکینہ کی دماغی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہماری زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ آ جائے گا۔

دوسرے روز میں ہسپتال کے وارڈ میں پڑا اپنے ساتھ والے بیڈ کے مریض سے باتیں کر رہا تھا تو اچانک ہمارے وارڈ میں عباس اور ایک محلے دار اندر آئے۔ وہ دونوں روتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میرا دل گھبرانے لگا۔

”اللہ خیر کرے!“

”بھائی جان! کچھ بھی نہیں بچا۔“ عباس نے مجھ سے پٹ کر روتے ہوئے کہا۔

”عباس! کیا ہوا؟“ میں نے بے چین ہو کر کہا۔

”جلدی بولا۔“

”باجی مریم چلی گئی بھائی جان!“ عباس نے روتے ہوئے مجھے کہا۔ ”آج صبح باجی مریم اپنی پہیلی لٹی کے ساتھ سکینہ کو پہاڑی کی جانب سے لے کر پنڈی آنے والی سڑک پر جا رہی تھی کہ اچانک سکینہ نے جنونی حالت میں باجی مریم کو ایک زوردار جھٹکا مارا دیکھتے ہی دیکھتے...“ اس سے آگے عباس سے بولا نہ گیا۔ اس کے الفاظ میرے دل پر کسی بجلی کی مانند گر رہے تھے۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے اس کی کمر پر تھپکی دے کر

اس کو حوصلہ دیا۔ حالانکہ اس وقت میں خود اپنے وجود میں ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

اس نے بتایا کہ باجی نے گرتے گرتے سکینہ کا ہی سہارا لینا چاہا ان کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا اور وہ دونوں کئی فٹ گہری بریلی ڈھلان میں لڑھک گئیں۔ سکینہ تو مر گئی ہے لیکن باجی مریم کو شدید زخمی حالت میں میونسپل ہسپتال راجہ بازار کے ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا ہے۔ وہاں ان کی حالت بہت خراب ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میں دھڑپ مار مار کر رونے لگا۔ میری فلک

اس نے روتے ہوئے مجھے قسم دے کر کہا۔ شبیر! اس رقم میں سے کچھ رقم میرے ابا نے مجھے مرتے ہوئے دی تھی جو کہ انہوں نے میرے جینز کے لئے رکھی ہوئی تھی اور کچھ رقم میں نے محنت مزدوری کر کے جمع کی تھی۔ وہ کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے پیسے نہ لئے۔ وہ روتے ہوئے چلی گئی۔

دوسرے روز مریم میرے پاس آئی اس نے مجھے بتایا کہ روپیوں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں نے اسے صاف صاف بتائیں کہ ہمارے میں بتا دیا تھا کہ وہ روپے لے کر آئی تھی۔

”چھپا ہوا رقم نے اس سے پیسے نہیں پکڑے۔“ مریم نے کہا۔

”تم نے میرے علاج کے لئے روپیہ کہاں سے لیا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے بولا مجھے بتایا۔

”یہ رقم مجھے لٹی نے اپنی شادی کے لئے رکھا ہوا زور و زحمت کر کے دی ہے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”شبیر! امیرا دل نہیں مان رہا تھا کہ میں اس سے یہ رقم لیتی۔ میں نے اس سے یہ رقم ادھار لی ہے۔ یہ اس کا مجھ پر قرضہ ہے۔“

”فکر نہ کرو مریم!“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے زندگی ملی تو میں یہ قرض خود اپنی محنت سے ادا کروں گا۔“ اس دن مریم گئے تک میرے پاس رہی۔ ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔

”ہم نے شادی تو کر لی ہے۔“ میں نے اسے یہ وقت رخصت نہ کرتے کہا۔ ”لیکن ہمیں خوشی کوئی نہیں ملی۔ تم بھی میری وجہ سے مشکلات میں پھنس گئی ہو۔“

”شبیر! تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ مریم نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اللہ سے یہ بھی امید ہے کہ

کے احسانات کا بدلہ اتار سکیں اور اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔

”میں مریم! تم زندہ رہو گی۔“ میں نے ٹپ کر کہا۔

”میں شبیر! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم بقیس کو اپناؤ گے۔“ مریم نے ذوقی آواز میں کہا۔

”مریم! یہ تم مجھے کیسے امتحان میں ڈال رہی ہو؟“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”میرا دل پھٹ جائے گا۔“

”بقیس! میں اپنی محبت امانت تمہارے حوالہ کر کے جا رہی ہو۔“ مریم نے بقیس سے کہا۔ ”میرا مان رکھنا، روز قیامت میں تم سے پوچھوں گی۔“

”مریم! ایسا نہ کہو۔“ بقیس نے روتے ہوئے اسے کہا۔ ”میں سچے دل سے یہی چاہتی تھی کہ تم دونوں بحیثیت میاں بوی اکٹھے رہتے۔“

مریم نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ آنکھیں بقیس سے اور مجھ سے

اجتا کر رہی تھیں۔ مریم مریم کی تھی۔ میری دونوں بیویوں کا جنازہ ایک ہی دن اکٹھا اٹھا۔

اپنی آپ بیتی کے آخر میں شبیر حسن نے روتے ہوئے کہا۔

”رضوان بیٹا! اپناج مریم نے مرتے مرتے میری محبت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی۔ اس نے

میرے سکون اور پاگل سکہ کے علاج کی راہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ بالآخر میں نے نہ چاہتے ہوئے

اس کی خواہش کے مطابق بقیس سے شادی کر لی لیکن بقیس نے بھی بحیثیت بیوی میری بہت خدمت کی۔ وہ

چند سال قبل وفات پا گئی ہے۔ میرے پاس اب ماضی کی دلگراش یادیں اور مریم کی بیساکھیاں موجود ہیں۔

شکاف آواز سن کر پورے ہسپتال کے مریض ڈاکٹر میرے پاس آ گئے۔ ڈاکٹر جس نے میرا آپریشن کرنا تھا

اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ جو رقم میرے پاس تمہارے آپریشن کے لئے موجود ہے وہ تمہاری الحال لے

لو۔ میں بعد میں تمہارا آپریشن کروں گا۔ اتفاق سے میونسپل ہسپتال اس پرائیویٹ ہسپتال سے قریب ہے۔ تم

فوری طور پر وہاں جاؤ۔ میں عباس کے ساتھ ایک تانگے کے ذریعہ جب میونسپل ہسپتال راجہ بازار پہنچا تو وہاں

ایک عیسیٰ وارڈ میں مریم کے کاؤں کے کئی لوگ جن میں ان کے قریبی رشتہ دار، برادری والے زیادہ تھے۔ وہ

شدید زخمی مریم کے گرد حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مظہر تھا کوئی

چھرا تھا جو میرے دل پر اثر رہا تھا۔ ”مریم! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا میں بھی

مروں گا۔ میں نے بذات محبت میں اس کے ہاتھ کو پھرتے ہوئے کہا۔

”شبیر! تمہارا اور میرا ساتھ لگتا ہے، تمہاری تمہارے لیے ہے ساس نیٹے ہوئے کہا۔“ تم نے اور

میں نے اپنی محبت کا وعدہ نبھادیا ہے۔ میرا بچنا ناممکن ہے۔ تم میری چند باتیں فور سے سنو۔ میں رونے لگا تو

وہ بولی۔ ”وقت کم سے شبیر! میری آخری خواہش سمجھ کر میرا فیصلہ مان لینا۔“

پھر اس نے میرا ہاتھ قریب کھڑی بقیس کے ماتحتوں میں دیتے ہوئے کہا۔

”شبیر! اس نے اپنے بُرے ماضی سے توبہ کر لی ہے۔ مجھے یقین لے بتایا تھا کہ اس نے جو رقم مجھے یہ

مہسوت بول کر دی کہ یہ اس کی ہے یہ دراصل بقیس ہی نے مجھے قسم دے کر دی تھی۔“ مریم نے تیز تیز الفاظ میں

میں کہا۔ ”میں تمہیں اب یہ اجازت دیتی ہوں کہ تم بقیس سے شادی کر لینا شاید اس طرح ہم دونوں اس

گھر کا چراغ

ممبر رسیدہ مقتول کی بیوہ جوان اور خوبصورت تھی اور
تھانیدار کا خیال تھا مقتول اسی وجہ سے قتل ہوا ہے۔



سرگودھا

0300-7901921

☆ ممتاز احمد

کرتے تھے۔ یہ پارک تھا نہ کینٹ کی حدود میں آتا تھا۔
کال سننے کے بعد ایس ایچ او نے فوراً اپنی ٹیم ترتیب
دی اور سرکاری گاڑی میں گلشن پارک کی طرف چل
پڑا۔ پچیس منٹ کے بعد وہ گلشن پارک میں تھا۔ ایس
ایچ او نے اس نمبر پر کال ملائی جس نمبر سے اسے فون
کال آئی تھی۔ تیسری ٹھنڈی پر اس شخص نے کال وصول کر
لی اور ایس ایچ او کو بتایا کہ وہ لاش کے قریب موجود

صبح آٹھ بجے کے قریب تھا نہ کینٹ کے ایس ایچ
او کو ایک نامعلوم نمبر سے فون کال موصول
ہوئی۔ کال کرنے والے نے بتایا کہ شہر کے مشہور
ملائے گلشن پارک کے ایک ویران گوشے میں ایک
شخص کی لاش پڑی ہے۔ پلیز آپ وہاں فوراً پہنچیں۔
اس کے بعد کال ڈراپ ہو گئی۔ گلشن پارک شہر کا ایک
بڑا پارک تھا جہاں لوگ صبح صبح چہل قدمی کے لئے آیا

ایلیاس قتل ہو گیا ہے تو وہ ماں بیٹا یہ سن کر رونے لگے۔
فی الحال ان سے سوال جواب نہیں ہو سکتے تھے۔

ایس ایچ او نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے
سے پہلے اس کی جیبوں کی تلاشی کی تھی مگر اسے کچھ نہیں
ملا تھا، سوائے تین ہزار روپے کے۔ ایلیاس کا موبائل
فون گھر میں تھا۔ اس نے اور ایس سے کہا کہ ایلیاس کا
فون اسے دے دیا جائے۔ اور ایس نے اپنے باپ کے
کمرے سے اس کا فون لا کر ایس ایچ او کو دے دیا۔
تھانیدار کا اندازہ تھا کہ قتل کی یہ واردات کسی چور ڈاکو
نے نہیں کی تھی کیونکہ اس کی جیب میں تین ہزار کی رقم
موجود تھی۔ وہ علاقہ بہت پُر امن تھا، وہاں آج تک
کوئی ایسی واردات نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔

پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔ سب سے پہلے
ایلیاس کے ٹیلی فون پر ریسیو کی گئیں اور out-going
کالز کو چیک کیا گیا۔ مگر وہ سب نارمل کالز تھیں اور سب
کے نمبر ایلیاس کے موبائل میں فیڈ تھے۔ پوسٹ مارٹم
رپورٹ کے آنے تک ایس ایچ او نے ایلیاس کے دفتر
جا کر اس کے کونیکٹر سے پوچھ پچھ شروع کی جس کے
مطابق ایلیاس انتہائی شریف انفس، ایماندار اور دیانت
دار بندہ تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ انسان تھا کبھی کسی کو تنگ
نہیں کیا ہر شخص سے اخلاق سے پیش آیا کبھی کسی سے
فالتو بات نہیں کی۔ وقت کا پابند تھا، اس کے آفیسر اور
دفتر کا دیگر عملہ اس سے بہت خوش تھا اور اس کی عزت
کرتا تھا۔ کبھی کسی سے جھگڑا یا لڑائی نہیں کی، وہ اپنے
کام سے کام رکھتا تھا۔ ایلیاس کے دفتر والوں نے جب
ایلیاس کے قتل کی خبر سنی تو سب مغوم اور غمگین ہو گئے۔
ایس ایچ او کو مایوسی ہوئی۔ اُس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے
اس کے دفتر کا کوئی بندہ اُس کے قتل میں ملوث ہے مگر
یہاں تو سب اُس کی خوبیوں کے گن گارے تھے۔

دن کے بارہ بجے ایلیاس کی لاش پوسٹ مارٹم ہو

ہے۔ اس نے ایس ایچ او کو لاش کی لوکیشن سمجھائی۔
اگلے پانچ منٹ میں پولیس لاش کے پاس پہنچ گئی۔

مرنے والے شخص کی عمر لگ بھگ پچاس پچیس
برس تھی۔ اسے ٹون مارکر ہلاک کیا گیا تھا، اس کی لاش
نروٹ کے بل پڑی تھی۔ ایس ایچ او نے کال کرنے
والے شخص سے سوال جواب شروع کر دیے۔ کال
کرنے والے کا نام جاوید تھا اور پارک کے قریب ہی
اس کی رہائش تھی۔ جاوید نے بتایا کہ وہ ہر روز صبح
سیر کرنے پارک میں آتا ہے۔ آج وہ کافی دیر سے
پارک میں آیا تھا۔ دیر سے آنے کی وجہ اس نے یہ بتائی
تھی صبح اس کے بیٹے کی پیر ہون ملک سے کال آ گئی
تھی جس کی وجہ سے وہ آج دیر سے پارک آیا۔ جب
اس نے پارک کا دوسرا کچر لگایا تو اچانک اس کی نظر
لاش پر پڑی جسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا اور فوراً پولیس کو کال
کر دی۔

پارک میں پولیس کو دیکھ کر لوگ آنے لگے اور
ایک جھوم اٹھا ہو گیا۔ اب لاش کی شناخت کا مسئلہ
پیش تھا۔ جھوم میں سے ایک شخص نے بتایا کہ وہ
مرنے والے کو جانتا ہے۔ اس کا نام ایلیاس ہے اور وہ
- فاری ملازم ہے۔ انسپکٹر نے لاش شناخت کرنے
سے اس کا ایڈریس پوچھا تو اس نے بتایا کہ
مرنے والا اس کا محلے دار ہے اور وہ قریبی ایک بہتی
جمال ٹاؤن میں رہتا ہے۔ انسپکٹر نے سب سے پہلے
ایس ایچ او کو کال کی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے
سول ہسپتال بھیج دیا پھر ایس ایچ او اس شخص کو ساتھ
لے کر مرنے والے کے گھر پہنچ گیا۔ مرنے والے کے
لوہقین میں صرف دو افراد تھے۔ ایک اس کی بیوہ شہلا
بیگم اور دوسرا اس کا بیٹا اور ایس تھا۔ شہلا ایک اڑتیس
سال کی جوان اور خوبصورت عورت تھی، اور ایس کی عمر
تیس سال تھی۔ جب ایس ایچ او نے انہیں بتایا کہ

جانے والے لوگوں میں بھی کوئی مشکوک شخص نظر نہ آیا۔
الیاس کے قتل کی ایف آئی آر تھانہ میں درج ہو چکی تھی
اور اس پر تفتیش بھی کرنی تھی مگر ابھی تک پولیس
اندھیرے میں تھی۔ الیاس کے قتل کا کوئی بھی سراغ
نہیں ملا تھا۔ ایک انسان کا قتل ہوا تھا اور انسان بھی
بہت اچھا تھا۔

ایک خیال ایس ایچ او کے ذہن میں آیا اور وہ یہ
کہ مقتول کی بیوہ شہلا بیگم ایک جوان اور خوبصورت
عورت تھی جبکہ الیاس ایک عمر رسیدہ شخص تھا، ہو سکتا ہے
دونوں کے درمیان ان بن ہو اور شہلا بیگم کے کسی کے
ساتھ مراسم ہوں اور ہو سکتا ہے کہ شہلا بیگم کے کہنے پر
اُس مرد نے الیاس کو قتل کر دیا ہو۔ اسی خیال کے تحت
ایس ایچ او نے شہلا بیگم سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اگلے
دن رات کے نو بجے وہ الیاس کے گھر میں تھا۔ اس نے
شہلا بیگم سے پوچھا۔ اس کی شادی کن حالات میں
ہوئی تھی۔ مطلب لومیرج تھی یا ریش؟ شہلا نے بتایا۔
ان کی شادی ریش تھی۔ شہلا کے ماں باپ بہت غریب
تھے اور وہ سات بہن بھائی تھے۔ ان کے ماں باپ
اولاد کی جلدی شادی کرنے کے حق میں تھے۔ وجہ یہ تھی
کہ وہ جد از جد بچوں کی شادیوں کا فریضہ ادا کرنا
چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ شہلا کے چار بہن بھائیوں
کی شادی ہو چکی تھی۔ اب شہلا کا نمبر تھا۔ شہلا کے والد
کے کسی جاننے والے کے توسط سے الیاس کا رشتہ آبا تو
اُس وقت شہلا کی عمر صرف سترہ سال تھی جبکہ الیاس کی
عمر چونتیس سال تھی اور وہ ایک سرکاری محکمے میں جونیئر
کلرک تھا۔ الیاس ایک شریف انسان تھا جن صاحب
کے توسط سے رشتہ آبا تھا انہوں نے الیاس کی پوری
ذمہ داری لی تھی اور گارنٹی دی تھی تو اللہ کا نام لے کر
چٹ مٹکی پٹ بیاہ کے مطابق شہلا اور الیاس کی شادی
کر دی گئی۔

ایک شبت مغرب کی گئی کہ بعد سپرد خاک کر دیا
یہ۔

پچھلے سال مارچ پر پورے کے مطابق مقتول کو رپوانور
کی چار گولیاں لگی تھیں اور اُس کا قتل صبح سات اور
ساتھ سے سات بجے نے درمیان ہوا تھا۔ چار گولیاں
چلی تھیں تو کسی نے گولی چلنے کی آواز بھی یقیناً سنی ہو
گی۔ ایک بار پھر ایس ایچ او کا رخ گلشن پارک کی
طرف ہوا اس نے ارد گرد شاہ پس اور رہنے والوں سے
پوچھ پچھ کی مگر سب نے یہی بتایا کہ کسی نے بھی گولیاں
چلنے کی آواز نہیں سنی۔ لاش کے قریب چلی ہوئی گولیوں
سے خول پڑے تھے جسے نیپارٹری شٹ کے لئے بھجوا دیا
گیا تھا۔ انسپکٹر کا خیال تھا کہ مقتول کو سائیکلنر لگے
رہا، پورے گولیاں ماری گئی ہیں۔

گلے دن ایس ایچ او مقتول کے گھر گیا اور اس
کی بیوہ شہلا اور بیٹے اور بیس سے ملا۔ ان سے جو سوال
و جواب ہوئے اس کے مطابق مقتول پانچ وقت کا
نمازی پرہیزگار انسان تھا۔ وہ روزانہ صبح کی سیر کرنے
پارس میں سست بیٹے جاتا تھا اور آٹھ بجے اس کی
وہیں ہوتی آ کر وہ نہاتا، سپرے تبدیل کرتا پھر تاشہ کر
کے اپنے آفس روانہ ہو جاتا۔ وہ پورے نو بجے آفس
پہنچ جاتا اور شام ساڑھے پانچ بجے گھر واپس آ جاتا۔
گھر آ کر وہ چائے پیتا اور فی وی پر خبریں سنتا۔ عشاء
کی نماز ادا کرنے کے بعد سو جاتا۔ صبح جلدی اٹھ جاتا
اور فجر کی نماز مسجد میں ادا کرتا۔ الیاس کا کوئی پارادوسٹ
نہیں تھا، وہ سمجھتا انسان تھا۔ جس دن اس کا قتل ہوا اس
روز بھی وہ اپنی روٹین سے مطابق پارک میں سیر کرنے
گیا تھا مگر، اپنی اس کی لاش آئی۔

ایس ایچ او قتل سے متعلق کوئی خاص بات معلوم
نہ ہوئی۔ مقتول کے گھر میں سگواری تھی اور رشتہ دار اور
... کو متعزیت کے لئے آ جا رہے تھے۔ آنے

خیال آ رہا تھا کہ اتنے اچھے انسان کا قتل کیوں ہوا۔ ہر بندہ الیاس کی تعریف کرتا تھا اور اُسے اچھے لفظوں سے یاد کرتا تھا مگر کوئی تو دشمن تھا اس کا جس نے اُس کا قتل کیا تھا اور وہ دشمن ہی اُسے نہیں مل رہا تھا۔ قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ اندھا قتل تھا۔ ایس ایچ او نے شک آ کر فی الحال اس کیس کو پینڈنگ کر دیا اور دوسرے کیسز میں مصروف ہو گیا۔

شبلا بیگم کی طرف سے اس کے مرحوم شوہر کے آفس میں درخواست موصول ہوئی جس میں گروپ لائف انشورنس، گریجویٹ اور پنشن کی استدعا کی گئی تھی۔ ان دنوں گورنمنٹ نے دوران ڈیوٹی مرنے والے شخص کی انشورنس کی رقم پچیس لاکھ روپے کی تھی۔ اب ظاہر ہے یہ واجبات وصول کرنا شبلا بیگم کا حق تھا۔ ساتھ ہی ادریس کی ملازمت حاصل کرنے کی درخواست بھی محکمہ کو ملی کیونکہ جو ملازم دوران سروس فوت ہو جائے تو فوراً اس کے بیٹے کو مرنے والے کی جگہ ملازمت مل جاتی ہے۔ گوئی ملازمتوں پر پابندی تھی مگر ایسے کیسوں میں پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ محکمے نے ضابطے کی کارروائی کے لئے ادریس کی درخواست رکھ لی۔ فوری طور پر شبلا بیگم کو پچیس لاکھ روپے کی رقم لائف انشورنس کی مد میں ادا کر دی گئی۔ باقی رقم کی ادائیگی کے لئے تھوڑا تاخیر لگنا تھا۔

الیاس کو قتل ہوئے گیارہواں دن تھا مگر ابھی تک قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اس روز ایس ایچ او کے خاص مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے رات کے آٹھ بجے ایس ایچ او سول لباس میں اپنے مہمانوں کو لے کر ہوٹل گیا اور جا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا آنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ایس ایچ او اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر مشغول الیاس کے بیٹے ادریس پر پڑی، وہ اپنے تین

بھائی بہن اچھا شوہر ثابت ہوا کیونکہ وہ ایک کھلم کھلا انسان تھا اور بچپن سے نمازی پر بیہزار تھا۔ الیاس شبلا کا بہت خیال رکھتا تھا گوکہ گھر میں غربت تھی مگر تسکون تھا۔ الیاس نے بھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتے کرتے جو بیہ کمرک سے سپر مینڈنٹ کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ادریس پیدا ہوا۔ اس کے بعد پھر ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ پرنسڈن زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ادریس کو بڑھاپا نکھایا۔ جب ادریس کی تعلیم مکمل ہو گئی تو الیاس اُس کی جاب کا بندوبست اپنے محکمے میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ملازمتوں پر پابندی لگی ہوئی تھی، اس لئے ادریس فارغ تھا۔ ایس ایچ او نے ہاتوں ہاتوں میں شبلا بیگم اور ادریس کے ٹیلی فون نمبرز لے لئے اور نمبرز لینے کی وجہ یہ بتائی کہ اگر اسے کوئی بات پوچھنی ہوئی تو وہ فون کر سکتے ہو چھ لے گا۔

ایس ایچ او واپس تھانے میں آ گیا اور اس نے شبلا بیگم کے ٹیلی فون پر ریسیو کی گئیں اور اُس نمبر سے کی ٹیکس کالز کا ریکارڈ نکالوایا مگر ریکارڈ کے مطابق وہ کالز شبلا کے بہن، بھائیوں، ماں باپ اور الیاس کی تھیں۔ ان میں کوئی بھی کال کسی غیر مرد یا لڑکے کی نہیں تھی۔ ایس ایچ او نوٹاؤسی ہوئی اور اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اب اس نے ادریس کی کالز چیک کیں تو ان میں سے ایک نمبر ملائیس پر روزانہ ادریس دو گھنٹے بات کرتا تھا۔ ایس ایچ او نے ادریس سے اس نمبر کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی منگیترا کا نمبر ہے جس پر وہ روزانہ اس سے ٹیکس کالز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور نمبر نہ ملا۔ ایس ایچ او نے اپنے طور پر اور اپنے محضروں کے ذریعے بہت سارے لوگوں سے پوچھ چکھی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ بہت مایوس تھا اسے رہ رہ کر

تخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں

مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

ولیم پیٹل

شربت

تخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارض مثلاً
دامی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ
آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت
معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا
ہونے والے امراض کے لئے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوائی فروش سے طلب فرمائیں

پاسرا عوان (ایڈوینٹ)

انچارج ایگل سیشن

ممتاز دوا خانہ - میانوالی

0311-7359072

فون 0334-6447660

پاؤں کے ہموار کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ خلاف
معمولی اور میں بہت چمک رہا تھا اور خوشی نے موڈ میں
نہیں اچھوٹا کو ایک جھکا لگا، وہ سوچ میں پڑ گیا کہ
ہند روز پہلے اس کے باپ کا قتل ہوا ہے اور یہ اپنے
دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں خوش گپیوں میں مصروف
تھے۔ اسے تو اپنے باپ کے مرنے کا کوئی غم ہی نہیں
تھا۔ اس کا باپ یہ قتل ہوا اس کی تو لڑائی نکل آئی
تھی۔ اب اس اچھوٹے اور بھڑکی دیر اور میں کو دیکھا رہا۔ اور میں
نے نہیں اچھوٹے کو کو نہیں دیکھا تھا۔ اتنی دیر میں کھانا آ
گیا۔ اب اس اچھوٹے کو اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا
اور ہوٹل سے اٹھ آیا۔ اب اب اس اچھوٹے کو کو اور میں مشکوک
گئے لگا۔ اس سے پوچھ کچھ اب بہت ضروری تھی۔

چنانچہ اگلے دن اس نے اور میں کو کال کر کے
پہلیں ٹھہر گیا۔ جب اور میں کھانے میں آیا تو اب اس
مچا نوٹے اس کا حال احوال پوچھا اور دوسرے دھڑکی
میں اس نے لگا۔ ہاتھ ہاتھوں میں اس نے اور میں
سے پوچھا کہ وہ کل رات کدھر تھا تو اور میں نے بتایا کہ
وہ گھر میں ہی تھا کیونکہ لوگ اس کے باپ کی تعزیت
کے لئے بھی ٹھہر آ رہے ہیں۔ اب اب اس اچھوٹے کا شک
میں میں بدل گیا کہ اب اس کے قتل میں یقیناً اور میں
ہے۔ یہ یونہی اور میں نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کل
رات گھر میں تھا جبکہ وہ دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں
تھا۔ اور میں نے اب اس اچھوٹے سے پوچھا کہ اسے کھانے
پس بلایا ہے تو اب اس اچھوٹے نے اس کی آنکھوں میں
سکریں ڈال کر اسے بتایا کہ اس کے باپ کا قتل مل
یہ ہے۔ اور میں یہ سن کر ایک دم پریشان ہو گیا۔

میرے باپ کا قتل؟ اس نے
جس کے پاس پہچان پھیرنے ہوئے پوچھا۔

اب اس اچھوٹے نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر اور میں
پس آیا اور چھری کی نوک اور میں کی ٹھوڑی کے نیچے

بچار کے بعد اس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ صبح سب سے پہلے گشتن پارک میں جاتا تھا تو وہیں پر اس کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک پستول لیا اور اس کے آگے سائیکس چڑھا لیا۔ جیسے ہی اس کا باپ سیر کرنے گشتن پارک گیا اور یس بھی پانچ منٹ کے بعد گھر سے نکلا اور پارک پہنچ گیا۔ اس نے جب باپ کو ایک ویران گوشے میں دیکھا تو اس پر چار گولیاں چلا دیں۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور یس چپکے سے پارک سے نکلا اور گھر آ گیا۔ اسے پارک میں آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ مزید یہ پستول پر سائیکس لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کسی نے گولی چلنے کی آواز نہ سنی تھی۔ تھانیدار نے اور یس پر اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ بنایا اور اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

ادھر الیاس کی بیوہ شہلا بیگم سارا دن گھر میں اسی ہوتی تھی۔ اس نے فیس بک پر ایک پیج سالہ نو جوان سے دوستی کا تھڑکھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ان بائیس بیس بائیس کرتی تھی اور ویڈیو کال پر دونوں باتیں کرتے تھے۔ وہ الیاس سے بہت ٹھک تھی، وہ چاہتی تھی اسے الیاس سے چھکارا مل جائے۔ جب اس نے الیاس کے قتل کی خبر سنی تو اندر سے وہ بہت خوش ہوئی۔

اب اس نے اپنی مدت گزار کر اپنے جوان دوست سے شادی کر لی تھی۔ اسی اثنا میں اس کی گریجوایشن کی رقم اور فیشن کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی تھی۔ انشورنس کی رقم تو پہلے ہی اسے مل چکی تھی، اب اس کے پاس پچاس لاکھ روپے تھے۔ بیٹا اپنے باپ کے قتل کی سزا بھگتے جیل چلا گیا تھا۔ اب وہ آزاد تھی، اس کے ہاتھ کی ساری رکاوٹیں ختم ہو چکی تھیں۔

شہلا بیگم نے فوراً اپنے دوست کو یہ خوشخبری سنائی۔ اس لڑکے کا نام عاطف تھا، اس نے بی اے کیا

تھا اور پڑھتا رہتا ہے۔ الیاس کا قاتل میرے سامنے ہے۔ یہ سن کر اور یس کے سینے پھوٹ گئے۔

”بھلا میں اپنے باپ کو یوں قتل کرتا؟“ اس نے بھٹکتے ہوئے کہا۔

”قاتل کی وجہ بھی تم بتاؤ گے۔ ایسی ایچ او نے اس نے سر پرچہ سے چکر اور یس کو کرسی سے اٹھایا اور ساتھ ہی حوالدار کو آواز دی تو اس نے ہی لمحے حوالدار اس سے خبر لے لی تھی۔ ایسی ایچ او نے حوالدار سے کہا۔

”فر ڈرائنگ روم کی سیر تو کروا کے لاؤ۔ اس کی یہ دو شہادت خراب ہوئی ہے۔ اس کو پچھ یا نہیں آ رہا۔“

حوالدار اور یس کو لے کر فر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اور یس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور تھوڑے سے

تشنہ دے کے بعد اس نے اعتراف کر لیا۔ اس نے قتل کر دیا کہ اس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔ قتل کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی مگر

اسے نہیں جاب نہیں مل رہی تھی وہ یہ بھی کہ بی بی سہیلہ بیوہ شہلا بیگم سے پابندی لگاتی ہوئی تھی۔ اسے

اور اس کی منگیتر کو شادی کی بہت جلدی تھی مگر دونوں گھٹنوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ جیسے ہی اور یس کو نہیں ملازمت ملے گی تو ان کی شادی ہوگی۔ یہ سنی اور یس

اپنے بی بی مرضی سے شادی تھی، وہ اپنی منگیتر کو پسند کرتا تھا اور وہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔

الیاس نے یہ سنا کہ اس نے قتل کیا تھا مگر دوران ملازمت کو ملازم فوت ہو جائے تو اس کی جگہ اس

نے پیسے کو فراہم ملازمت مل جاتی ہے۔ ایک دن اس سے فائن میں یہ شیطانی خیال آیا کہ کیوں نا وہ اپنے

باپ کو مار دے۔ اس طرح انشورنس کی رقم بھی مل جائے گی۔ وہ سب کی مال کی فائن بھی شروع ہو جائے

گی اور اسے فوراً باب بھی مل جائے گی۔ آخر کافی سوچ

تک وہ مکان بھی لے لے گا اور اپنی جمع کی ہوئی تنخواہ سے وہ شہلا بیگم کے لئے زیور بنوائے گا۔ گھر کا سامان خریدے گا اور اس کے لئے ڈھیر سارے کپڑے بنوائے گا۔ اس کی باتوں میں آ کر پچاس لاکھ روپے کا چیک شہلا نے عاطف کو دے دیا۔ اگلے دن عاطف نے وہ چیک کیش کروایا۔ اپنی فیس بک آئی ڈی بند کر دی اور موبائل فون سم بھی بند کر دینی۔

شہلا بیگم اپنے خاوند اور بیٹے کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتی تھی۔ ایک جوان لڑکے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کے سہانے سنے سجائے وہ روزانہ عاطف کی کال کا انتظار کرتی مگر نہ تو وہ فیس بک پر آن لائن ہو رہا تھا اور نہ ہی کال کر رہا تھا۔ شہلا بیگم روزانہ اس کو کال کرتی مگر اس کا نمبر بند ملتا۔ اب وہ پریشان رہنے لگی اور ایک دن وہ عاطف کی رہائش پر گئی تو وہاں سے اسے پتہ چلا کہ وہ تو ایک ہفتہ پہلے یہ مکان چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے۔ عاطف نے اپنی فیس بک آئی ڈی بھی بند کر دی تھی۔ شہلا بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عاطف نے اس کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کا خاوند قتل ہو گیا، بیٹا باپ کو قتل کرنے کے جرم میں لمبی قید کاٹنے جل چلا گیا اور پچاس لاکھ روپے کی رقم اس کا فیس بک فرینڈ لے کر رو چکر ہو گیا۔ وہ اب بہت روتی اور پچھتاتی ہے کہ یہ کیا کر دیا اس نے۔ وہ اپنے بھائی کے گھر میں رہتی ہے۔ سارا دن گھر کے کام کرتی ہے اور شہر کی پنشن بھی بھائی کے گھر خرچ کرتی ہے۔ وہ اپنے بھائی اور بھائی کی نوکرائی بنی ہوئی ہے۔ یہ ہے ناشکرے لوگوں کی داستان جو ٹھنڈے وودھ کو پھونکیں مارتے ہیں۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔



ہوا تھا مگر کوئی ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ وہ سارا دن فارغ رہتا اور ہاتھ میں موبائل پکڑے فیس بک پر مختلف دوستوں سے گپ شپ کرتا رہتا۔ عاطف کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتا تھا اس کی کوشش تھی کہ اسے کہیں سے موٹی رقم مل جائے، جس سے وہ کوئی کاروبار کر لے۔ جب شہلا بیگم نے اسے بتایا کہ اس کے پاس پچاس لاکھ روپے ہیں تو یہ سن کر عاطف کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اب وہ دن رات شہلا بیگم پر اپنا پیار بھروسہ کرنے لگا اس کے حسن کی تعریف کرتا اور کہتا شہلا تم تو ایک بہت خوبصورت لڑکی ہو کہیں سے بھی شادی شدہ نہیں لگتی۔ یہ سب سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور ہواؤں میں اُڑتی۔

ایک روز عاطف نے بڑے پیار سے شہلا سے کہا۔ شہلا جان ایسا ہے ایک بہت اچھا مکان فروخت ہونے جا رہا ہے، اس کے مالک کو فوراً بیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ کم قیمت پر مل رہا ہے۔ مکان بالکل نیا بنا ہوا ہے اور پانچ مرلے کا ہے۔ اگر تم کہو تو اس کے مالک سے بات کروں؟ اور ہاں یہ مکان میں نے تمہارے نام لکھواتا ہے۔

اگر اچھا مکان ہے تو بات کر لو۔ شہلا نے کہا۔ عاطف نے کہا۔ ٹھیک ہے میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں اور کل تمہیں بتاؤں گا۔

اگلے دن عاطف نے شہلا کو کال کی اور بتایا کہ اڑتالیس لاکھ روپے میں وہ مکان دے رہا ہے۔ اگر تم کہو تو خرید لوں؟ شہلا نے کہا۔

عاطف نے شہلا کو بتایا ہوا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں بہت اچھی جاب کرتا ہے۔ اس کی ساتھ ہزار روپے تنخواہ ہے۔ شہلا عاطف کے جھانسنے میں آ گئی۔ عاطف نے کہا۔ اس کی عدت پوری ہونے میں ابھی پورا ایک مہینہ رہتا ہے۔ تو مہینہ پورا ہونے

مجاہد اور قانون

گہری چال

ایک حربی زمیندار کا قصہ اس ناپس منظر کو
بے دخل کرنے کے لئے ایک شاطرانہ چال چلی تھی۔

(تخلیل دار علی شری)

☆ چوہدری نذیر احمد

ہیں۔ اسی پس منظر میں ایک واقعہ کلاسیکل چال بازی اور
تفصیل اہل قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش خدمت
ہے۔

مختصر بات یوں ہے کہ میں پاک و ہند کے ایک
سرحدی ضلع کی میڈیکل کوارٹر تحصیل میں بحیثیت تحصیلدار
تبعیات تھا۔ دفتری اوقات کار میں ایک شخص نے
درخواست پیش کی جس میں تحریر تھا کہ درخواست گزار
(دفتری و سرکاری زبان میں ”مسائل“) نے بطور مزوریہ
یعنی کاٹھکار ایک کھیت میں موٹی (چالدار) کی فصل بولی
تھی۔ مالک زمین متولی اور بااثر ہے، کہتا ہے کہ موٹی
اس نے (یعنی مالک نے خود) بولی تھی۔ نیز فصل کا سب
نام صورت میں درخواست گزار کہتے ہیں کہ زمیندار نے
لئے۔

اصلیت معلوم کرنے کے لئے ملاحق موٹی صاحب
تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے پروگرام اور کو مد نظر رکھتے
ہوئے درخواست گزار کو کہا کہ ٹھیک دو دن بعد میں موٹی
پر جاؤں گا۔ وہ موقع پر موجود رہے۔ بلواری حلقہ کا نام
پابند کر دیا گیا کہ وہ موقع دیکار حاضر رہے اور مختصر مالک
زمین موٹی اطلاع پائی کہ وہ۔

میں سترہ دن موقع پر پہنچا۔ درخواست گزار
مالک زمین، چوہدری و نمبردار دیر کے علاوہ ہندو

ہمارے ہاں فوجداری اور دیوانی عدالتوں میں جج اور
صرف جج بولنے کے لئے تواریں سے حلف
نیں اچھی روایات اور جس ضابطہ کار ہے لیکن کسی قسم
نظمی ہے کہ اکثر گورنمنٹ ذاتی مفاد یا شخصیت و شاندار
رقعت یا رقابت اور گروہی تعلقات یا تعصب کی بنیاد پر
بڑے چڑھ کر جھگڑا اور خلاف حقائق و اسی دینے میں ذرا
بھرتی ہوئے، چال یا سخت قسمیں نہیں کرتے بلکہ کمر
حاصل سے باہر نکل کر اپنی دروغ گوئی کا تذکرہ فخریہ اور
ذاتی انداز میں کرتے ہیں۔

ب تو جھگڑا کو ہی باقاعدہ پیشہ بن چکا ہے۔ ایسے
پیشہ وارانہ محفل معاہدے پہل جاتے ہیں جو قتل اور
وہ سب سلیقہ مقدمہ مات میں لگتی گواہی دے کر محض
محاکمات ہیں اور مجرم و بری کر دیتے ہیں۔

کم و بیش ہر شعبہ زندگی میں اختلافی حلقے ایسے
واقعہ و مزہ و اعتماد ہیں۔ وہ آتش آتش سرکار
پر ہیرت و استغاب اور مسرت و پاس کے چند رنگی الفاظ
میں اس کی بھڑاس ہاؤز یا زیراب لگ کر اپنی اپنی راہ
پہننے میں اور پھر آہستہ آہستہ لوگ اللہ تعالیٰ و رسول اکرم
سے اللہ سے اللہ و قرآن کریم کی قسمیں پاست ماست پر
ہا ہوا لکھاتے ہیں ورامی لغو قسموں کے خلاف اور سماجی
مصلحت اور احساس زیبائے مانتے ہیں۔

اہمیت کا کام انہیں علم ہے اور وہ صرف سچ بات پر قسم کھانے کو آمادہ ہیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ جب ایک فریق قرآن پاک پر قسم کھائے یا کھانے کو تیار ہو تو دوسرا فریق خواہ فی الحقیقت سچا حق کیوں نہ ہو اپنے مختلف با حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال یکسر مختلف تھی۔ صرف قسم کی بناء پر سچ یا جھوٹ کا فیصلہ مشکل تھا۔ حاضرین متذہب تھے اور زور لب کلمہ بھروسہ کرتے تھے لیکن لب کشائی سے سریزاں تھے۔ حقیقت کی جستجو میں نمبردار سے وصولی مانہ وغیرہ کی باتیں کرتے ہوئے میں اُسے جمعے سے ذرا دور لے گیا۔ نمبردار عمر رسیدہ تھا۔ اُسے سمجھا کہ وہ ذاتی اور خاندانی مصلحتوں کو مارے طاق رکھ کر سچی بات بتائے۔ کذب بیانی سے اپنی عاقبت خراب نہ کرے۔

اُس نے کہا کہ موغی کی لاب لگانے کی سبک دلوں فریق ... مزارع اور مالک ... سچے ہیں۔

اس بیان کا انکشاف سے خیرانی اور بڑھ چکی کہ اس ایسا ہی طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ نمبردار کو بتایا کہ اس بیان میں لفظ ”حد تک“ معنی خیر ہے اور حقیقت حال اس کے پیچھے ضرور پوشیدہ ہے۔ نمبردار نے کہا کہ اگر اُسے وہیں پردہ رکھا جائے تو وہ چال بازی سے پردہ اٹھ دے گا۔ یقین دہانی پر نمبردار نے بتایا کہ کھیت کی تیاری، آبیاری اور قلعہ رانی مزارع نے کی تھی اور اپنے ہال چبوس کی مدد سے لاب موغی واقعی اس نے لگائی تھی۔ یہ کام ختم ہونے تک شام ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ چنانچہ شام کے اندھیرے میں مزارع اپنے بیل اور بالی بچوں سمیت آبادی دیہہ میں اپنے بھتیجیوں کے مکان میں چلا گیا۔ اتفاق سے وہ چاند رات تھی۔ تھوڑی دیر بعد چاند نکل آیا۔ مالک زمین کے کارندے ٹریکٹر پر تری لاب لاد کر کھیت کر رہے تھے۔ اگلے روز صبح کی پہلی دھند اور ٹریکٹروں

انڈوں پر دوس کے کاشتکار ان بھی موجود تھے۔ یہ لوگ مالک زمین سے احاطہ بیوب ویل میں جمع تھے۔ بیوب ویل نیو نیو لیب ہوا تھا اور تیار سب کھیت بیوب ویل کے تین سات تھے۔ درخواست گزار سے پوچھا کہ وہ اپنی شہیت سے ہمارے میں کیا کھانا چاہتا ہے اور کیا شہوت یا اہمیت ڈالنے کے لئے؟

اُس نے کہا کہ موغی والے کھیت کو وہ بطور مزارع دے دیں چار سال سے کاشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ فصل سے پیداوار کا مقررہ حصہ انہی وہ مالک زمین کو باقاعدگی سے دیتا ہے۔ اب بیوب ویل گلنے کی وجہ سے مالک سے جبراً بھل کرنا چاہتا ہے۔ بہر کیف فصل موغی کے لئے کھیت کی تیاری اور آبیاری اُس نے کی تھی۔ موغی کی اب (بڑی) اُس نے اپنے ہال چبوس کی مدد سے لگائی تھی۔ وہ غریب آدمی ہے، بیٹین سے نہیں کہہ سکتا کہ حاضرین میں سے کوئی مالک زمین کی موہوڑی میں اس کے حق میں گواہی دے گا بھی یا نہیں۔ ذاتی طور پر وہ اپنی جیبی میں قرآن کریم پر قسم کھانے کو تیار ہے۔ اُس کے سب سے سادگی اور سچائی کی مختلف نمائندگی تھی۔ مالک زمین سے پوچھا کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کھانا چاہتا ہے۔ اُس نے قدر سے تکیف میں کہا کہ وہ اب کھیت کا مالک ہے اور موغی کی لاب اُس نے خود لگائی تھی۔ نیز وہ بھی اس بات کے لئے قرآن کریم پر قسم کھانے کو تیار ہے۔

فریقین کی ایک ہی صفائی بات پر قسم کھانے پر آمادگی صرف ایران کی ہی تھی بلکہ عجیب و غریب حصہ تھا۔ ہوں گمان ہوتا تھا کہ یہ لوگ قرآن کریم کے تقدس سے قطعی ناہد ہیں اور ان کے نزدیک قسم کھانا داناں روٹی کھانے سے متواضع ہے۔ ان کے یوٹھیا کیا وہ ”قسم یا حصہ“ کے تقدس اور مضمرات سے آگاہ یا نکلے؟ یہ سب سب کے سب براہی سے لیتے قسم کھانے سے متواضع ہے۔ اُس نے کہا کہ قسم

مونجی کے لئے کھیت کی تیاری، آبیاری اور قنبہ رانی کا دعویٰ نہیں کیا۔ پوچھا۔ کیا وہ اس بارے میں قرآن کریم پر قسم کھانے کو تیار ہے کہ کھیت کی تیاری و آبیاری وغیرہ بھی اُس نے خود کی تھی اور مزارعے نے کسی مرحلہ پر بھی ادب نہیں لگائی تھی؟

اس سوال پر مالک زمین کا مطمئن اوراق جاتا رہا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ ڈانواں ڈول نظر آنے لگا اور اسے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مزید استفسار پر اُس نے نفی میں صرف سر کو جنبش دی اور بے بسی اور بے چارگی کا بت بنا کھڑا رہا۔ مزارعے کی شکایت مبنی بر حقیقت تسلیم کر لی گئی اور میں نے فیصلہ اس کے حق میں دیا۔ حاضرین جو لب کشائی سے گریزاں تھے، برلا کہہ اٹھے کہ فیصلہ بالکل حق تھا ہے۔

معاشرتی سطح پر ہر شعبہ زندگی میں ریا کاری، ہیرا پھیری اور دروغ گوئی کے واقعات روزمرہ کا معمول ہیں۔ ان معمولات کو کسی سرکاری حکم نامہ یا عدالتی ڈگری سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سچی گواہی اور انصاف کے اسلامی احکامات میں سخت تاکید ہیں ہر فیصلہ موثر اور معتبر شہادت پر مبنی ہوتا ہے اور ہر کیس میں سچی گواہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے سب سے نہیں ہوتے۔ اگر ضابطہ قانون میں ایک شق ایذا کر دی جائے کہ عدالت جن گواہان کے بارے میں مطمئن ہو جائے کہ ان کی گواہی صداقت پر مبنی نہیں ہے فیصلے میں اُن کی نشاندہی کی جاوے اور انہیں آئندہ کسی فورم یا عدالت میں شہادت دینے کا نا اہل قرار دیا جائے ایسے گواہان کی سرکاری طور پر قہقہہ، تحصیل اور ضلع کی سطح پر تشہیر کی جائے۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی جھوٹی شہادت دینے سے گریز کریں گے اور یوں جھوٹی گواہی کا رجحان ختم ہو جائے گا۔ عدالتوں میں مقدمات کا بوجھ بھی بتدریج کم سے کم تر ہوتا جائے گا۔



سے انہوں نے ایک بڑا سا جھاڑو بنا کر ٹریکٹر کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ ٹریکٹر چلا دیا گیا۔ تازہ تازہ لگائی ہوئی لاپ جھاڑو سے اکھڑتی گئی اور اس میں الجھ کر اکٹھی ہوئی گئی۔ بچی کچھی لاپ کارندوں نے جن جن کر اکٹھی کر لی اور کھیت کے کنارے ڈھیر لگا دیا۔ مزارع والی لاپ کی جگہ سالم کھیت میں نئی لاپ لگا دی گئی۔ واپسی پر کھیت کنارے لاپ کا ڈھیر ٹریکٹر میں رکھا اور دور لے جا کر ضائع کر دیا۔

لاپ لگانے کی حد تک دونوں سچے تھے۔ پھر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے جھے میں جا بیٹھے۔

فریقین سے پوچھ گچھ کے دوران میں نے مزارع سے پوچھا کہ اُس نے لاپ کب لگائی تھی؟ اُس نے دیہی مہینے کے حساب سے تاریخ اور صبح سے شام تک کا وقت بتایا جو اس کے پہلے بیان اور نمبردار کی اطلاع سے ٹھیک ٹھاک مطابقت رکھتے تھے۔

مالک زمین سے بھی پوچھا۔ اُس نے کہا وہ ان وقت اُسے یاد نہیں۔ لاپ اس کے کارندوں نے لگائی تھی۔ وہ اس بات پر مصر رہا کہ مونجی کی کاشت اس کی ”خود کاشت“ کے زمرے میں آتی ہے۔

بہر کیف مالک زمین کو مخاطب کر کے میں نے واضح الفاظ میں کہا کہ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوب ویل اور ٹریکٹر اس کے اپنے ہیں اس لئے مشینی کاشت کی سہولت ہوتے ہوئے یوب ویل کے عین سامنے والے کھیت سے مزارع کا حصہ بٹائی لینا اُسے گوارا نہیں۔ قانونی طریقے سے مزارعے کی بے دخلی سہل نہیں۔ مزارعے کی براہ راست بے دخلی کے لئے اُس نے شاطرانہ چال چلی اور پہلی لاپ کو تلف کر کے نئی لاپ لگا دی۔ اس چال کی آڑ میں وہ قسم کے ذریعے اپنی مہینہ سچائی ثابت کرتا ہے۔ نیز اُس نے صرف لاپ لگانے کے بارے میں قسم کھانے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے اور